بنکاک کی اس لڑکی کی رُوداد جو کیچڑ کا کنول تھی

کربِ آشنائی
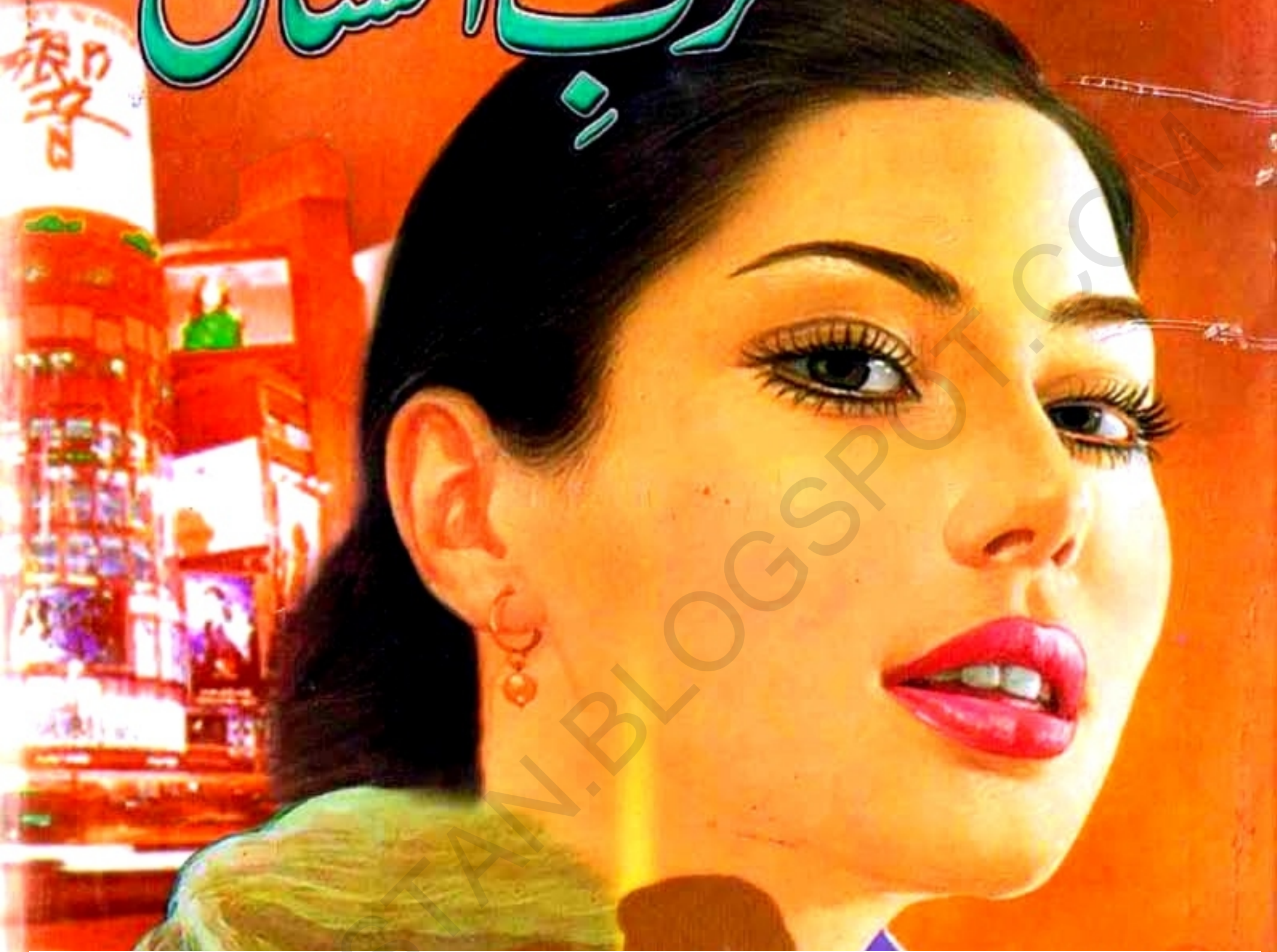
محبت آشنا گداز دلوں کی حوصلہ اور امنگ
دینے والی طویل داستانِ محبت

طاہر جاوید مغل

اشاعت :۔
مکتبہ القریش © سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور ۲۔ فون: 7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

باہتمام...... محمد علی قریشی

بار اول ـــــــ 2004ء
مطبع ـــــــ نیر اسد پریس
سرورق ـــــــ ذاکر
کمپوزنگ ـــــــ وسیم احمد قریشی
قیمت ـــــــ -/200 روپے

انتساب

"داناؤں کا یہ قول اکثر سنا تھا کہ قدرت انسان کو مکمل پیدا کرتی ہے۔ ہر انسان کو برابر صلاحیتوں سے نواز کر اس "کارزار حیات" میں بھیجا جاتا ہے۔ اس قول پر یقین تو تھا لیکن پختہ یقین اس وقت آیا جب "زاہرہ سعید" کو دیکھا۔ قدرت نے اسے آنکھوں سے محروم کر کے کچھ ایسی صلاحیتوں سے نوازا ہے جو بے مثال ہیں۔ زاہرہ کی "قوتِ تخیل" حیرت انگیز ہے۔ اگر وہ اپنی صلاحیتوں میں سے صرف اسی ایک صلاحیت کا مناسب استعمال کرے تو مستقبل میں یادگار تخلیقی کام کر سکتی ہے۔

میں اپنی یہ کتاب اپنی اسی باہمت بیٹی کے نام کرتا ہوں۔"

پیش لفظ

یہ بنکاک کی لڑکی کی کہانی ہے۔ وہ ہنسی مسکراتی شوخ لڑکی جو گناہ کی زندگی گزارنے کے باوجود شبنم کے قطرے کی طرح صاف و شفاف تھی۔ ایسا کیوں تھا؟ ایسا اس لئے تھا کہ اس کی روح اس کے جسم سے بالکل الگ تھی...... اور اس روح پر کوئی داغ نہیں تھا۔ بنکاک کی اس لڑکی نے جب اپنا پہلا پیار کیا تو اسی طرح کیا جیسے ایک عفت مآب، الہڑ دوشیزہ کرتی ہے۔ ہاں وہ ایک دوشیزہ ہی تو تھی۔

یہ بنکاک کی سون کی کہانی ہے...... اور یہ سون کے بنکاک کی کہانی بھی ہے۔ یہ ہمیں بنکاک کے گلی کوچوں میں لے جاتی ہے اور اس رنگین و سنگین شہر کی پس پردہ جھلکیاں دکھاتی ہے۔

جنوبی ایشیاء کے اکثر ممالک میں جہالت، توہم پرستی اور انانیت کی ''شاندار روایات'' موجود ہیں۔ اور یہ ''روایات'' مختلف معاشروں سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی ہیں۔ تھائی لینڈ اور پاکستان میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، تاہم شعبدہ باز روحانی ٹھیکیداروں کی کارستانیاں دیکھیں تو یہی لگتا ہے کہ دونوں ممالک میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ یہ مذہبی و روحانی ٹھیکیدار معصوم لوگوں کا استحصال کیسے کرتے ہیں یہ جان کر روح لرز اٹھتی ہے۔

سون کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب وہ دل پر یادگار چوٹ کھانے کے بعد ٹوٹی پھوٹی تو ایسے ہی سیاہ کاروں کے ہتھے چڑھ گئی۔ وہ ایک ایسی چار دیواری میں چلی گئی جہاں سے کوئی لوٹتا نہیں۔ اس چار دیواری میں صرف داخلے کا راستہ تھا۔ لیکن جہاں پیار ہوتا ہے وہاں انہونیاں بھی ہوتی ہیں۔ پیار تو نام ہی دیواروں میں در بنانے کا ہے۔ اور ایک ''بنانے والے'' نے سون کی چار دیواری میں بھی در بنایا۔ ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ وہ اسے آہنی دیواروں کے پار سے اڑا لایا۔ مگر جنگ ابھی جاری تھی......

سون کی یہ روداد ذہن میں بہت سے سوال اٹھاتی ہے۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی ہے۔ ''محبت کرنے والوں کو منزل پانے کے لئے ''برف اور آگ'' کے سات سمندروں پر سے کیوں گزرنا پڑتا ہے؟'' میں اس سوال کا جواب سوچتا رہتا ہوں۔ شاید آپ بھی سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔

طاہر جاوید مغل

ایم بی بی ایس کا آخری پیپر دے کر میں امتحانی سینٹر سے باہر نکلا ہی تھا کہ میری گردن پر ایک زور دار جھانپڑ پڑا۔ میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا، عقب میں اکمل کھڑا تھا۔ وہ ایک لنگوٹیے دوست کی ہر تعریف پر پورا اترتا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ سے کتاب چھینی اور اپنی سفید گاڑی کی کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر پھینک دی، پھر اس نے میری جیب سے قلم نکالا اور سڑک پر پٹخ کر توڑ دیا۔ اس کے بعد میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر بولا۔ ''دیکھ مچھر! اگر اب تم نے چوں وچرا کی نا...... تو قسم خدا کی مکا مار کر تیری ناک کی ہڈی نہ توڑ دی تو میرا نام اکمل نہیں۔ بس چپ چاپ میرے ساتھ چل۔''

''کہاں؟''

''عرب ٹریولز! آج ہی بنکاک کے ٹکٹ لیں گے۔ آج ہی کنفرم کرائیں گے، آج ہی ٹریول چیک لیں گے۔ سب کچھ آج ہی ہوگا اور اگر آج نہیں ہوگا تو پھر کبھی نہیں ہوگا۔ میری بات سن رہے ہو نا تم؟'' اس نے آخری الفاظ اس طرح چیخ کر کہے کہ راہ چلتے لوگ ہمیں مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اس کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو وہ بیچ بیچ یہیں سڑک پر مجھ سے کشتی شروع کر دے گا اور ہم تماشا بن جائیں گے۔

میں نے کہا۔ ''شور مت مچاؤ میں بہرہ نہیں ہوں۔ چلو میں تمہارے ساتھ ہی گھر چلتا ہوں۔''

''گھر نہیں چلنا سیدھا ٹریول ایجنسی کے دفتر چلنا ہے۔'' اس نے پھر آنکھیں نکالیں۔

''اوئے کھوتے، پاسپورٹ تو گھر میں پڑا ہے اور پیسے بھی گھر میں ہیں۔''

''تیرا پاسپورٹ میں لے آیا ہوں اور تیری الماری کا تالا توڑ کر پیسے بھی میں نے نکال لیے ہیں۔'' اس نے مجھے پاسپورٹ اور پیسے ایک ساتھ دکھاتے ہوئے کہا۔

''قربان جاؤں تیری پھرتیوں پر۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور اکمل

کے ساتھ چل دیا۔

اکمل کی جھنجلاہٹ اور تیزی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ پچھلے قریباً ڈیڑھ سال سے وہ مسلسل اس تگ و دو میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح ہم پاکستان سے باہر ایک سیاحتی دورہ کر سکیں۔ سوچ بچار کے بعد ہم نے تھائی لینڈ جانے کا پروگرام بنایا لیکن یہ پروگرام بوجوہ التوا کا شکار ہوتا چلا گیا تھا۔ کبھی میری پڑھائی آڑے آتی تھی۔ کبھی والد صاحب کی علالت، کبھی کسی کی شادی وغیرہ...... اتفاق یہ تھا کہ ہر بار یہ پروگرام میری وجہ سے ہی کھٹائی میں پڑتا تھا۔ اکمل ہر بار سر پیٹ کر اور بال نوچ کر رہ جاتا تھا۔ چند دن مجھ سے روٹھا ہوا اور مایوس رہتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد پھر نئے سرے سے پروگرام ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کی ہمت اور مستقل مزاجی کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

آخری بار ہمارا پروگرام کوئی تین مہینے پہلے ملتوی ہوا تھا۔ امتحانات کی تاریخیں اچانک تبدیل ہو گئی تھیں اور میں باندھا ہوا سامان کھول کر پھر سے پڑھائی میں مصروف ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ تو اکمل کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے چیختے ہوئے کہا تھا۔ ”تجھ پر سو بار لعنت ہے مچھر! یار تو کتنا کمینہ ہے۔ اپنی پوری زندگی میں سے صرف پندرہ بیس دن نہیں نکال سکتا میرے لیے۔ صرف دس پندرہ دن۔“

میرا نام شاداب ہے۔ لیکن بچپن میں کچھ اتنا زیادہ ”شاداب“ نہیں تھا۔ لہٰذا میرے لنگوٹیے اکمل نے مجھے مچھر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اب میں چھ فٹ قد کا اچھا خاصا شخص تھا اور کوالیفائیڈ ڈاکٹر بھی ہونے والا تھا۔ لیکن اکمل اب بھی مجھے بڑی روانی سے مچھر کہتا تھا۔ خاص طور سے جب وہ غصے میں ہوتا تھا تو یہ لفظ ضرور اس کی زبان پر آ جاتا تھا۔

امتحانی سینٹر سے اکمل مجھے سیدھا ٹریول ایجنسی لے کر گیا۔ وہاں سے ٹکٹیں اور ٹریول چیک وغیرہ لے کر ہی ہم گھر واپس آئے۔

ٹھیک پانچ روز بعد چھبیس نومبر 93ء بروز جمعہ صبح پانچ بجے ہم دونوں اپنے اپنے گھر سے لاہور ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ بیرون ملک ایک عام سا سیاحتی دورہ تھا۔ اس وقت مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ زندگی کا یہ پہلا غیر ملکی دورہ میری زندگی کے لیے کتنا اہم ثابت ہونے والا ہے اور اس کے کتنے دوررس نتائج نکلنے والے ہیں۔ ہم دونوں بڑے تفریحی موڈ میں تھے۔ ائرپورٹ پر ابھی ملگجا اندھیرا تھا۔ قدرے خنک ہوا چل رہی تھی۔ میرے دو تین عزیز مجھے ائرپورٹ چھوڑنے آئے تھے۔ اکمل کے ساتھ بھی دو تین عزیز

تھے۔ ہم نے ائرپورٹ پر ہی ہلکا پھلکا ناشتہ کیا پھر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم تقریباً سات بجے ڈیپارچر لاؤنج کے اندر تھے۔ یہاں ہمیں کسٹم اور امیگریشن وغیرہ کے مراحل سے گزارا گیا۔ چونکہ پہلی بار ملک سے باہر جا رہے تھے اس لیے اعصابی طور پر کچھ ٹینشن بھی تھی۔ امیگریشن آفیسر نے جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا کہ آپ تھائی لینڈ کیوں جا رہے ہیں۔ تو ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا گیا۔ ذہن سے نکل گیا کہ ہم کیوں جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں کہہ دیتا کہ اپنے لنگوٹیے اکمل کے کہنے پر جا رہا ہوں۔ مناسب جواب سوجھ گیا۔ میں نے کہا کہ تفریح کے لیے جا رہے ہیں۔ کچھ کاروباری مواقع دیکھنے کی کوشش بھی کریں گے۔

”کیا کاروبار؟“ آفیسر نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”میں تو ڈاکٹر ہوں لیکن میرا یہ دوست ریڈی میڈ گارمنٹس کا کام کرتا ہے۔“

امیگریشن آفیسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ریڈی میڈ گارمنٹس کی تجارت کے حوالے سے تھائی لینڈ کا نام سرفہرست ہے۔“

ہمارے پاس پاکستانی کرنسی مقررہ حد سے زیادہ تھی۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں اس سلسلے میں باز پرس شروع نہ ہو جائے لیکن خیریت ہی گزری۔ لاؤنج میں بیٹھ کر ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا اس کے بعد ہم پیدل ہی جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔ ان دنوں سیکیورٹی غیر معمولی طور پر سخت تھی گارڈز کی عقابی نگاہیں ہر بندے کا ایکسرے کر رہی تھیں۔ پی آئی اے کے جمبو جیٹ نے 9 بج کر 4 منٹ پر روانگی کے لیے حرکت کی اس وقت بنکاک ٹائم 11 بج کر 5 منٹ تھا۔

میں اور اکمل باتوں میں مصروف تھے اس لیے کھڑکیوں کی طرف دھیان نہیں دیا لیکن رن وے چھوڑنے کے صرف چھ سات منٹ بعد جب میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو منہ کھلا رہ گیا۔ ہمیں اپنے نیچے برف پوش چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ جہاز لمحوں میں ہمیں لاہور کی گنجان آبادی پر سے برف پوش وسعتوں میں لے آیا تھا۔ میں نے اکمل کو یہ منظر دکھایا۔ پہلے تو میری طرح وہ بھی حیران ہوا پھر اس نے حسب عادت ترنگ میں آ کر گنگنانا شروع کر دیا۔ ”یہ وادیاں...... یہ پربتوں کی شاہ زادیاں، پوچھتی ہیں کب بنے گی تو دلہن، میں کہوں جب آئیں گے میرے سجن۔“

میں نے کہا۔ ”یہ گانا تو تھائی لڑکیوں کو گانا چاہیے۔ کیونکہ بیسویں صدی کا عاشق اعظم

ان کی سرزمین پر اترنے والا ہے اور نئے نئے گل کھلانے والا ہے۔"

وہ بولا۔"اگر میں عاشق اعظم ہوں تو تم منافق اعلم ہو۔ بچو جی! دل میں تمہارے بھی وہی کچھ ہے جو میرے دل میں ہو سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تم ماہ جبینوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں آہیں بھرتے ہو۔ میں یہ کام سرعام کرتا ہوں۔ تم خیالوں ہی خیالوں میں ان سے لپٹتے چپکتے ہو میں شائستہ طور سے ان کے روبرو جاتا ہوں اور اظہار محبت کرتا ہوں۔ تم تصور میں ان سے اپنی نارسائی کا انتقام لیتے ہو اور کچا چبا ڈالتے ہو، میں حقیقت میں ان کی محبت اور قربت سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔"

میں نے کہا۔"مشہور مثل ہے کہ چور کو سارے ہی چور نظر آتے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ اکمل جواب میں کچھ کہتا، خوب صورت ائر ہوسٹس خوشبو بکھیرتی ہمارے بالکل پاس سے گزری۔ اکمل کی نگاہوں نے بے اختیار اس کا تعاقب کیا۔ ایسے لمحوں میں ایسی "معصوم بے اختیاری" اس کے چہرے پر دکھائی دیتی تھی کہ میں اندر سے مسکرانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ جیسے کوئی بھیڑ بے اختیار سبز چارے کے پیچھے پیچھے چلنے لگتی ہے، اکمل کی نگاہ بھی غیر ارادی طور پر حسن کا تعاقب کرنے لگتی تھی اور یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی، وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ خوشدلی اور عاشق مزاجی اس کی فطرت ثانیہ تھی۔ اپنی مختصر سی زندگی میں ہی اس نے درجنوں عشق کر لیے تھے اور ہر عشق بڑے خلوص دل سے "آخری" سمجھ کر کیا تھا۔ اس حوالے سے میرے اور اکمل کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم بیس برسوں سے گہرے دوست تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ طبیعت میں اس ایک اختلاف سے قطع نظر ہمارے مزاج میں بے شمار مطابقتیں موجود تھیں۔

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کھانا آ گیا۔ قومی ائرلائن کا کھانا مجموعی طور پر اچھا تھا لیکن ایک دو چیزیں ذرا کم معیاری محسوس ہوئیں۔ کھانا کھاتے ہوئے اکمل نے کہا۔ "میری ایک بات کان کھول کر سن لو۔ پچھلے بیس برس میں وہی کچھ ہوتا رہا ہے جو تم کہتے رہے ہو۔ آئندہ پندرہ دنوں میں وہی کچھ ہوگا جو میں کہوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"کسی وقت آئینے میں شکل دیکھی ہے تم نے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں دیکھی ہوگی۔ تمہیں کتابوں سے فرصت ہی کہاں ہے۔ قسم خدا کی چوسے ہوئے آم جیسا بوتھا ہو گیا ہے تمہارا۔ ڈاکٹر بنتے بنتے مریض بن گئے ہو۔ کسی سے دھواں دھار عشق کر کے مجنوں بنتے تو

بات بھی تھی۔ تم تو کتابیں چاٹ کر مجنوں بنے ہو اور مجنوں سے اگلی منزل، تمہیں پتا ہی ہے کیا ہوتی ہے۔ مرحوم و مغفور ہو جاؤ گے اور تمہاری قبر پر یہ کتبہ لکھا جائے گا، وہ ڈاکٹر جو اپنا پہلا مریض دیکھنے سے پہلے خود اللہ کو پیارا ہو گیا...... بندہ خدا کچھ خوف کرو۔ پڑھائی ہی سب کچھ نہیں ہوتی، زندگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ تمہارے والد محترم "محنت" کے بارے میں ایک شعر کیا کہہ گئے، تمہاری پوری زندگی کو سولی پر لٹکا گئے۔"

"کیا محنت بری چیز ہے؟"

"محنت بری چیز نہیں ہے...... لیکن محبت بھی بری چیز نہیں ہے۔ محنت کرو لیکن ساتھ ساتھ محبت بھی کرو۔ اپنی زندگی سے محبت کرو۔ خدا کی بنائی ہوئی چیزوں سے محبت کرو، اس کے تخلیق کیے ہوئے لوگوں سے محبت کرو۔"

"میرا خیال ہے کہ تمہارے فقرے میں آخری الفاظ سب سے اہم ہیں۔ تم خدا کے بنائے ہوئے لوگوں سے محبت کرنے کو ہی محبت سمجھتے ہو...... اور لوگوں میں سے بھی وہ لوگ جو سولہ سے پچیس سال کے درمیان ہوں اور صنف نازک سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسے لوگ اگر تھوڑے سے آزاد خیال اور خوبصورت بھی ہوں تو خدا کے بندوں سے تمہاری محبت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔"

"میں تمہارے طنز کا جواب جہاز سے اترنے کے بعد دوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"ایسے تو ایسے ہی سہی۔" وہ مسکرایا۔"جہاز سے اتر کر جو پہلی تھائی لڑکی مجھے نظر آئے گی بس دھڑام سے اسی پر عاشق ہو جاؤں گا۔"

"خدا کے لیے!" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔"دیارِ غیر میں کوئی ایسی اوچھی حرکت نہ کرنا کہ عالمی برادری میں ہمارے وقار کو ٹھیس پہنچے۔ ویسے بھی تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پاکستان کے برعکس تھائی لینڈ میں اسٹیل کی ایڑی والی جوتیاں بھی بنتی ہیں۔"

"تم جو مرضی کہہ لو۔ لیکن ہمارے آئندہ پندرہ دن اسی طرح گزریں گے جس طرح میں چاہوں گا۔" اکمل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ تھائی لینڈ کے لوگ آزاد خیالی اور عیش و طرب کے حوالے سے مشہور ہیں وہاں کے ہوٹلوں اور نائٹ کلبز کے بارے میں بھی سن رکھا تھا، لیکن تھائی لینڈ

کی اصل تصویر اس وقت سامنے آئی جب ہم نے خود وہاں قدم رنجہ فرمایا اور یہ تصویر فی الواقعی چونکا دینے والی تھی۔

ہمارے جہاز کا کمپیوٹر بتا رہا تھا کہ ہم آٹھ سو ستاسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے انتیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہمیں ٹوٹل تقریباً سوا تین ہزار کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ ہم دہلی، کانپور، کلکتہ وغیرہ کے اوپر سے پرواز کر چکے تھے اور اب رنگون کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رنگون سے آگے بنکاک تھا۔ ایک جگمگاتا ہوا شعلہ بدن شہر! جس کی پرفسوں راتوں اور پرجوش دنوں کے قصے ہم نے سنے اور پڑھے تھے۔ وہ ایک بہت بڑا سیاحتی مرکز تھا اور اس کی پرکشش رنگینی دنیا کے کونے کونے سے سیاحوں کو وہاں کھینچ لاتی تھی۔

ہم پاکستانی وقت کے مطابق بارہ بج کر چالیس منٹ پر بنکاک پہنچے۔ بنکاک کا فضائی نظارہ خوبصورت تھا غالباً ایک دو دن پہلے وہاں بارش ہوئی تھی۔ شہر کے مضافاتی میدانوں میں پانی نظر آ رہا تھا۔ شہر میں بہت سی نہریں بھی ہیں۔ یہ نہریں فضا سے سفید لکیروں کی طرح نظر آتی ہیں۔ تاہم جوں جوں نیچے آتے جائیں ان کی شکل وشباہت واضح ہوتی جاتی ہے۔ بنکاک میں بلند عمارتیں موجود ہیں لیکن بہت زیادہ بلند نہیں۔ زیادہ تر عمارتیں چار پانچ منزل تک ہیں۔ تھائی لینڈ کا معیاری وقت پاکستانی وقت سے دو گھنٹے اور ایک منٹ آگے ہے۔ یعنی جب ہم ائر پورٹ پر اترے تھائی وقت کے مطابق دو بج کر اکتالیس منٹ ہوئے تھے۔ بنکاک کا ائر پورٹ اپنی وسعت اور ساخت کے لحاظ سے اوسط درجے کا ہے۔ تاہم یہ ایک نہایت اہم فضائی گزرگاہ ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے ہزاروں لوگ روزانہ اس ائر پورٹ پر اترتے ہیں اور یہاں سے پرواز کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ائر پورٹ پر ہر طرف گہما گہمی نظر آئی۔ رنگ برنگ مسافروں کے علاوہ مختلف فضائی کمپنیوں کا چاق و چوبند عملہ گروپوں کی صورت میں آتا جاتا دکھائی دیا۔ ہمارے عین سامنے سے ترکش ائر لائن کی ائر ہوسٹسوں کا ایک خوبصورت جتھا، ہاتھوں میں بیگ تھامے، اپنی اونچی ایڑیوں پر ٹھک ٹھک کرتا گزرا۔ اکمل کے منہ سے بے اختیار سرد آہ نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ وہ ہپناٹزم کے کسی معمول کی طرح منہ اٹھا کر ان پری پیکر حسیناؤں کے پیچھے چل دے گا اور ائر پورٹ کے ممنوعہ علاقے میں داخل ہو کر پکڑا جائے گا۔ بہر حال خیریت گزری۔ اپنے جہاز کے ہمراہیوں کے عقب میں چلتے ہم ایک کاؤنٹر پر پہنچے۔ یہاں فی

کس تین سو بھات کے عوض ہمیں تھائی لینڈ میں انٹری دی گئی۔ ان دنوں بنکاک، سنگاپور وغیرہ کے لیے ویزے کی پابندی نہیں تھی۔ انٹری کے سلسلے میں ہمیں ائر پورٹ پر ہی تصویریں بھی کھنچوانا پڑیں۔ تصویروں کے چارجز بہت زیادہ محسوس ہوئے۔ فی کس دو تصویروں کے عوض ایک سو چالیس بھات ہتھیائے گئے۔ اکمل بولا۔ ”اس سے تو بہتر تھا یار، کہ ہم پاکستان سے ہی تصویریں کھنچوا آتے۔“

”تو چلو اب چلے چلتے ہیں۔ بارہ تیرہ ہزار روپیہ کرایہ ہی ہے نا۔“

اکمل برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

ان دنوں یعنی 93ء میں پاکستانی ”روپے“ اور تھائی کرنسی ”بھات“ کی قیمت قریباً برابر برابر ہی تھی۔ ہمارا قریباً 600 روپیہ ائر پورٹ پر اترتے ہی خرچ ہو گیا تھا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر حسب توقع قطار بہت طویل تھی۔ کھڑے کھڑے ٹانگیں اکڑ گئیں۔ ٹانگیں تو یقیناً اکمل کی بھی اکڑی ہوں گی لیکن وہ چونکہ نظاروں کے حسن میں کھویا ہوا تھا لہٰذا اسے زیادہ محسوس نہیں ہوا۔ جس وقت ہم ائر پورٹ سے برآمد ہوئے تو شام ہونے والی تھی۔ نومبر کی یہ شام خوبصورت تھی، بنکاک میں اتر کر مزید خوبصورت ہو گئی تھی۔

ہمیں اپنے پروگرام کے مطابق جی پی او کے علاقے میں جانا تھا لیکن کوئی ٹیکسی وہاں جانے کو تیار نہیں تھی۔ اگر کوئی تیار ہوتی تھی تو وہ بہت زیادہ کرایہ مانگتی تھی۔ اکمل نے مجھے دھمکی دے رکھی تھی کہ تھائی سرزمین پر قدم رکھتے ہی جو پہلی لڑکی اسے نظر آئے گی وہ دھڑام سے اس پر عاشق ہو جائے گا۔ ٹیکسی کی پریشانی میں وہ وقتی طور پر اپنی یہ قسم بھی بھول گیا تھا۔

اسی دوران ہمیں رحمت کے دو فرشتے نظر آئے۔ دونوں فرشتوں کا رنگ قدرے سانولا تھا اور وہ پاکستانی لگتے تھے۔ کچھ بھی تھا ہمارے لیے تو وہ رحمت کے فرشتے ہی ثابت ہوئے۔ وہ بھی جی پی او جانا چاہ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بنکاک کے بھیدی ہیں اور اس کا ثبوت انہوں نے یوں دیا کہ جو ٹیکسی والے ہمیں ڈھائی تین سو بھات کرایہ بتا رہے تھے وہ دو سو بھات میں جی پی او جانے کو تیار ہو گئے۔ یہ کرایہ بھی چونکہ ہم چاروں میں بٹ گیا تھا اس لیے بہت کم محسوس ہو رہا تھا۔ ایک سہانی شام کا لطف اٹھاتے ہم شہر کے مضافات سے شہر کے اندرونی حصے کی طرف چل دیئے۔ بنکاک کی ٹریفک خاصی تیز اور رواں دواں ہے۔ لوگ ٹریفک قوانین کی پابندی کرتے ہیں۔ بسیں صاف ستھری ہیں اور انہیں ڈیکوریٹ کیا گیا ہے۔ کاریں بھی کثرت سے نظر آئیں۔ تاہم موٹر سائیکل اور

رکشا بھی نظر آ رہے تھے۔ ہم قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں جی پی او کے گردونواح میں پہنچ گئے۔

لاہور میں اکمل کے ایک دوست نے بتایا تھا کہ ہم کیانہ ہوٹل میں رہیں۔ بڑی اچھی جگہ ہے۔ ہم نے یہ ہوٹل دیکھا اور مشترکہ طور پر ناپسند کیا۔ ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ ہمارے ساتھ ٹیکسی میں سفر کرنے والے دونوں افراد کا تعلق شیخوپورہ سے تھا۔ وہ کسی سستے سے ہوٹل کی تلاش میں تھے۔ ایک دو جگہ انہوں نے نیم تاریک اور ناصاف ہوٹلوں کے سامنے ٹیکسی رکوائی اور ریٹ طے نہ ہو سکنے کے سبب پھر ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ ان دونوں صاحبان کا معیار دیکھنے کے بعد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم ہوٹل منتخب کرنے کے سلسلے میں ان کے مشورے پر ہرگز عمل نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے بجٹ کے مطابق ایک اچھے اور صاف ستھرے ہوٹل میں قیام کرنا چاہ رہے تھے۔

آخر ایک نسبتاً صاف ستھرے علاقے میں ہم ٹیکسی سے اتر آئے۔ ٹیکسی سے اترتے ہی شیخوپورہ کے ان دو سانولے صاحبان سے ہماری جان چھوٹ گئی۔ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں اور اکمل اپنے اپنے اٹیچی ہاتھ میں اٹھائے کسی صاف ستھرے ہوٹل کی تلاش میں آگے بڑھنے لگے۔ ٹیکسی سے اترنے کے بعد اکمل نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ کوؤں کی اس جوڑی سے جان چھوٹی۔''

''بری بات ہے یار! کسی کو اس کی شکل یا رنگت کی وجہ سے مذاق کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے۔''

''برادر! میں انہیں ان کی عیاری کی وجہ سے کوؤں کا خطاب دے رہا ہوں۔ بڑے خرانٹ لگتے تھے مجھے دونوں۔ ہم سے انہوں نے ہمارے حصے کے سو بھات لے لیے ہیں لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے ڈرائیور کو پورا کرایہ نہیں دیا۔ تم دیکھ نہیں رہے تھے ڈرائیور کیسے جھلایا ہوا تھا۔''

''چلو یار چھوڑو۔ اس خوبصورت شام کو دیکھو، جو اس فٹ پاتھ پر ہمارے ساتھ چل رہی ہے۔''

اکمل نے ایک گہری سانس لی اور ایک ہی نظر میں دس بارہ تھائی لڑکیوں کو تاڑنے کے بعد بولا۔ ''میں بھی سوچتا تھا کہ یہ ادیب لوگ جب سفرنامہ وغیرہ لکھتے ہیں تو اس میں کوئی نہ کوئی خوبصورت لڑکی کیسے گھس آتی ہے۔ یہاں لڑکیاں ہیں ہی اتنی زیادہ کہ انہیں دیکھے اور لکھے بغیر گزارہ ہی نہیں۔ کاش میں بھی ابن انشاء ہوتا۔''

''اگر تم ابن انشاء ہوتے تو سفرنامہ نہ لکھتے کوک شاستر لکھتے اور وہ شائع ہوتے ہی فحش نگاری کی وجہ سے ضبط بھی ہو جاتی۔

اکمل نے تاؤ کھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اچانک اسے اپنی دھمکی بھی یاد آ گئی۔ اس نے جہاز میں مجھے دھمکایا تھا کہ بنکاک میں جو سب سے پہلی لڑکی اسے نظر آئے گی۔ وہ دل و جان سے اس پر عاشق ہو جائے گا۔ وہ بولا۔ ''تم نے میری پوشل پر پاؤں رکھ کر اچھا ہی کیا ہے۔ لو بچہ جی اب تماشا دیکھو۔''

اس نے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنے گھنگریالے بالوں کو سیٹ کرنے کی ناکام کوشش کی، قمیض کا کالر درست کیا اور اس لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو فٹ پاتھ پر ہمارے عین سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کا خوبصورت اسکرٹ پہن رکھا تھا اسی رنگ کی جوتی تھی۔ پھول دار چھتری لیے وہ خراماں خراماں ہماری طرف چلی آ رہی تھی۔

میں نے زور سے اکمل کا کندھا دبایا کہ وہ کہیں کوئی حماقت نہ کر بیٹھے مگر ایسے لمحوں میں وہ ایک اڑیل ٹٹو بن کر ہر قسم کے نتائج سے بے پروا ہو جاتا تھا۔ لڑکی قریب پہنچی تو اکمل نے دانت نکال کر ''ہیلو'' کہا۔

میں دل میں ''جل تو جلال تو'' کا ورد کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حوصلہ ہوا کہ لڑکی نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ نہ صرف جواب دیا بلکہ رک بھی گئی۔

''ہاؤ ڈو یو ڈو۔'' اکمل نے کہا۔

''او کے...... فائن!'' لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔'' اکمل نے انگریزی میں گھسا پٹا جملہ کہا۔

لڑکی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

اکمل نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ شاید ہم فلونگ مارکیٹ میں ملے تھے۔ یا پھر سوئی وانگ روڈ کی کسی بغلی گلی میں۔'' ایک لمحہ توقف کر کے وہ بولا۔ ''کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کسی ریسٹورنٹ میں نہیں بیٹھ سکتے؟''

وہ بس مسکرا کر رہ گئی۔ ہمیں لگا کہ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

اکمل بولا۔ ''دیکھیں مس! آپ مجھے کوئی غلط نوجوان مت سمجھیں۔ میں ایک سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص ہوں لیکن...... آپ کی چہرے میں پتا نہیں کیا بات ہے۔ اسے دیکھ کر ایک دم بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں۔ ایک

دوسرے سے باتیں کر چکے ہیں۔ آپ کی آواز کی معصومیت، آپ کے چہرے کی پاکیزگی۔ یہ سب کچھ مجھے جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔"

لڑکی نے ایک بار پھر مسکرا کر منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔

اکمل نے اپنا بیگ وہیں فٹ پاتھ پر رکھ دیا تھا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ "پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے مس! کسی وقت ہم کسی کو دیکھتے ہیں تو یہی لگتا ہے کہ مدت سے اسے جانتے ہیں۔ اس کی ذات کی خوشبو پتا نہیں کب سے ہمارے اندر رچی بسی ہوئی ہے۔ ہوتا ہے نا جی ایسا؟"

لڑکی ایک دفعہ پھر مسکرا کر رہ گئی۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ اکمل ہوا میں تلواریں چلا رہا ہے۔ لڑکی انگریزی جانتی ہی نہیں۔ یا پھر اتنی ہی جانتی ہے جتنی کہ بول چکی ہے۔ لڑکی نے اکمل کی طرف دیکھ کر ایک بے ہودہ اشارہ کیا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ یہ چاہتا ہے۔

میرے ساتھ ساتھ اکمل کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ غالباً اسے بھی اندازہ نہیں تھا کہ لڑکی اس قدر بے باک اور کھلی ڈلی ہوگی۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے پھول پیش کرنے والے کے سر پر جواباً عطر کا منکا توڑ دیا جائے۔ اب اکمل صاحب بغلیں جھانک رہے تھے۔ انہیں کچھ جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

لڑکی نے سوالیہ انداز میں اکمل سے کچھ کہا۔ غالباً ٹوٹی پھوٹی نہایت شکستہ انگریزی میں اس نے یہی پوچھا تھا کہ "معاملے" میں مزید پیش رفت کرنے کے لیے ہمیں کہاں چلنا ہے؟

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اکمل نے بوکھلاہٹ میں اردو بولی۔

اس آفت زادی کی سمجھ میں انگلش نہیں آئی تھی۔ اردو کہاں سے آتی۔

راہگیر مڑ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ لڑکی جو یقیناً ایک کال گرل تھی۔ سرِ شام اتنے اچھے گاہکوں کو ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اکمل کے لیے لگاوٹ کے دریا بہہ رہے تھے۔ اکمل کی حالت یہ تھی کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

اس موقع پر میں معاملے کو سنبھالنے کے لیے آگے بڑھا۔ میں نے اشاراتی زبان کے ساتھ انگریزی کو مکس کرتے ہوئے لڑکی کو سمجھایا کہ ہم ابھی ابھی ائرپورٹ سے تشریف لائے ہیں اور ابھی ہم اس قسم کے کوئی مقاصد نہیں رکھتے مگر لڑکی مصر تھی اور کسی جناتی زبان میں مسلسل بول رہی تھی۔

باالفاظ دیگر وہ ہمارے گلے پڑ گئی تھی۔ ایک قریبی دکان میں ایک بارعب سے سردار صاحب کھڑے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہمارے پاس چلے آئے۔ ہمارے بتائے بغیر وہ سب کچھ جان گئے تھے۔ وہ مقامی زبان بھی جانتے تھے۔ انہوں نے لڑکی سے مکالمہ کیا۔ چند سوال جواب ہوئے پھر لڑکی نے مایوسی میں سر ہلایا اور منہ میں کچھ بڑبڑا کر آگے بڑھ گئی۔

اس کے جانے کے بعد سردار صاحب نے کہا۔ "لگتا ہے پاکستان سے آئے ہو۔"

ہم دونوں نے بیک وقت اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولے۔ "میرا نام راکیش سنگھ ہے۔ وہ سامنے کپڑے کی دکان ہے۔ پچھلے پندرہ سال سے اس شہر کو دیکھ رہا ہوں میں...... یہ بڑا بے وفا شہر ہے۔ یہاں تمہیں بڑے دھیان سے رہنا ہوگا۔ قدم قدم پر ایسی ہی چھوکریاں ملیں گی اور چھوکریاں ہی نہیں ان کے دلال بھی یہاں دندناتے پھرتے ہیں۔ وہ دیکھو...... وہ سامنے کھمبے کے نیچے جو پینٹ بوشرٹ والا گنجا کھڑا ہے وہ بھی تمہیں ہی تاڑ رہا ہے۔"

سردار صاحب ہمیں اپنی صاف ستھری دکان کے اندر لے گئے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "جناب اس لڑکی سے آپ نے ہماری جان کیسے چھڑوائی؟"

بولے۔ "مقامی طریقے سے میں نے پوچھا کتنی رقم لوگی؟ اس نے جتنی بتائی میں نے اس کا دسواں حصہ بتائی اور اسی پر پکا رہا۔ وہ بھناتی ہوئی چلی گئی۔" چند لمحے توقف کرنے کے بعد انہوں نے کہا۔ "مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم سیر سپاٹے کے لیے آئے ہو۔ سیر سپاٹے کے لیے آنے والے ہی یہاں سب سے زیادہ لٹتے ہیں۔ خوب چوکس رہو۔ جیب تراشی اور نوسربازی عام ہے۔"

ہم نے ادھیڑ عمر سردار صاحب کو فرمانبرداری سے یقین دلایا کہ ایسا ہی کریں گے۔ انہوں نے پوچھا۔ "رہائش کے لیے کوئی ہوٹل ذہن میں ہے؟"

میں نے کہا۔ "تین چار ہوٹل دیکھ چکے ہیں۔ کچھ ہمارے معیار کے نہیں، کچھ کے معیار کے ہم نہیں۔ مطلب کہ ان کا کرایہ زیادہ ہے۔"

پوچھنے لگے کہ کتنا زیادہ ہے۔ میں نے کہا۔ "پچھلے موڑ پر نیو پرنسویلا ہوٹل دیکھا ہے۔ وہ ڈبل بیڈ کا قریباً ڈیڑھ ہزار بھات مانگ رہے ہیں۔"

"ہاں یہ تو کافی زیادہ ہے۔" سردار جی نے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ "نیو ٹروکیڈرو" چلے

جاؤ۔ وہ سامنے اس کا نیون سائن نظر آ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں تمہاری بات بن جائے گی۔"

سردار راکیش سنگھ کا کہا درست ثابت ہوا۔ نیو ٹروکیڈرو میں ہماری بات بن گئی۔ ہوٹل لگژری ٹائپ اور خوب صاف ستھرا تھا۔ کرایہ بھی مناسب تھا 1242 بھات میں سے ڈسکاؤنٹ کر کے 932 روپے چارج کیے گئے۔ ہم تھکے ہوئے تھے۔ رات بڑے سکون سے گزری۔ سونے کے لیے لیٹے تو پھر صبح ہی آنکھ کھلی۔ اکمل نے کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ تم بستر پر لیٹنے سے پہلے ہی سو چکے تھے۔"

"کیوں تمہیں نیند نہیں آ رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"آ تو رہی تھی لیکن میں نے سوچا کہ بنکاک میں اپنی پہلی شام ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ کچھ دیر تک تمہیں جگانے کی کوشش کرتا رہا پھر اکیلا ہی گھومنے کے لیے نکل گیا۔ یہیں پاس ہی ایک ہوٹل سے بڑا بدمزہ پیزا کھایا۔ تھوڑی سی کوک پی اور تھوڑی سی چہل قدمی کر کے واپس آ گیا۔ واپسی پر اس گنجے تھائی سے ملاقات ہو گئی جو کھمبے کے نیچے کھڑا مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔"

"پھر کیا کہا اس نے؟"

"وہی جو اسے کہنا چاہیے تھا بیوٹی فل گرل، لولی گرل، اونلی فور ہنڈرڈ......"

"اوہ خدایا! اس شہر کے تیور تو کچھ زیادہ ہی خراب ہیں۔" میں نے کہا۔

"اگر ہم خراب نہیں تو تیوروں سے کیا ہو گا۔"

"اگر ہم بھی خراب ہو گئے تو کیا ہو گا۔ میرا تو خیال ہے کہ ہم پر ماحول نے تھوڑا تھوڑا اثر کرنا شروع کر دیا ہے اور خاص طور سے تم پر۔ مجھے تو شک ہو رہا ہے......" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"کیا شک ہو رہا ہے؟" اس نے میرا گریبان پکڑا۔

"یہی کہ تم اس گنجے سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کے لیے ہی چہل قدمی کے لیے نکلے تھے۔"

وہ میرے اوپر سوار ہو گیا اور میرا گلا دبانا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی دھینگا مشتی کے بعد ہم دونوں کی طبیعت بحال ہو گئی۔ (اور کمرہ بدحال ہو گیا)

رات کو چہل قدمی سے واپس آتے ہوئے اکمل ریڈی میڈ ناشتہ لے آیا تھا۔ یعنی ڈبل

روٹی، جیم، مکھن اور چاکلیٹ ملا دودھ وغیرہ۔ ناشتے کے بعد ہم چہل قدمی کے لیے نکل گئے۔ بنکاک آہستہ آہستہ ہم پر آشکار ہو رہا تھا۔ ہم تصویریں کھینچتے رہے اور بنکاک کی صاف ستھری سڑکوں پر چہل قدمی کرتے رہے۔ ہم عام قد و کاٹھ کے تھے۔ میرا قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ اکمل مجھ سے ایک ڈیڑھ انچ چھوٹا ہو گا لیکن مقامی تھائی لوگوں کے درمیان گھومتے پھرتے ہم خود کو بہت طویل قامت محسوس کر رہے تھے۔ جس سڑک پر ہمارا ہوٹل تھا وہ سوئی وانگ روڈ کہلاتی تھی۔ کافی کشادہ اور صاف ستھری روڈ تھی۔ اس روڈ پر ہوٹل سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہمیں ایک ایسی شے نظر آئی جس نے ہمارا دل باغ باغ کر دیا۔ یہ ایک بورڈ تھا جس پر "عصمت ہوٹل" کے الفاظ لکھے تھے۔ نیچے یہ بھی درج تھا کہ یہاں ہر قسم کے پاکستانی کھانے ملتے ہیں۔ کل سے ہمارے ذہن میں چوہوں، مینڈکوں اور بلیوں وغیرہ کے گوشت سے پکے ہوئے سالن گھوم رہے تھے۔ عصمت ہوٹل کے مینو میں، ماش کی دال، آلو مٹر، شامی کباب، فرائڈ مچھلی جیسے الفاظ دیکھے تو جان میں جان آئی۔ ہوٹل کا کرتا دھرتا ایک نوید نامی نوجوان تھا، یہ خاصا ملنسار شخص تھا۔ عصمت ہوٹل میں پہنچ کر ہمیں بنکاک کی اجنبیت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔

دوپہر کا کھانا ہم نے عصمت ہوٹل میں ہی تناول کیا۔ ماش کی دال، مرغی اور گرما گرم تندوری روٹی۔ کھانے کے بعد ریٹ مناسب ہی تھے۔ تاہم روٹی قدرے مہنگی محسوس ہوئی۔

دس بھات یعنی قریباً دس روپے کی ایک روٹی تھی۔ مجموعی طور پر کھانا بہتر ہی تھا۔ کھانے کے بعد ہوٹل کے کمرے میں واپس آئے۔ میں تو جلد ہی سو گیا اور ایسا سویا کہ شام کو ساڑھے پانچ بجے کے لگ بھگ اٹھا۔ جاگتے کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں کمرے میں اکیلا ہوں۔ اکمل حسب عادت تنہا ہی کہیں گھومنے پھرنے نکل گیا تھا۔ میں نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر یوں ہی ٹی وی آن کیا اور چینل چیک کرنے لگا۔ اس مشغلے سے اکتا کر کمرے کی جہازی سائز کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا اور نیچے تیزی سے رواں دواں سوئی وانگ روڈ کا نظارہ کرنے لگا، یہ بھی ایک خوبصورت شام تھی۔ شام ہوتے ہی بنکاک کی آنکھیں روشن ہو کر جھلملانے لگی تھیں اور وہ ایک آراستہ دلہن کی طرح انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔

دفعتاً میں بری طرح چونک گیا۔ ہمارا کمرا فرسٹ فلور پر تھا۔ میں نے نیچے جھانکا تو مجھے

اکمل صاحب نظر آئے۔ جناب ایک تھائی لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈالے آئس کریم نوش کرتے خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں مزید چونکا کہ یہ وہی کل والی فتنہ ساماں لڑکی تھی جس پر (اپنی دھمکی کے مطابق) اکمل دھڑام سے عاشق ہوا تھا اور وہ بھی دھڑام سے اکمل پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ بعد ازاں ہمارے سکھ کرم فرمانے بمشکل اس سے ہماری جان چھڑائی تھی۔

جی چاہا کہ یہیں سے جوتا اتار کر اکمل کی کھوپڑی پر کھینچ ماروں۔ وہ پتا نہیں کہاں سے اس بلا کو اپنے ساتھ چپکا لایا تھا۔ میرے بدترین خدشات کے عین مطابق وہ ہوٹل میں داخل ہوا اور پھر تھوڑی دیر بعد کمرے میں آ دھمکا۔ درمیانے قد اور درمیانے خدوخال والی ''آفت جاں'' بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے بڑی ادا سے اپنے گھٹنوں کو خم دے کر مجھے آداب پیش کیا۔

میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''اوئے گھامڑ! یہ کیا کر دیا ہے تم نے اس شیطان زادی کو ہمراہ لے آئے ہو۔ بس میں واپس جا رہا ہوں لاہور...... ابھی اور اسی وقت کہاں ہے میرا پاسپورٹ۔''

وہ بولا۔ ''شوق سے جاؤ...... لیکن جانے سے پہلے میری بات سن لو۔ میرے پیارے پھر!''

''ہاں بکو۔''

''میں نے اس بی بی کو بڑی اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہم بس دوستی کی حد تک ہی ایک دوسرے سے ملیں گے۔ ہلکا پھلکا رومانس کریں گے اور بس۔''

''ہلکا پھلکا رومانس کب بھاری بھرکم رومانس میں تبدیل ہو جائے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اور تمہارے سلسلے میں تو اس طرح کا رسک بالکل نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں پہنچ کر تمہارے طور طریقے مجھے بہت بدلے بدلے نظر آ رہے ہیں۔''

''اوئے لومڑ! تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے جو کہہ دیا ہے اس پر عمل کروں گا۔'' وہ میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔

لڑکی ایک صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ اس نے کمرے میں موجود ریفریجریٹر سے خود ہی ایک بیئر نکال لی تھی اور اس کی چسکیاں لینے میں مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ تھوڑی کے قریب سیاہ تل تھا۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اسے اسمارٹ کہا جا

سکتا تھا اکمل کا جسم موٹا نہیں تھا تاہم کسی وقت اس کا پیٹ تھوڑا سا بھاری نظر آتا تھا۔ لڑکی نے شوخی سے اس کے پیٹ پر انگلی چبھوئی اور بولی۔ ''بے بی...... بے بی؟''

یعنی کیا یہاں بچہ ہے؟

میں ہنس دیا۔ اکمل ذرا خجل نظر آنے لگا۔

لڑکی کا نام چانگ تھا۔ وہ ہم دونوں کی طرف اشارہ کر کے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی۔ ''یو بوتھ ہینڈسم۔''

اکمل نے ترنگ کر اردو میں کہا۔ ''تمہارا بیڑا غرق ہو جائے، تمہیں یہاں میں لایا ہوں یا یہ لایا ہے۔ میری طرف توجہ دو صرف میری طرف۔''

وہ بس مسکرا کر اکمل کی طرف دیکھتی رہی۔

چانگ تقریباً ایک گھنٹہ ہمارے ساتھ رہی۔ اس دوران وہ بیئر کے تین ٹن پی گئی اس کے علاوہ بھی اس نے ریفریجریٹر میں موجود کھانے کی اشیاء پر ہاتھ مارا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے عصمت ہوٹل میں جا کر کھانا کھایا۔ اکمل نے مچھلی منگوائی۔ ساتھ میں ماش کی دال تھی۔ مچھلی پلیٹ میں سج کر سامنے آئی تو ہم بری طرح چونکے۔ وہ اسی حالت میں تھی جس میں پانی کے اندر تیرتی ہے۔ دم، آنکھیں، چانے سب کچھ سلامت تھا۔ ساتھ میں گرم گرم تندوری روٹی تھی۔ بہرحال کھانے کا مزہ آیا۔ نوجوان نوید اس مختصر ہوٹل کا مالک تھا۔ اکثر وہ کھانا بھی خود ہی سرو کرنے لگتا تھا۔ نوید کی بیوی تھائی تھی اور اس کا ایک خوبصورت بچہ بھی تھا۔ بچہ یہی کوئی ایک سال کا ہو گا۔ ہوٹل میں آنے والے تقریباً سارے ہی گاہک بچے کو بہت چوستے چاٹتے تھے۔ نوید کی بیوی ہوٹل کے عقبی حصے میں کچن سنبھالتی تھی۔ گاہے گاہے اس کا دیور بھی اس کی مدد کرتا تھا۔

عصمت ہوٹل میں کھانا کھانے کا ایک مزہ یہ بھی تھا کہ کھانے کے دوران سوئی وانگ روڈ کی خوبصورت روانی کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا تھا چمکتی دمکتی کاریں اور دیگر گاڑیاں فراٹے کے ساتھ شیشے کے دروازے کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔ موٹر سائیکلوں پر تھائی نوجوان جن کے عقب میں عموماً تھائی لڑکیاں ہوتی تھیں بڑے اسٹائل سے سفر کرتے تھے۔ سوئی وانگ روڈ کے فٹ پاتھ بہت صاف ستھرے تھے۔ ان پر چہل قدمی کرتے خواتین و حضرات کو دیکھنا بھی ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر تک سڑک پر چہل قدمی کی۔ تھوڑی سی شاپنگ بھی ہوئی۔ لاہور سے ایک دوست نے خاص قسم کی کافی

لانے کے لیے کہا ہوا تھا۔ کافی خرید کر ہم ہوٹل پہنچے۔ اکمل ٹی وی سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اسی دوران گراؤنڈ فلور سے تیز موسیقی کی آوازیں سنائی دیں۔ دیوہیکل قسم کے ڈرم بج رہے تھے اور ان کی گونج در و دیوار میں محسوس ہوتی تھی۔

میں نے بیرے سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے بھئی؟''

اس نے شستہ انگریزی میں جواب دیا۔ ''آج ہفتے کی رات ہے جی، نیچے واقع ڈسکو کلب میں ڈانس کا پروگرام ہے۔''

ہمارے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ یہ منظر دیکھا جائے۔ درحقیقت ہمارے ذہن سے بالکل ہی نکل چکا تھا کہ آج ہفتے کی شام ہے۔ ہفتے کی شام تو یہاں خصوصی رنگینیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا سامان لاتی تھی۔ ہم نے کمرے کو لاک کیا اور نہایت تیز موسیقی کے رخ پر چلتے ہوئے ڈسکو کلب میں پہنچ گئے۔ یہ کلب یا رقص گاہ دراصل ہوٹل کا ہی حصہ تھی۔ ایک بہت بڑا ہال سا تھا۔ اس کے اوپر چاروں طرف گیلریاں بنی ہوئی تھیں۔ گیلریوں میں میز کرسیاں لگی تھیں اور گیلریوں میں بیٹھ کر بھی وسطی ہال کے حالات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ حالات کچھ اس طرح تھے کہ ایک زبردست قسم کا جدید آرکسٹرا ہال کے وسط میں موجود تھا۔ ڈانسنگ فلور پر دو درجن کے قریب نوجوان لڑکے اور لڑکیاں والہانہ رقص کر رہے تھے۔ ڈرمز کا شور اتنا زیادہ تھا کہ کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ڈانسنگ فلور کے اردگرد بھی میز کرسیاں موجود تھیں۔ ان پر ہمیں زیادہ تر مقامی فیملیز ہی نظر آئیں۔ یہ سب اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ نوجوانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ خوش پوش ویٹرز میزوں پر خورد و نوش کی اشیاء بڑی تیزی سے بڑے ردھم سے سرو کر رہے تھے۔ یہ ردھم یقیناً شراب خانہ خراب کا ہی تھا۔ شراب یہاں پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی۔ پینے والوں کے ساتھ ساتھ ساقی یعنی ویٹرز بھی فل نشے میں تھے۔

ہم ایک میز پر بیٹھ گئے اور نیچے ہال میں ہونے والی خرمستیوں کو دیکھنے لگے۔ صنف نازک کے بارے میں اکمل کے خیالات جو بھی تھے لیکن شراب کو وہ بھی شجر ممنوعہ ہی سمجھتا تھا۔ ہم نے اپنے لیے سافٹ ڈرنکس منگوائے اور وہاں بیٹھنے کے لیے جواز پیدا کیا۔ جھلملاتی ہوئی تیز روشنیوں میں وہ دیوانہ وار اچھل کود ''رقص'' تو شاید نہیں کہی جا سکتی تھی لیکن اس میں ایک ایسا ہیجان تھا جو جسم کے اندر تک اترتا محسوس ہوتا تھا۔ ڈانسنگ فلور پر تو رقص ہو ہی رہا تھا۔ گاہے گاہے میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے خواتین و حضرات بھی اٹھ کر محو

رقص ہو جاتے تھے اور ''نازیبا حرکات'' کرنے لگتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ موسیقی کی لے تیز ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا دیوانگی آمیز ہیجان بھی بڑھتا گیا۔ بات نازیبا حرکات سے آگے بڑھنا شروع ہو گئی تھی۔ کچھ خواتین و حضرات مدہوش ہو کر قالینوں پر گر پڑے تھے اور وہیں اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اشرف المخلوقات کی یہ ''توقیر'' قابل دید تھی۔

تیز موسیقی کی لہروں میں ڈوبتی ابھرتی ایک لڑکی ہماری میز پر آ بیٹھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور مسلسل رقص کے سبب وہ پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ ہم جہاں بیٹھے تھے وہ جگہ نیم تاریک تھی۔ لڑکی کے خدوخال پوری طرح واضح نہیں تھے لیکن وہ خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ وہ دبلی پتلی تھی۔ اس کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس نے کیا پہن رکھا تھا لیکن جو کچھ بھی پہن رکھا تھا اس پر جچ رہا تھا۔ اس کے سڈول بازو شانوں تک عریاں تھے۔

''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' اس نے انگلش میں پوچھا۔

''پاکستان سے۔'' مجھ سے پہلے اکمل نے جواب دیا۔

''میرا اندازہ بھی یہی تھا۔'' وہ بولی۔ اس کی آواز بھی اس کی طرح نرم و نازک تھی۔

اس نے لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔ اس کے ہاتھ کا کنگن جھلملاتی روشنی میں برق کوندے کی طرح چمک گیا۔ اکمل کا ہاتھ لگنے سے اس کا چھوٹا سا پرس نیچے گر پڑا۔ پرس اٹھانے کے لیے وہ جھکی تو اس کا چہرہ دو تین سیکنڈ کے لیے تیز روشنی کی زد میں آیا۔ وہ واقعی خوبصورت تھی لیکن اس کی خوبصورتی سے زیادہ چونکانے والی چیز اس کے چہرے کی ملائمت اور چمک تھی۔ بہت ہی نفیس جلد کی مالک تھی وہ۔

''کیا آپ کو کوئی پارٹنر درکار ہے۔'' لڑکی نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''نج...... جی نہیں ہم فی الحال تنہا بیٹھنا چاہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ وش یو گڈ لک۔'' اس نے خوش دلی سے کہا اور ہمیں گڈ بائے کہہ کر اٹھ گئی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہم بھی اٹھ کر واپس کمرے میں آ گئے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ غالباً تین بجنے والے تھے لیکن رقص گاہ کا ہلا گلا اب بھی جاری تھا۔ موسیقی کی مدھم آواز کمروں کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ اس وقت کھڑکی سے باہر دن کا اجالا پھیلنا

شروع ہو گیا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھ کر نیچے سڑک پر جھانکا۔ نشے میں ٹن خواتین و حضرات کلب سے نکل نکل کر گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ میں نے ایک جسیم نوجوان کو دیکھا اس نے اپنی مدہوش پارٹنر کو باقاعدہ گود میں اٹھا کر گاڑی میں پہنچایا۔ ہفتے کی شام کو شروع ہونے والا ہنگامہ اتوار کی صبح کو اختتام پذیر ہوا تھا۔ میں پھر جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

میری آنکھ دس بجے کے بعد کھلی۔ آج ہمارا پروگرام ''رابنسن اسٹور'' جانے کا تھا۔ یہ بنکاک میں شاپنگ کی بے مثال جگہوں میں سے ایک ہے۔ عصمت ہوٹل کے مالک نوید کو بھی اپنے کسی واقف کار سے ملنے رابنسن اسٹور جانا تھا۔ ہمارا پروگرام اس کے ساتھ ہی جانے کا بنا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں گیارہ بجے عصمت ہوٹل پہنچنا تھا تاکہ وہاں سے نوید کو ساتھ لے کر نکلیں۔ میں نے اکمل کو جاگنے اور تیار ہونے کے لیے کہا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ رات کو وہ جو ''شدید'' قسم کی موسیقی سنتے رہے ہیں اس کے دھماکے ابھی تک دماغ میں ہو رہے ہیں۔

میں نے اسے بتیرا کہا کہ نوید کے ساتھ پروگرام طے ہے وہ ہوٹل میں ہمارا انتظار کرے گا لیکن اکمل پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر میں نے اکیلے ہی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اکمل نے تین سو بھات میرے ہاتھ میں تھما دیئے اور جو ایک دو چیزیں اس نے خریدنی تھیں، ان کے نام بتا دیئے قصہ مختصر میں نوید کے ساتھ اکیلا ہی رابنسن اسٹور پہنچا۔

اسٹور کے سات آٹھ فلور ہیں۔ یہاں ہر قسم کی خریداری کی جا سکتی ہے۔ تاہم مجھے اشیاء کچھ مہنگی محسوس ہوئیں میں نے شیشے کے کچھ خوبصورت ڈیکوریشن پیس خریدے۔ والدہ کے لیے ایک گھڑی بھی لی۔ اسٹور کا اندرونی منظر دیدنی تھا۔ الیکٹرک سیڑھیوں پر خریدار قطار اندر قطار متحرک نظر آئے۔ یہاں ٹورسٹ بھی بھاری تعداد میں شاپنگ کے لیے آتے ہیں۔ ہر نسل اور رنگ کے لوگ رابنسن اسٹور میں خریداری کر رہے تھے۔ میں نے کچھ سیاحوں کو اسٹور کے اندر ہی اپنے ڈالرز وغیرہ مقامی کرنسی میں تبدیل کراتے دیکھا۔ یہاں ایک فلور پر الیکٹرانکس کا سامان ڈھیروں ڈھیر پڑا تھا۔ اسی سامان میں مجھے ایک بہت بڑا ٹی وی سیٹ دکھائی دیا۔ سیٹ کی اونچائی زمین سے قریباً پانچ فٹ اور چوڑائی سات فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ٹی وی سیٹ کے ساتھ جمبو سائز کا ٹیپ ریکارڈ اور اسپیکرز وغیرہ بھی موجود تھے۔ اس مکمل سیٹ کی قیمت ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اسٹور کے اندر مائیکروفونز کے ذریعے مختلف قسم کی اناؤنس منٹس جاری رہتی ہیں۔ مقامی زبان میں ایک

اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ نوید نے مجھے بتایا کہ شاپنگ کے دوران ایک بچہ گم ہو گیا ہے۔ اس کے بارے میں اعلان کیا جا رہا ہے۔

اسٹور سے گھوم پھر کر اور کچھ خریداری کر کے میں شام کو سات بجے کے لگ بھگ ہوٹل واپس پہنچا۔ ہوٹل کے قریب فٹ پاتھ پر گنجا تھائی...... کھمبے کے نیچے کھڑا تھا۔ میں قریب سے گزرا تو اس نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری اور وہی فقرہ بولا جو وہ دن میں سینکڑوں مرتبہ بولتا تھا۔ ''ہیلو مین! بیوٹی فل گرل...... لولی گرل...... ویری لو پرائس......'' میں اس سے آنکھیں چراتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اکمل صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی مہ جبین کچھ دیر پہلے تک اس کمرے میں موجود تھی اور عین ممکن تھا کہ یہ وہی بلا ہو جو بنکاک میں داخل ہوتے ہی ہمیں چمٹ گئی تھی۔ یعنی کافرادا مس چانگ۔ اگلے پانچ دس منٹ میں میرے اس خیال کی مکمل تصدیق ہو گئی۔ میرے جانے کے بعد چانگ یہاں آئی تھی اور اس نے کافی وقت اکمل کے ساتھ گزارا تھا۔

میں نے اکمل کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تمہارا سر درد صرف ایک بہانہ تھا۔ تم مجھ سے بس یہ کمرا خالی کرانا چاہتے تھے کیونکہ اس چھمک چھلو کے ساتھ تمہارا ٹائم طے تھا۔''

''یار! بڑے زبردست قسم کے بدگمان ہو تم۔'' اکمل بولا ''تمہارے سر کی قسم بس وہ اتفاقاً ہی آ گئی تھی۔''

''اور پھر اتفاقاً ہی پانچ چھ گھنٹے یہاں رہی۔''

''یار! تم بالکل ڈیڈی جان لگ رہے ہو۔ بلکہ اتنی سختی سے تو وہ بھی نہیں بولتے۔''

میں خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔ آج مجھے حقیقی معنوں میں اکمل پر غصہ آیا تھا۔ فلرٹ اور رومانس وغیرہ کے حوالے سے مجھے اکمل کے نظریات سے ہمیشہ اختلاف رہا تھا۔ اب اس ''شہرِ خرابی'' میں آ کر یہ اختلاف بڑی تیزی سے نمایاں ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اس شہر کا ماحول یہاں آنے والوں کو ہپناٹائز کر دیتا ہے اور اگر ان کے مزاجوں میں عیش و طرب کے لیے تھوڑی سی گنجائش بھی موجود ہو تو وہ اس شہر کے مخصوص رنگ میں رنگتے چلے جاتے ہیں۔ بنکاک ایک خوبصورت شہر تھا۔ یہاں دیکھنے کے لائق کئی جگہیں تھیں لیکن شام ڈھلتے ہی یوں لگتا تھا کہ پورا شہر بازارِ حسن کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

گلی کوچوں میں دلال کھڑے ہیں اور نظر آنے والی ہر عورت "برائے فروخت" ہے۔

نوید نے راستے میں ہی مجھے تھوڑا بہت کھلا پلا دیا تھا۔ میں کھانا کھائے بغیر ہی سو گیا۔ سویرے میری خفگی دور کرنے کے لیے اکمل نے میرے جاگنے سے پہلے ہی ناشتہ تیار کر کے میز پر سجا دیا تھا۔ ناشتے کے دوران وہ ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ بہر حال چانگ کے بارے میں میں نے کوئی بات کی نہ اس نے۔

سہ پہر تک میں اور اکمل ادھر اُدھر گھومتے رہے اور تصویریں کھینچتے رہے۔ بنکاک میں تراشیدہ پھل چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پر رکھ کر بیچا جاتا ہے۔ ان ریڑھیوں پر عموماً شیشے کا کیبن بنا ہوتا ہے جن کے اندر کٹا ہوا پھل سلیقے سے سجایا جاتا ہے۔ ہم نے دس بھات میں کٹے ہوئے اناناس کا لفافہ خریدا۔ بہت شیریں تھا، وزن بھی ڈھائی سو گرام سے کم نہیں تھا۔ چار بجے کے قریب ہم ہوٹل واپس آئے۔ ہم دونوں کا موڈ کافی بحال ہو چکا تھا کہ چانگ پھر آ دھمکی۔ آج اس نے ہونٹوں پر ہلکی سی لالی بھی لگائی ہوئی تھی۔

وہ موج میلے کے موڈ میں تھی۔ آتے ساتھ ہی اس نے ریفریجریٹر میں ہاتھ مارا لیکن بیئر وہاں نہیں تھی۔ میں نے رکھوائی ہی نہیں تھی۔ چانگ اور اکمل کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر دونوں نے ہی میری بیزاری کو محسوس کر لیا۔ خاص طور سے اکمل نے کیا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ چانگ کو لے کر گھومنے پھرنے کے لیے باہر چلا جائے۔

اکمل کی واپسی رات ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ پتا نہیں کہاں کہاں آوارہ گردی کرتا رہا تھا۔ میری ناراضگی محسوس کر کے کہنے لگا۔ "اچھا یار شاداب! تجھ سے وعدہ آج کے بعد چانگ سے نہیں ملوں گا۔"

آنے والے دنوں میں اکمل نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ وہ چانگ سے نہیں ملا۔ وہ دو تین اور لڑکیوں سے ملا۔ ایک کو پتایا بیچ پر لے کر گیا اور ساحل کی ہوا میں رات بھر خرمستیاں کرنے کے بعد صبح کے قریب واپس آیا۔ ایک لڑکی کے ساتھ لیڈیز ہوم دیکھنے گیا۔ ایک پری چہرہ ہمارے کمرے میں آئی۔ میں اس وقت عصمت ہوٹل میں نوید کے پاس بیٹھا تھا۔ واپس آیا تو کمرے سے نسوانی خوشبو آئی۔ اور بنت حوا کی موجودگی کی کچھ دیگر نشانیاں ملیں اس موقع پر میرے اور اکمل کے درمیان تھوڑی سی تلخ کلامی ہوئی۔ ہم دونوں اپنے اپنے بستر پر منہ لپیٹ کر سو گئے۔

اگلے روز بھی ہم دونوں میں کھچاؤ برقرار رہا۔ چار پانچ دن میں ہی میرا دل بنکاک سے

اچاٹ ہونے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کئی معاملوں میں میرا اور اکمل کا رویہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ میں نے باتوں باتوں میں اکمل کے سامنے یہ تجویز بھی رکھ دی کہ کیوں نا دو دن مزید یہاں رہ کر اور "قابل دید جگہیں" دیکھ کر واپس چلا جائے۔

اکمل نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اسے میری یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔

میں نے کہا۔ "یار! اب یہاں رہ کر کرنا کیا ہے۔ کچھ جگہیں دیکھ لی ہیں۔ جو دو چار رہ گئی ہیں وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کل فون پر امی جی کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ابا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اکمل بولا۔ "دیکھ شاداب! دو ڈھائی سال تیری منتیں کرتا رہا ہوں تو اب ہم پندرہ دن کے لیے یہاں آئے ہیں۔ اب یہ پندرہ دن بھی تجھے کھٹکنا شروع ہو گئے ہیں۔ یار تو ساری زندگی میں سے یہ پندرہ دن بھی میرے لیے نہیں نکال سکتا۔"

میں خاموش ہو گیا لیکن یقیناً میرے چہرے کے تاثرات سے یہی لگ رہا تھا کہ بنکاک سے میرا دل ایک دم اکتا گیا ہے۔

اگلے دن میں تقریباً دس بجے سو کر اٹھا۔ اکمل اپنے بستر پر نہیں تھا۔ ایک دم مجھے لگا کہ کمرے میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ تھوڑا سا غور کیا تو اندازہ ہوا کہ اکمل کے وہ کپڑے جو سامنے ہینگر پر لٹکے ہوئے تھے وہاں موجود نہیں ہیں۔ اس کا سوٹ کیس بھی الماری میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند سیکنڈ کے اندر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اکمل یہاں سے چلا گیا ہے۔ اب سب سے پہلا سوال یہی تھا کہ کہاں گیا ہے؟ کیا اسی ہوٹل کے کسی دوسرے کمرے میں شفٹ ہوا ہے یا پھر اس ہوٹل سے ہی چلا گیا ہے اور کہیں یہ تو نہیں کہ وہ واپس ہی چلا گیا ہو۔

میں نے ویٹرز وغیرہ سے ٹوہ لی پتا چلا کہ اکمل صبح سات بجے کے لگ بھگ کچھ سامان کے ساتھ نکلا تھا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تھا۔ میں ریسپشن پر پہنچا کہ شاید وہ وہاں کوئی پیغام چھوڑ گیا ہو لیکن ایسا بھی نہیں تھا۔ میں سٹپٹایا ہوا واپس کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں آ کر میرا دھیان فوراً سفری کاغذات کی طرف گیا۔ ممکن تھا کہ اکمل کا پاسپورٹ وغیرہ یہاں ہو اور اس طرح تسلی ہو جائے کہ وہ واپس نہیں گیا ہے۔ میں نے الماری کا وہ خانہ

کھولا جہاں سفری کاغذات والا بیگ تھا۔ یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ بیگ موجود نہیں ہے۔ میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ بھی اسی چھوٹے سے بیگ میں تھے۔ میں نے ادرگرد دیکھ بیگ کہیں نہیں تھا پھر خیال آیا کہ وہ شاید بیگ میں سے میرے کاغذات نکال کر کہیں رکھ گیا ہو۔

کمرے کا ایک ایک چپہ چھان مارا۔ کاغذات بھی کہیں نہیں تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اکمل میرے کاغذات بھی ساتھ لے گیا ہے۔ اگر وہ میرے کاغذات بھی لے گیا تھا تو پھر امکان یہی تھا کہ وہ بنکاک میں ہی کہیں ہوگا۔ کیونکہ اسے مجھ پر کتنا بھی طیش ہوتا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ میرے کاغذات سمیت تھائی لینڈ سے واپس چلا جاتا۔ میں بے دم سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اکمل سے ایسی غیر متوقع حرکتیں سرزد ہوتی رہتی تھیں لیکن یہ حرکت کچھ زیادہ ہی گمبھیر تھی۔

اچانک مجھے اپنے سینے کی جیب میں کسی کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے جیب ٹٹولی تو ایک چھوٹا سا رقعہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ اکمل کی طرف سے ہی تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''لگتا ہے کہ میں نے تمہیں بیزار کر دیا ہے۔ میری وجہ سے تمہیں بنکاک بھی زہر لگنے لگا ہے، حالانکہ یہاں آنے اور چند دن رہنے کی خواہش تم بھی عرصہ دراز سے کر رہے تھے۔ میری وجہ سے تم اپنی سیر برباد مت کرو۔ اپنے طریقے سے گھومو پھرو۔ اس اندیشے سے کہ تم واپس ہی نہ چلے جاؤ۔ تمہارے کاغذات ساتھ لے جا رہا ہوں۔ چھ یا سات دسمبر کو پھر اسی ہوٹل میں ملیں گے......اکمل!''

میں نے دو مرتبہ رقعہ پڑھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ خبیث نہ صرف مجھے تنہا کر گیا تھا بلکہ آٹھ دس دن کے لیے بنکاک میں قید بھی کر گیا تھا۔ میں نے شام تک اپنے طور پر اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی پھر مایوس ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے رہ رہ کر اس کے رویے پر سخت طیش بھی آ رہا تھا۔ شام کو میں تھکا ہارا ہوٹل کی طرف واپس روانہ ہوگیا۔ عصمت ہوٹل میں چند ٹورسٹ داخل ہو رہے تھے۔ بجلی کے کھمبے کے نیچے گنجا بھائی اپنے مخصوص فقرات کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک اچھے اور ڈھیٹ سیلز مین کی طرح مسکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولتا۔ میں سڑک پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں سگریٹ نہیں پیتا، لیکن جب دل بہت اداس اور پریشان ہوتا ہو تو ایک آدھ کش لگا بھی لیتا ہوں۔ میں نے دو سگریٹ لیے اور دوبارہ سڑک پار کر کے اپنے ہوٹل

والی سائیڈ پر آ گیا۔ کھمبے کے نیچے کھڑا گنجا تھائی اب کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کے اشاروں اور اس کی مسکراتی آنکھوں سے بہت جان جاتی تھی اور یہ بات صرف اس گنجے تھائی تک ہی محدود نہیں تھی۔ بنکاک میں قریباً ہر جگہ ایسے ہی اشاروں اور فقروں کا سامنا ہوتا تھا۔

میں ہوٹل کی لابی میں آ کر خاموش اور مغموم بیٹھ گیا۔ تین چار اور افراد بھی یہاں موجود تھے لیکن سب اپنے اپنے حال میں مگن تھے۔ باہر کے ممالک میں عموماً یہی وطیرہ ہوتا ہے۔ قریب قریب بیٹھے لوگ بھی ایک دوسرے سے ہم کلام ہوئے بغیر اپنے حال میں مگن رہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب کسی نے میرے بالکل قریب آ کر ہیلو کہا تو میں بری طرح چونک گیا۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ میرے سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی جو ہفتے کی شب ڈسکو کلب میں ہماری میز پر آ بیٹھی تھی۔ اس کی سڈول کلائی کا کنگن میری آنکھوں میں چمکا اور میری نگاہ بغور اس کے چہرے پر جم گئی۔ ہاں یہ وہی غیر معمولی ملائم جلد والا چہرہ تھا۔

لڑکی کی شیریں آواز نے مجھے ایک بار پھر چونکایا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔''

''ج......جی بیٹھیے۔'' میں نے تذبذب سے نکل کر کہا۔

وہ بیٹھ گئی۔ اس کا بایاں رخ مکمل روشنی میں تھا۔ وہ حسین و جمیل تو نہیں تھی لیکن خوب شکل تھی۔ اسے دیکھنے والے کو جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی بلکہ چونکا دیتی تھی وہ اس کی جلد اور رنگت تھی۔ نہایت ملائم اور شفاف جلد تھی اس کی۔ اسے چھوئے بغیر ہی دیکھنے والا اس کی بے پناہ نفاست کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی پھر آہستہ سے بولی۔ ''اس دن بھی آپ اداس اور اکیلے اکیلے تھے، آج بھی ہیں۔ بلکہ آج تو آپ کے ساتھ آپ کا دوست بھی نہیں ہے۔''

''وہ کہیں کام سے گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔ ابھی عملے کے ایک شخص نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آپ کو بتائے بغیر اپنا سامان لے کر کہیں اور شفٹ ہوگیا ہے۔''

''اگر ایسا ہے بھی تو آپ سے مطلب؟'' میں نے اپنے اندرونی غصے کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے کسی کا اکیلا پن اور اداسی نہیں دیکھی جاتی۔'' وہ انگریزی میں بولی۔

''آپ شاید اپنے کاروبار کی بات کر رہی ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"چلیے آپ ایسا ہی سمجھ لیں۔" وہ مسکرائی تو اس کے گال میں خوبصورت سا گڑھا پڑا۔
میں نے کہا۔ "آپ یہاں سے جانے کا کیا لیں گی؟"
وہ بولی۔ "آپ یہاں رہنے کی قیمت پوچھتے تو بات بھی تھی۔"
"شکریہ مجھے ضرورت نہیں۔"
"لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو ہے۔ بنکاک میں کوئی اکیلے نہیں گھوم سکتا۔ بلکہ کوئی گھومنے ہی نہیں دیتا۔ قدم قدم پر آپ کا واسطہ ایجنٹوں سے پڑے گا۔ وہ آپ سے پوچھیں گے، جناب آپ کو کسی پارٹنر کی ضرورت ہے۔ آپ جواب دیتے دیتے تھک جائیں گے۔ پھر اور بھی کئی فائدے ہیں، میں آپ کے لیے گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے سکتی ہوں۔ آپ کو بنکاک کے تفریحی مقامات دکھا سکتی ہوں۔ آپ کے ساتھ آپ کے پسندیدہ موضوع پر گفتگو کر کے آپ کو مسلسل خاموشی کی کیفیت سے بچا سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ بھی میرے بہت سے فائدے ہوں گے۔ ان میں سے ایک فائدہ وہ بھی ہے جو آپ کے ذہن میں ہے۔ اگر آپ وہ فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے، یا آپ میں اٹھانے کا حوصلہ نہیں تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔"
"جوان مرد عورت کے درمیان اس قسم کا کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
"یہ غلط ہے...... اور گستاخی معاف...... کم ظرفی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی انگریزی سے عیاں تھا کہ وہ پڑھی لکھی ہے لیکن اب اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ ادبی ذوق بھی رکھتی ہے۔ بنکاک آنے کے بعد میں نے اپنے اردگرد بے شمار پیشہ ور لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن وہ مجھے ان میں سے بالکل مختلف نظر آئی تھی۔ اس کی عمر بھی کم تھی۔ یہی کوئی اٹھارہ انیس برس رہی ہو گی۔ لگتا تھا کہ وہ اس گھناؤنے پیشے میں نئی نئی آئی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ابھی اس کے چہرے اور اس کی آواز کی معصومیت پوری طرح غارت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جسم چھریرا اور بے حد متناسب تھا۔
پتا نہیں کیوں میرے دل میں یہ بات آئی کہ بنکاک میں گھومنے پھرنے کے لیے اس لڑکی کا ساتھ مناسب رہے گا۔ بنکاک ایک انوکھی ہی بستی تھی۔ جس طرح لاہور میں کسی لڑکے کا اپنی گرل فرینڈ کی باہوں میں باہیں ڈال کر گھومنا معیوب نظر آئے گا اسی طرح

بنکاک میں اکیلے گھومنا معیوب لگتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر موڑ پر کوئی چربیلے چہرے والا دلال آپ سے بیوٹی فل گرل کی بات کرتا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔
"سون!" اس نے مختصر جواب دیا۔
میں نے کہا۔ "تم گائیڈ کے فرائض ادا کرنے کی بات کر رہی ہو، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم معاوضہ گائیڈ والا نہیں لو گی۔"
اس نے پوچھا۔ "کیا میرا اور آپ کا ساتھ صرف دن کا ہو گا؟"
"یقیناً۔" میں نے پرزور انداز میں کہا۔
اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے جو بھی آپ دیجئے گا میں لے لوں گی۔"
"مجھے اس بارے میں تھوڑا سا سوچنے دو۔ میں کل تمہیں بتاؤں گا۔"
"او کے اچھے آپ کی مرضی!"
سون کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔ اکمل سے میرا جھگڑا اکمل کی غلط مصروفیات کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ اب اسی قسم کی ایک مصروفیت میں خود بھی اختیار کر رہا تھا۔ امکان یہی تھا کہ اکمل یہاں بنکاک میں ہی موجود ہے، اگر کل کلاں وہ مجھے سون کے ساتھ کسی تفریحی مقام پر گھومتے دیکھ لیتا تو کیا سوچتا...... پھر ایک اور بات بھی ذہن میں آ رہی تھی۔ عورت اور مرد کا مسلسل ساتھ یقیناً خرابی پیدا کرتا ہے۔ اور پھر جب عورت نوجوان و خوبصورت بھی ہو اور مائل بہ کرم بھی ہو۔ کسی بھی جگہ بندے کا پاؤں پھسل سکتا ہے۔ میں خود کو خواہ مخواہ ایک کڑی آزمائش میں کیوں ڈال رہا تھا۔ اس طرح کی اور کئی باتیں ذہن میں آئیں۔ رات کو بستر پر پہنچتے پہنچتے میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل اگر سون آئی تو اسے ٹکا سا جواب دے دوں گا۔
لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اگلے دن وہ نہیں آئی۔ اگر وہ آ جاتی تو شاید یہ کہانی اس طرح نہ ہوتی جس طرح میں اب بیان کر رہا ہوں۔
میں مقررہ وقت پر ہوٹل کی لابی میں بیٹھا رہا اور میگزین اخبار وغیرہ دیکھتا رہا۔ بنکاک کے اخبارات دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں جرائم کی شرح کافی زیادہ ہے۔ روز ہی دو چار افراد کے قتل کی خبر اخبار میں چھپ جاتی تھی۔ اس قسم کے ماحول میں جتنا بھی محتاط رہا جاتا اچھا تھا۔ شام آٹھ بجے تک جب سون نہیں آئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ میں خود کو

ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ شام کے بعد میں سوئی وانگ روڈ پر ٹہلنے نکل گیا۔ اکمل کے بغیر گھومنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن ایک جگہ بیٹھ کر بھی تو یہ آٹھ نو دن نہیں گزارے جا سکتے تھے۔ میں بنکاک کے زیادہ بارونق علاقے میں چلا گیا۔ شہر میں فٹ پاتھوں پر اور فٹ پاتھوں کے کنارے میز کرسیاں لگا کر کھانے پینے کا رواج عام ہے۔ گرد و غبار نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے یوں کھانے پینے میں کوئی ایسا مضائقہ بھی نہیں۔ لوگوں کے ہجوم میں غیر ارادی طور پر میری نگاہیں اکمل کو بھی ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک پر ہجوم جگہ میں نے ایک کباب فروش کو سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھا۔ وہ کوئلوں پر زندہ کیکڑے کو بھوننے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس منظر کی کراہت سے نظر چراتے ہوئے میں آگے بڑھ گیا۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ راستے میں ایک انڈین ریستوران نظر آیا۔ ہندوستانی اور بنگالی کھانے بڑی بڑی پراتوں میں رکھے تھے۔ میں نے چکن پلاؤ قسم کی ایک چیز کھائی۔ چٹ پٹی ڈش تھی اور مسالے بھی بہت زیادہ تھے۔ کوئی خاص مزہ تو نہیں آیا لیکن بھوک لگی ہوئی تھی اس لیے کھا گیا۔ واپس آ کر کمرے میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد نیند کی حالت میں سینے میں جلن محسوس ہوئی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اسی دوران میں دل متلانے لگا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ یہ فوڈ پوائزننگ کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد قے شروع ہو گئی۔ میرے بیگ میں چند دوائیں موجود تھیں۔ بسکو پین کے علاوہ میں نے پولی کرول وغیرہ لی۔ درد میں کچھ افاقہ ہوا لیکن یہ وقتی تھا۔

دن چڑھنے تک مجھے سات آٹھ مرتبہ قے ہو چکی تھی۔ منہ بالکل خشک ہو گیا تھا اور بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ میں کسی کلینک میں ہوتا جہاں مناسب ٹریٹمنٹ مل سکتی۔ لیکن کلینک تک پہنچنے کے لیے کوئی سواری نہیں تھی اور نہ میں یہ جانتا تھا کہ کون سا کلینک مناسب رہے گا، پردیس میں بیمار پڑنے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا بلکہ پردیسی ہونے کا بھی پہلا ہی تجربہ تھا۔ میں نے سوچا روم سروس والوں کے ذریعے عصمت ہوٹل کے نوید سے رابطہ کرتا ہوں پھر یاد آیا کہ نوید نے تو آج صبح سویرے اپنی وائف کے ساتھ بنکاک کے مضافات میں کسی کام سے جانا تھا۔ یقیناً وہ اب تک جا چکا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں لیٹا تھا کہ اچانک دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ ویٹر ہو گا۔ ''آ جاؤ'' میں نے نحیف آواز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً مجھے اپنے قریب پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سون میرے

سرہانے کھڑی تھی۔ اس نے نیلی پتلون پہن رکھی تھی اوپر سفید رنگ کی ہاف سلیو شرٹ تھی۔ بال بڑے سلیقے سے پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ میری کیفیت دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت آمیز پریشانی نظر آنے لگی تھی۔ ''اوہ گاڈ! کیا ہوا تمہیں؟'' وہ مجھ پر جھکتے ہوئے بولی۔

''رات کو ایک انڈین ہوٹل سے کھانا کھایا تھا۔ لگتا ہے کہ فوڈ پوائزننگ ہو گئی ہے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''اگر یہاں سے گریوی نیٹ کے انجکشن اور گلوکوز کا بیگ مل جائے تو میرا خیال ہے کہ میری طبیعت بحال ہو سکتی ہے۔''

''لیکن کیوں نہ ڈاکٹر کے پاس چلا جائے۔'' اس نے رائے دی۔

''میں خود بھی ڈاکٹر ہوں۔'' میں نے انکشاف کیا وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

''پھر...... پھر تو ٹھیک ہے۔ جو دوائیں چاہئیں کاغذ پر لکھ دو، میں لے آتی ہوں۔''

میں نے دوائیں لکھ دیں۔ ایک دو متبادل نام بھی لکھ دیے۔ پرچی اور رقم اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ روم سروس والوں سے کہہ کر یہ منگوا دو۔''

''چپ رہو۔'' وہ پیار سے ڈانٹ کر بولی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

پندرہ بیس منٹ بعد وہ واپس آئی تو ایک لفافے میں مطلوبہ دوائیں موجود تھیں۔ اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب سون نے بڑی چابکدستی سے مجھے ڈرپ لگانا شروع کر دی۔ میری حیرت بھانپ کر وہ بولی۔ ''میں نے نرسنگ کا کورس بھی کیا ہوا ہے۔ میری بدقسمتی کہ اس طرف نہ جا سکی۔''

پانچ دس منٹ کے اندر اس نے نہ صرف بڑی چابکدستی سے مجھے ڈرپ لگا دی، بلکہ گریوی نیٹ وغیرہ کے انجکشن بھی دے دیے۔ مجھے ایک بار قے ہوئی اس نے ایک شاپر پہلے ہی تیار رکھا ہوا تھا۔ مجھے اٹھ کر باتھ روم جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ سارا دن بڑی مہارت سے میری دیکھ بھال میں لگی رہی۔ شام تک میری طبیعت نوے فیصد ٹھیک ہو چکی تھی۔ مجھے سون میں ایک ہمدرد لڑکی نظر آئی تھی۔ اس کا یہ روپ اس کے گھناؤنے پیشے سے بالکل الگ تھا۔

شام کو جب وہ جانے لگی تو بولی۔ ''تم کل کا دن مکمل آرام کرو۔ میرا خیال ہے کہ

پرسوں تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ ہم بنکاک میں گھوم پھر سکیں۔ ویسے کل میں کسی وقت چکر لگاؤں گی۔ یہ میرا فون نمبر بھی ہے اگر تمہیں کسی طرح کی ضرورت ہو تو کال کر سکتے ہو۔''

اس نے جیسے خود سے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ آنے والے دنوں میں گائیڈ کے فرائض انجام دینے کے لیے میرے ساتھ رہے گی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے دن میں نے آرام کیا اور شام تک بالکل چوکس ہو گیا۔ سون خود تو نہیں آئی تاہم اس نے دو بار مجھے فون کیا اور حال چال پوچھا۔ ایک مرتبہ وہ غالباً کسی کلب سے بول رہی تھی کیونکہ بیک گراؤنڈ میں ہیجان خیز موسیقی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دونوں مرتبہ جب اس نے فون کیا میرے ہونٹوں پر یہ بات آتے آتے رہ گئی کہ وہ کل آنے کی زحمت نہ کرے۔ پتا نہیں کیوں یہ بات میں اس سے کہہ نہ سکا۔

اگلے روز وہ دس بجے کے قریب آ گئی۔ ''ہاں جی بتاؤ۔ کیا ارادے ہیں؟'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

''کیا مطلب؟''

''کہاں جانا ہے آج؟''

میں نے کچھ دیر تذبذب کے بعد کہا۔ ''اگر آج میں اکیلا جانا چاہوں تو؟''

وہ بولی۔ ''تم اپنی مرضی کے مالک ہو لیکن میں تمہیں اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گی۔ اجنبی شہر میں ایک ساتھی کا ہونا بہت ٹھیک رہتا ہے۔ اب یہی کھانے کی مثال لے لو۔ اگر میں تمہارے ساتھ ہوتی تو تمہیں اس انڈین ریسٹوران سے ہرگز کھانا نہ کھانے دیتی۔ وہ باسی کھانے سرو کرنے کے سلسلے میں کافی بدنام ہے۔ اس ریسٹوران کے بالکل سامنے ایک سری لنکن ہوٹل ہے جہاں بہترین قسم کی بریانی دستیاب ہوتی ہے۔''

وہ شاید کچھ اور بھی بولنا چاہتی تھی لیکن میں نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ فلوٹنگ مارکیٹ کدھر ہے؟''

اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔

''فلوٹنگ مارکیٹ ہم اس وقت نہیں جا سکتے۔ فلوٹنگ مارکیٹ جانا ہے تو پھر اچھے بچوں کی طرح صبح سویرے اٹھنا ہو گا۔ ہمیں آٹھ بجے تک مارکیٹ میں ہونا چاہیے۔ تب ہی وہاں کی رونق کا بھرپور نظارہ کر سکیں گے۔''

''تو پھر؟''

''چلو آج پٹایا بیچ پر چلتے ہیں۔''

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم بذریعہ ٹیکسی پٹایا بیچ کی طرف جا رہے تھے۔

پٹایا بیچ بنکاک کا قابل دید تفریحی مقام ہے۔ ہم قریباً پانچ میل تک سمندر کے ساتھ ساتھ گئے۔ یہ سارا فاصلہ ہم نے ساحل کے متوازی چلنے والی ایک شفاف سڑک پر طے کیا۔ یہاں ساحل کے ساتھ ساتھ بے شمار کیبن اور ہٹ وغیرہ نظر آئے۔ درحقیقت یہ وہ سیکڑوں عیش گاہیں تھیں جو ساحل پر آنے والے رومانی جوڑوں کو گوشۂ تنہائی فراہم کرتی تھیں۔ یہاں چھوٹے بڑے ریسٹوران اور اسنیک بار بھی تھے۔

دوپہر کا ایک بج گیا تھا، ہم نے ایک ریسٹوران کی دوسری منزل پر کھانا کھایا۔ بالکونی سے سمندر دور تک نظر آتا تھا۔ کھانا اچھا تھا اور زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ سون نے اپنی افادیت ثابت کر دی تھی۔ بالکونی میں بیٹھ کر سون نے اپنی پونی ٹیل کھول دی اس کے نرم ریشمی بال ساحلی ہوا میں لہرانے لگے۔ وہ دور تک پھیلے ساحلی کیبنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہاں کی اصل رونق شام کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ آسمان سے تارے زمین پر اتر آئے ہیں۔''

''تارے نہیں انگارے کہو۔''

''کیا مطلب؟''

''جو کچھ ان کیبنوں میں ہوتا ہے وہ انسان کو اندر سے بھسم کر دیتا ہے۔''

''میں تمہارے ذاتی خیالات کی قدر کرتی ہوں لیکن اس معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی تو ہے۔ ذرا سوچو مسٹر شاداب! زندگی کتنی مختصر ہے۔ جوانی اور ترنگ کا دور اس سے بھی مختصر ہے۔ مشکل سے دس پندرہ سال۔ یہ وقت بھی انسان تنہا اور اداس گزار دے تو پھر زندگی کا فائدہ کیا۔''

''زندگی سے فائدہ حاصل کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہر لمحہ موج اور مستی میں گزارو۔ کھاؤ پیو عیش کرو۔ غموں اور پریشانیوں کو دھتکار کر خود سے دور پھینک دو۔''

''تمہارا کیا خیال ہے غموں کو دھتکار کر خود سے دور پھینک دینے سے وہ دور ہو جاتے ہیں؟ اور خوشیوں کو گلے لگا لینے سے وہ گلے لگ جاتی ہیں؟''

''بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے تم نے یہ بدنام پیشہ اپنایا ہو گا لیکن اب یوں لگ رہا ہے کہ تم نے بہ رضا و رغبت اس طرف رجوع کیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تم اس کو نہ ہی چھیڑو تو بہتر ہے۔ بہر حال میں اتنا ضرور کہوں گی کہ میں خوش ہوں۔ زندگی کو انجوائے کر رہی ہوں۔ غم اور پریشانی مجھ سے دور بھاگ چکے ہیں۔''

''کیا تمہارا خیال ہے کہ یہ تم سے دور ہی بھاگے رہیں گے۔ نہیں سون! ایسا نہیں ہو گا۔ جس طرح دن اور رات کا ساتھ ہے اسی طرح غم اور خوشی کا ساتھ ہے۔ تم خود کو خوشیوں کے نرغے میں محسوس کر رہی ہو لیکن بہت دیر تک ایسا ہو نہیں سکتا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بڑی رغبت سے یہ سامنے پلیٹ میں رکھے ہوئے چکن سینڈوچ کھائے اور کھاتا چلا جائے...... اور کھاتا چلا جائے۔ نہ اس کی بھوک کم ہو نہ اس کی لذت میں فرق آئے؟''

''نہیں ایسا تو ہو نہیں سکتا۔'' وہ بولی۔

''تو پھر سمجھ لو کہ مسلسل خوشی کا وجود بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔ خوشی کا تسلسل دکھ کی آمد نے توڑنا ہوتا ہے۔ اسی طرح دکھ کا تسلسل بھی غم کی آمد توڑ کر رہتی ہے۔ بات یہ نہیں کہ ہم خوشی کی زندگی گزار رہے ہیں یا غم کی، بات یہ ہے کہ ہم کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ تم زندگی کی پلیٹ سے خوشی کے سینڈوچ کھاتی چلی جا رہی ہو۔ لیکن بہت جلد یہ سینڈوچ تمہیں بے مزہ محسوس ہونے لگیں گے پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب ان سینڈوچز کا کھانا تمہارے لیے ''منفی افادہ'' بن جائے گا۔ تمہیں ابکائی آنے لگے گی۔''

وہ ریت پر اٹھکیلیاں کرتے ایک یورپین جوڑے پر نظریں گاڑ کر بولی۔ ''تمہارا فلسفہ بڑا گاڑھا ہے۔ میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ اگر اجازت ہو تو بیئر کی ایک ٹھنڈی بوتل منگوا لوں؟''

میں نے کہا۔ ''جب تک تم میرے ساتھ ہو تمہیں پینے پلانے سے اجتناب کرنا ہو گا۔''

''اوکے...... اوکے......'' اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اس کی کلائی کا کنگن سہ پہر کی روشنی میں چمک گیا۔

''آؤ ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چلتے ہیں۔'' وہ بولی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دلال ریستوران کی سیڑھیوں کے قریب موجود تھا۔ دوسرا سامنے ایک کیبن کے پاس ٹہل رہا تھا، بہر حال مجھے ان کی زہریلی سرگوشیوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سون میرے ساتھ تھی۔

اس نے اپنی نیلی پتلون کے پائنچے اڑس لیے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں اس کے ساتھ گیلی ریت پر چلنے لگا۔ میں نے گفتگو کا رخ تھائی لینڈ کی سیاست کی طرف موڑ دیا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق وہ اس موضوع پر بھی دسترس رکھتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آج کل تھائی لینڈ میں مارشل لا ہے۔ اس نے سیاست دانوں کی وہ نالائقیاں بھی گنوائیں جن کی وجہ سے مارشل لا مستحکم ہوا۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے ملک کے سیاست دانوں کی بات کر رہی ہے۔

سورج ہمارے بائیں رخ پر تھا۔ سورج کی چمک نے سون کی نہایت خوبصورت جلد کو کچھ اور بھی نکھار دیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ قریب سے گزرتے ہوئے جوڑے اور اکا دکا لوگ سون کو غور سے دیکھے بغیر نہیں رہتے۔ وہ درمیانے خدوخال کی مالک تھی یہ اس کی سرخی آمیز رنگت کا حسن ہی تھا جو دیکھنے والوں کو چونکاتا تھا۔ اس کی Look میں شیشے کی سی چمک تھی۔ ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ وہ ایک اچھے گائیڈ کی طرح مجھے مختلف معلومات فراہم کرتی رہی۔ ہم نے کٹا ہوا اناس کھایا اور ایک جگہ سے آئس کریم کے کپ لیے۔ جیب پر کوئی خاص بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ پاکستانی کرنسی اور تھائی کرنسی میں بس انیس بیس کا فرق ہی تھا۔ جوں جوں شام کے سائے ڈھلتے گئے ساحل کی رونق بڑھتی گئی۔ مختصر لباس میں سفید فام حسینائیں یہاں وہاں بے ترتیب پڑی تھیں ایک بہت موٹی عورت رنگین چھتری کے نیچے بیٹھی سوموپہلوان دکھائی دیتی تھی۔ اس کا ساتھی بھی کافی موٹا تھا۔ دونوں کی چمڑی بہت سفید تھی۔ ان کو سفید ہاتھیوں کی جوڑی کا لقب با آسانی دیا جا سکتا تھا۔ اکثر ساحلوں پر بچے بھی نظر آتے ہیں لیکن یہاں شاذ و نادر ہی کوئی بچہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جگہ عیش و عشرت کا اڈا تھی۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ آتے تھے جن کے ہاتھوں میں کسی حسینہ کا ہاتھ ہوتا تھا یا انہیں ایسا ہاتھ درکار ہوتا تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی پتایا بیچ اپنے اصلی روپ میں آ گئی۔ لب سمندر مے کے جام گردش کرنے لگے۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو ہوا میں چکرانے لگی اور زندہ نسوانی گوشت جگہ جگہ اپنی بہار دکھانے لگا۔

''چلو سون اب چلیں۔'' میں نے اپنی اندرونی بیزاری کو چھپاتے ہوئے کہا۔
''بھئی اتنی جلدی! ابھی تو رونق میلہ شروع ہوا ہے۔''
''دیکھو تم ایک گائیڈ ہو...... گائیڈ کا کام جلدی ختم ہو جائے تو اسے خوش ہونا چاہیے۔''
''مگر یہ بھی تو گائیڈ کا فرض ہے کہ سیاح کو کسی مقام کی اصل خوبصورتی سے محروم نہ رکھے۔''
''تمہارے لیے خوبصورتی کا پیمانہ اور ہے میرے لیے اور۔'' میں نے مختصر جواب دیا اور واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارد گرد نظر آنے والے مناظر اخلاق سوز تھے۔ میں نے کافی بڑی عمر کے لوگوں کو نہایت کم عمر لڑکیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے پایا۔ اکثر لوگوں کے چہرے شراب کے نشے سے تمتما رہے تھے۔ ساحل کے قدرتی حسن کو حضرت انسان کی ہوس پرستی نے تاراج کر رکھا تھا۔
نو بجے کے لگ بھگ ہم ہوٹل واپس پہنچ گئے۔
اگلے روز حسب پروگرام سون صبح سویرے آ گئی۔ ہمیں فلوٹنگ مارکیٹ جانا تھا۔ کل سون بڑی چست چتلون پہن کر آئی تھی۔ اس کے بازو بھی کندھوں تک عریاں تھے۔ آج وہ میرے کہنے پر معقول لباس میں تھی۔ یہ ایک گاؤن سا تھا۔ گاؤن کا گریبان کافی کشادہ تھا پھر بھی کل والے لباس سے تو یہ پہناوا ہزار درجے بہتر تھا۔ ''آج تم ایک معقول انسان نظر آ رہی ہو۔''
''میرا خیال ہے کہ آج میں ایک مجبور انسان نظر آ رہی ہوں۔ اگر میں مجبور نہ ہوتی تو اس لباس میں نہ ہوتی بلکہ اس لباس میں ہوتی۔'' اس نے اپنا گاؤن آگے سے کھول کر دکھا دیا۔
میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ گاؤن کے نیچے جو چست لباس پہنے ہوئے تھی وہ کل سے بھی زیادہ بیہودہ تھا۔ جین کی پتلون تھی جو جسم کے ساتھ ہی سلی ہوئی تھی۔ ایک نہایت ہی ہلکی پھلکی شرٹ تھی جو اس کے سرکش جسم کو چھپانے میں قطعی ناکام تھی۔
اس نے جلدی سے گاؤن برابر کر لیا اور آئینے میں اپنے بال درست کرنے لگی۔
''یہ کیا ڈراما ہے؟'' میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔
''ڈراما نہیں...... جلد بازی ہے۔ دراصل میں اپنی عادت کے مطابق کپڑے پہن کر نکل آئی تھی۔ ایک دم یاد آیا کہ تم نے ڈھیلے کپڑے پہننے کو کہا تھا۔ یہ گاؤن پڑا تھا۔ فٹافٹ

اوڑھ کر نکل آئی۔''
میں ایک تلخ سا گھونٹ بھر کر رہ گیا۔
دراصل فلوٹنگ مارکیٹ، مگرمچھوں کے فارم اور سانپوں کے فارم کا ٹور ایک ہی بار موٹر بوٹ کے ذریعے لگایا جاتا ہے۔ موٹر بوٹ تک پہنچنے کے لیے ہم نے ایک ٹیکسی ہائر کی۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک چوڑا چکلا شخص تھا۔ جسم کی طرح اس کا منہ بھی بہت چوڑا تھا۔ وہ مجھے کوئی اچھا شخص نہیں لگا۔ بظاہر وہ خوش اخلاقی سے ہی بات کر رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد ہم دریا پر پہنچے۔ موٹر بوٹ والے سے بات کی۔ اس نے مکمل ٹور کے سات سو بھات مانگے۔ سون بولی۔ ''یہ لوگ سیاحوں سے زیادہ کرایہ وصول کرتے ہیں۔ مقامی لوگ ہوں تو انہیں چار سو بھات میں بھی لے جاتے ہیں۔''
سون نے موٹر بوٹ والے سے تکرار کی اور چھ سو بھات میں معاملہ طے ہو گیا۔ موٹر بوٹ والے نے ہمیں کروکوڈائل فارم، ٹمپل پیلس اور اسنیک فارم بھی دکھانا تھا۔ یہ مکمل ٹور تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کا تھا۔
موٹر بوٹ کافی لمبی اور بڑی تھی۔ ٹیکسی کا ڈرائیور ہمارے ساتھ مفت میں سوار ہو گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ سون نہ صرف اس ٹیکسی ڈرائیور کو جانتی ہے بلکہ اس سے کچھ خوف زدہ بھی ہے۔ بہر حال اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ سب سے پہلے ہم فلوٹنگ مارکیٹ یعنی تیرتے ہوئے بازار پہنچے۔ یہ منظر دیدنی تھا۔ پانی پر بے شمار دکانیں تیر رہی تھیں۔ دراصل یہ چھوٹی بڑی کشتیاں تھیں جنہیں دکانوں کی طرح سجایا گیا تھا۔ کئی کشتیوں کے اوپر خوبصورت سائبان تھے۔ ان کشتیوں پر گارمنٹس اور جوتوں سے لے کر گوشت اور سبزی تک ہر قسم کا سامان موجود تھا۔
''ٹورسٹ ! ناریل پانی پیو گے؟'' سون نے دھیمے انداز میں پوچھا۔
''ہاں اگر تازہ ہو تو۔''
''اس سے زیادہ تازہ کیا ہو گا کہ تم ناریل کے اندر ہی پیو گے۔''
دس بھات میں ایک ناریل ملا۔ ناریل کے گرد ہری ہری چھال بھی موجود تھی۔ دکان والے نے ناریل کو ایک بڑے چھرے سے چھیل کر اس کے اندر اسٹرا ڈالا۔ جس طرح کولڈ ڈرنک پیتے ہیں اسی طرح میں نے ناریل کا پانی پیا۔
''ٹورسٹ ! اکیلے کھاؤ گے؟'' وہ آہستہ سے بولی۔ میں نے اس بار بھی اثبات میں

جواب دیا۔

ایک کشتی جو کہ فروٹ کی تیرتی ہوئی دکان تھی ہمارے قریب آ گئی۔ دس بھات کے ایک درجن کیلے ملے۔ کیلوں کا چھلکا انتہائی باریک تھا اور ذائقہ بھی اچھا تھا۔ ہم سب نے کیلے کھائے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور کی نگاہیں بار بار غیر ارادی طور پر سون کو گھورنے لگتی تھیں۔ میں نے سرگوشی کے انداز میں سون سے پوچھا۔ ''کیا تم اس ٹیکسی ڈرائیور کو جانتی ہو؟''

اس نے صاف انکار کر دیا۔ بہر حال اس کے انکار نے مجھے زیادہ متاثر نہیں کیا۔

فلوٹنگ مارکیٹ میں چند منٹ رکنے کے بعد اور کچھ اشیاء خرید کر ہم آگے روانہ ہو گئے۔ موٹر بوٹ بڑی تیزی سے دریا کے پانی میں فراٹے بھرنے لگی۔ کچھ آگے جا کر ہمیں ٹمپل پیلس نظر آیا۔ اس کے کلس سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان سارے کلسوں اور گنبدوں پر طلائی خول چڑھا ہوا تھا۔ بنکاک کے ارد گرد ہم نے بدھا کے جتنے بھی مندر دیکھے وہ نہایت اچھی حالت میں تھے اور خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ ان کے سونے کے خول میں چھپے ہوئے کلس دور ہی سے دمکتے دکھائی دیتے تھے۔

''کبھی کسی عبادت گاہ میں بھی جانا ہوا؟'' میں نے سون سے پوچھا۔

''میں جس دنیا میں رہتی ہوں وہ عبادت گاہوں سے بہت دور ہے۔ وہ ٹھوس حقیقتوں کی دنیا ہے مسٹر ٹورسٹ! وہاں جو کچھ بھی ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چھوا جا سکتا ہے موسیقی کی گونج، چکن کی لذت، شراب کے ''جام کا لمس'' اپنے پارٹنر کا بدن سب کچھ ٹھوس حقیقتوں میں سے ہے۔''

''لیکن حقیقتیں بہت جلد اپنا ذائقہ بدل لیتی ہیں۔ خوشی کے سینڈوچ تا دیر کام و دہن کو لذت فراہم نہیں کر سکتے۔ انہیں کھاتے چلے جاؤ تو بہت جلد ابکائی آنے لگتی ہے۔''

کروکوڈائل فارم کی طرف جاتے ہوئے تھوڑی سی غلط فہمی بھی ہو گئی۔ میں اور ٹیکسی ڈرائیور باتیں کر رہے تھے۔ تھائی ٹیکسی ڈرائیور کا نام چنکی تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے، وہ اپنے نام کے برعکس کافی بھاری بھر کم شخص تھا۔ خاص طور سے اس کا چہرہ چوڑا چکلا تھا۔ باتوں باتوں میں ٹیکسی کے کرایے کا ذکر آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کے ساتھ میرے ڈیڑھ سو بھات طے ہوئے تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''نہیں ڈھائی سو بھات تھے۔''

اسی بات پر ہم دونوں میں تکرار ہو گئی۔ مجھے اس کی شکل ویسے بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں ذرا تلخی سے بولا تو وہ ایک دم سرخ انگارا ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر جھپٹ پڑے گا اور چلتی بوٹ کے اندر دھینگا مشتی شروع ہو جائے گی۔ اس موقع پر سون آڑے آئی اور اس نے شستہ انگلش میں مجھے بتایا کہ ٹیکسی ڈرائیور ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے اپنی طرف سے اڑھائی سو ہی طے کیا تھا۔ غالباً زبان کے مسئلے کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہو گئی تھی۔ بہر حال ڈرائیور چنکی کی شعلہ مزاجی مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔ ایسے لوگ عقل سے زیادہ اپنے مسل اور پٹھوں وغیرہ سے سوچتے ہیں اور اکثر خطا کھاتے ہیں۔

اس واقعے کے بعد میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے بات نہیں کی۔ اس نے بھی اس چپ کو توڑنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ خاصا بد دماغ قسم کا شخص تھا۔ نجانے کیوں بار بار مجھے لگ رہا تھا کہ سون اس شخص کو جانتے ہوئے بھی اجنبی بن رہی ہے۔ کوئی ہو گا اس کا مسئلہ! میں نے سوچا اور دھیان ارد گرد کے ماحول میں بانٹنے کی کوشش کی۔ ماحول واقعی زبردست تھا۔ ایک دو جگہ پانی کے اندر ہی بستیاں آباد نظر آئیں۔ یہ لکڑی کے مکانات پانی کے اندر ہی ستونوں پر کھڑے کیے جاتے ہیں۔ ہر مکان کے آگے لکڑی ہی کا پلیٹ فارم بھی نظر آتا تھا۔ یہ پلیٹ فارم صحن یا برآمدے کا کام دیتا تھا۔ یہاں سے پانی میں یا کشتی پر اترنے کے لیے کہیں کہیں زینے بھی بنائے گئے تھے۔ دو رویہ مکانوں کے درمیان پختہ گلیوں کی جگہ پانی کی گلیاں تھیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور ڈونگے حرکت کرتے نظر آتے تھے۔ یہاں بسنے والے لوگوں کا تعلق غریب طبقے سے تھا۔ ان کے میلے کچیلے بچے گھروں کے تھڑوں پر کھیلتے نظر آتے تھے۔ عورتیں گھریلو کام کاج میں مصروف تھیں۔

میں نے ایک جواں سال عورت کو دیکھا۔ وہ دھلے ہوئے کپڑے الگنی پر پھیلا رہی تھی۔ اس کا ایک سالہ بچہ گھر کے بالکل کنارے پر کھیل رہا تھا۔ وہ وہاں سے گرتا تو سیدھا گہرے پانی میں جاتا۔ میں نے سون سے پوچھا۔ ''چھوٹے بچوں کے پانی میں گرنے کے واقعات تو نہیں ہوتے؟''

وہ بولی۔ ''حادثہ تو کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ بچہ گلی میں نکلے تو رکشا اسے روندتا ہوا گزر جاتا ہے۔ باقی پانی کے درمیان رہنے والے لوگ زبردست قسم کے تیراک بھی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بچہ بھی جسے تم دیکھ رہے ہو تیراکی کر سکتا ہو۔''

''لیکن پھر بھی ان بچوں کی زندگی محدود تو ہوتی ہو گی نا۔ بچے گلیوں میں فٹ بال،

کرکٹ، آنکھ مچولی اور پتا نہیں کیا کچھ کھیلتے ہیں۔"

"تفریح تو ان بچوں کو بھی مل ہی جاتی ہے۔ ایک طریقے سے نہ سہی دوسرے سے سہی۔ ان کے کھیل اور طرح کے ہیں۔"

اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم کروکوڈائل فارم پہنچ گئے۔ اسنیک فارم بھی اسی فارم کا ایک حصہ ہے۔ یہاں سو بھات کا ٹکٹ تھا۔ میں نے اپنا اور سون کا ٹکٹ لیا۔ ہم دونوں اندر چلے گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنی غصیلی نگاہوں کے ساتھ بوٹ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ کروکوڈائل فارم میں آ کر سون ایک بار پھر چہکنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ڈرائیور چنگی کی موجودگی میں وہ بھی خود کو ایزی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ شاید ڈرائیور چنگی کے ڈر سے ہی سون نے ہمارے جھگڑے میں مداخلت کی تھی اور یہ کہہ کر جھگڑا ٹال دیا تھا کہ ہمارا کرایہ اڑھائی سو بھات ہی طے ہوا تھا۔ بہر حال میں نے اس حوالے سے سون سے کوئی بات نہیں کی۔

کروکوڈائل فارم کو دیکھ کر یوں لگا جیسے دنیا بھر کے مگرمچھ یہاں بنکاک میں ہی جمع ہو گئے ہیں۔ مختلف نسلوں اور رنگوں کے بے شمار مگرمچھ یہاں موجود تھے۔ کچھ کے جبڑے غیر معمولی حد تک چوڑے تھے، کچھ کی تھوتھنیاں ڈولفن مچھلی کی طرح لمبی تھیں۔ کچھ اتنے جسیم تھے کہ لگتا تھا ابھی حفاظتی جنگلا توڑ کر باہر نکل آئیں گے۔ یہاں مگرمچھوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی نظر آئے۔ ان بچوں کا موازنہ ان کے ماں باپ کے جسموں سے کیا جائے تو وہ خاصے مختصر محسوس ہوتے ہیں۔

کروکوڈائل فارم میں ایک شو بھی دکھایا جاتا ہے۔ ایک دبلے پتلے تھائی نے پانی میں گھس کر ایک مگرمچھ سے کشتی کی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ جس سے وہ گاہے گاہے مگرمچھ کو ڈراتا بھی تھا۔ اس کھیل کا کلائمکس یہ تھا کہ اس فاقہ زدہ تھائی نے اپنا سر مگرمچھ کے کھلے ہوئے جبڑے میں رکھ دیا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کر داد دی۔ یہ سراسر نورا کشتی تھی۔ تالاب کے مگرمچھ کا وہی حال تھا جو ایرانی سرکس کے شیر کا ہوتا ہے۔

اسی دوران ایک فیملی ہمارے قریب سے گزری۔ جواں سال جوڑا تھا۔ ساتھ میں قریباً ایک سال کا گورا چٹا بچہ تھا۔ وہ لوگ سون کو جانتے تھے۔ جواں سال تھائی عورت گرمجوشی سے سون کے گلے ملی۔ اس کے مرد ساتھی نے بھی گرم جوشی سے رسمی کلمات ادا کیے۔ سون نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ دائیں بائیں سے اس کا منہ چوما۔ بچہ معصومانہ انداز میں سون

کے نہایت شفاف رخساروں پر انگلیاں دوڑانے لگا۔ وہ لوگ سون سے تھائی میں باتیں کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں بھلا کیا آتا تھا۔ باتوں کے دوران میں ہی سون نے انگلش میں میرا مختصر سا تعارف کرا دیا تھا اور ان لوگوں کو بتایا تھا کہ میں اس کا دوست ہوں۔ تھائی نوجوان کسرتی جسم کا مالک تھا اور کسی گیم کا کھلاڑی نظر آتا تھا۔ جتنی دیر وہ لوگ باتیں کرتے رہے سون کی گود میں چڑھا ہوا بچہ سون کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتا رہا اور معصومانہ انداز میں اس کے گالوں پر انگلیاں چبھوتا رہا۔ اس کی جلد ایسی ہی تھی کہ اسے خوانخواہ چھو کر دیکھنے کو دل کرتا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ میرے ساتھ بوٹ میں بیٹھی ہوئی تھی تو مجھ سے اس کا درمیانی فاصلہ بمشکل دو فٹ تھا۔ دو تین بار مجھے بالکل ایسے لگا کہ سورج کی روشنی سون کے رخساروں میں سے منعکس ہوئی ہے۔ جیسے شیشے کی سطح سے منعکس ہوتی ہے۔ بے اختیار دل چاہا کہ اس کے رخساروں کو چھو کر دیکھوں۔ اس میں کسی طرح کے روحانی جذبے کو دخل نہیں تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کسی نہایت خوبصورت چیز کو دیکھ کر چھونے کو دل چاہتا ہے۔ اس چھوٹے سے بچے نے بھی تو ایسے ہی کیا تھا۔ وہ خالی خالی ذہن کے ساتھ اپنی انگلیاں سون کے رخساروں پر پھیرتا چلا جا رہا تھا۔

دس منٹ کی گپ شپ کے بعد تھائی فیملی سون سے رخصت ہو کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے اس بارے میں سون سے کچھ پوچھا نہ ہی اس نے بتایا۔ کروکوڈائل فارم کے بعد ہم نے اسنیک فارم دیکھا پھر واپسی کے لیے ہم فارم سے باہر آ گئے۔ فارم میں ہم نے اتنے زیادہ مگرمچھ دیکھے تھے کہ باہر آ کر بھی یہی لگ رہا تھا کہ ہر درخت اور دیوار کے پیچھے کوئی نہ کوئی مگرمچھ موجود ہے۔ ذہن میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اگر کسی وجہ سے یہ سارے ہولناک مگرمچھ ایک ساتھ ہی مشتعل ہو جائیں اور اس فارم کی حدود کو تہس نہس کر کے باہر نکل آئیں تو یہاں گھومنے پھرنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔

ہم واپس اپنی موٹر بوٹ کی طرف آئے تو وہاں کچھ ہلچل سی دکھائی دی۔ دو تین افراد بہت زور و شور سے بول رہے تھے۔ شاید کوئی جھگڑا ہو گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنا ٹیکسی ڈرائیور چنگی نظر آیا۔ وہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس کے منہ سے گالیاں فوارے کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔۔ وہ بیئر اور کولڈ ڈرنکس کی خالی بوتلیں اٹھا اٹھا کر کچھ افراد کو مار رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ افراد ایک گلی کے موڑ پر اوجھل ہو گئے۔ چنگی ان کا تعاقب کرنا چاہ رہا تھا مگر کچھ لوگوں نے اسے روک لیا اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ چنگی کا ہاتھ

بار بار اپنی پتلون کی طرف جا رہا تھا۔ یقیناً اس کے پاس کوئی چاقو یا چھوٹے سائز کا ریوالور وغیرہ تھا جسے وہ نکالنا چاہتا تھا۔

ایک شخص نے ہمیں بتایا کہ چند ایرانیوں سے چنکی کی لڑائی ہو گئی ہے۔ لڑائی کیوں ہوئی تھی کس وجہ سے ہوئی تھی ہمیں کچھ پتا نہیں چلا۔ میں نے کن انکھیوں سے سون کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم اتر گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ آثار سے نظر آ رہا تھا کہ چنکی نے ایرانیوں سے جو لڑائی جھگڑا شروع کر رکھا ہے وہ اتنی جلدی ختم ہونے والا نہیں۔ غالباً چنکی کے ایک دو ساتھی بھی اس جھگڑے میں شریک تھے۔ میں نے چنکی کے ایک ساتھی کے سر سے خون بہتے دیکھا۔

میں نے موٹر بوٹ والے سے کہا۔ ''اب کیا کرنا ہے بھائی؟''

اس نے سون کے ذریعے مجھے جواب دیا۔ ''اب ہم چلتے ہیں۔ یہاں ہمارا رکنا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ فائرنگ وغیرہ ہو جائے۔'' وہ ہمیں بوٹ میں بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

میں نے سون سے کہا۔ ''لیکن چنکی کے کرایے کا کیا ہو گا۔''

وہ بولی۔ ''اسے ہوٹل میں تمہارے کمرے کا نمبر معلوم ہے، وہاں سے آ کر لے جائے گا۔''

''لیکن اب ہمیں فالتو کرایہ دینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ فالتو کرایہ تم اس کے کرایے سے کاٹ لینا۔''

میں نے سوچا یہ سر پھرا شخص ہے، ہوٹل میں آ کر خواہ مخواہ جھگڑا نہ کرنے لگے۔ بہر حال ہم بوٹ میں بیٹھے اور کروکوڈائل فارم سے واپس روانہ ہو گئے۔ بوٹ نے یوٹرن لیا اور ہمارا رخ پھر سے بنکاک کی طرف ہو گیا۔ چلتے چلتے میں نے بوٹ والے سے اس چنکی نامی ڈرائیور کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی۔ انہوں نے بس یہی بتایا کہ چنکی ایک ہتھ چھٹ شخص ہے۔ جب ذرا نشے میں ہو تو ایک دم دنگے فساد پر اتر آتا ہے۔

ہماری باتوں کے دوران ہی ایک دم موٹر بوٹ کو زور سے جھٹکا لگا اور وہ بڑی تیزی سے ایک طرف کو مڑی۔ سون میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ بیلنس خراب ہونے سے وہ میرے اوپر ہی آن گری۔ اس کا نرم و گداز بدن میں نے چند لمحوں کے لیے اپنے بالکل قریب محسوس کیا میرے بدن میں سرد جھرجھری سی دوڑ گئی۔ اس نے بڑی تیزی سے خود کو

سنبھالا اور پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ بوٹ ایک چکر کھانے کے بعد دریا کے عین درمیان رک گئی۔ پتا چلا کہ پانی پر تیرتا ہوا کوئی پرانا کپڑا بوٹ کی مشینری میں کہیں پھنس گیا ہے۔ بوٹ والے سخت جز بز نظر آ رہے تھے اور بڑبڑا رہے تھے۔ ایک دوسری موٹر بوٹ قریب سے گزری تو ہماری بوٹ والوں نے ان سے درخواست کر کے پھنسا ہوا کپڑا باہر نکلوایا۔ پانچ چھ منٹ کی تاخیر سے ہماری بوٹ پھر روانہ ہو گئی۔

سون بولی۔ ''معافی چاہتی ہوں۔''

''کس بات کی؟''

''آپ سے ٹکرا جانے کی۔ میں جانتی ہوں کہ ایسے معاملات بہت نازک ہوتے ہیں۔ ہمارے بدھ مت میں اگر کسی راہب سے کوئی عورت چھو جائے تو وہ بری طرح ناپاک ہو جاتا ہے اور سخت مصیبت میں پڑ جاتا ہے۔ کیا آپ کے مذہب میں بھی ایسی ہی کوئی بات ہے؟''

''ہمارے ہاں اس طرح کی کوئی انتہا پسندی نہیں پائی جاتی۔ ہمارے ہاں مائیں، بہنیں اور بیویاں ہوتی ہیں۔ ان کے چھو جانے سے ہمیں کچھ نہیں ہوتا۔''

پتا نہیں کہ وہ میرا طنز سمجھ سکی یا نہیں۔ اس نے بڑی نزاکت سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چھوڑو مذہب، معاشرے کی باتیں، میں ان سے الرجک ہوں۔''

''یہ بھی تو انتہا پسندی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جو کچھ بھی ہے مجھے پسند ہے۔ میں اپنی زندگی آپ جی رہی ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔''

''لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ جو لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں کبھی کبھی زبردست قسم کا یوٹرن بھی لیتے ہیں۔''

''پھر وہی گاڑھا فلسفہ...... اوہ گاڈ یہاں تو بیئر بھی نہیں جس کے ساتھ میں یہ سب نگل سکوں۔''

ہم سہ پہر کے وقت واپس ہوٹل پہنچے۔ ''کل کا کیا پروگرام ہے؟'' سون نے پوچھا۔

''کل میں ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ پرسوں ملیں گے۔'' وہ ذرا اداسی سے بولی۔

''میں تمہارے نمبر پر فون کر دوں گا۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے یا معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے میں نے؟''

''نہیں سون! ایسی کوئی بات نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ تم میرے لیے مفید ثابت ہو رہی ہو۔''

''بہت شکریہ!'' وہ مقامی انداز میں دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اور گھٹنوں میں تھوڑا سا خم دے کر بولی۔

عصمت ہوٹل سے کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنے گھر فون کیا۔ حال احوال دریافت کر کے کچھ تسلی ہوئی، راستے میں کٹے ہوئے پھل کا پیکٹ لیا اور مزے سے کھاتا ہوا ہوٹل پہنچ گیا۔ بستر پر لیٹ کر تا دیر اکمل کے بارے میں سوچتا رہا۔ ذہن میں کئی طرح کے اندیشے کلبلا رہے تھے۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟ اگر اپنی بے پروائی سے اس نے کہیں پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ گنوا دیا تو پاکستان کیسے پہنچیں گے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ واپس لوٹے ہی نہ...... اور میں خلا میں معلق ہو جانے والے خلا باز کی طرح بنکاک کے گلی کوچوں میں گھومتا پھروں؟

پھر ذہن میں وہ سینکڑوں مگرمچھ گھومنے لگے جو آج صبح میں نے دیکھے تھے۔ ہمارے ہاں رشوت خور اور کرپٹ لوگوں کے لیے مگرمچھ کا لقب استعمال کیا جاتا ہے۔ مگرمچھ کے وسیع جبڑے اور خونخوار دانتوں کو دیکھ کر واقعی کسی ایسے ذی نفس کا تصور ذہن میں آتا ہے جس کا مقصد حیات صرف اور صرف کھانا ہے۔ اس کی طاقت، اس کی گھات کا انداز اس کی پھرتی...... مگرمچھ کے بارے میں سوچتے سوچتے نجانے کیوں ذہن میں چنکی کا تصور ابھر آیا۔ وہ بھی تو کسی مگرمچھ کی طرح طاقتور اور خونخوار تھا۔ میرا دل بار بار گواہی دے رہا تھا کہ چنکی اور سون کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے، کوئی ایسا تعلق جس کی بنیاد جبر اور خوف پر تھی۔

اگلے دن میں نے سہ پہر تک آرام کیا اس کے بعد نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ میں نے کل سون سے کہا تھا کہ میرا کہیں جانے کا پروگرام نہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ میں آج پھر سنئیر اسٹور جانا چاہ رہا تھا۔ گھر والوں کے لیے تھوڑی سی خریداری کرنا تھی۔ پہلے میں یونہی ٹہلتا رہا اور ہوٹل سے کافی دور نکل آیا پھر مجھے معلوم نہ رہا کہ سنئیر اسٹور کس طرف ہے۔ میں نے ایک رکشا والے سے بات کی۔ اس نے کہا ''میں چالیس بھات میں آپ کو

سینٹر اسٹور پہنچا دوں گا۔'' پینتیس پر کرایہ طے ہو گیا۔ میں رکشے میں بیٹھا۔ آٹھ دس منٹ بعد اس نے مجھے ایک جگہ اتارا اور ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ سینٹر اسٹور ہے۔

میں نے شکریہ ادا کر کے اس کو کرایہ دے دیا۔ پندرہ بیس قدم چل کر میں ایک ذیلی سڑک کے سامنے پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ ایک پانچ منزلہ بلڈنگ اور چند نیون سائنز کی وجہ سے مجھے پتہ چلا کہ رکشا پر سوار ہونے سے پہلے میں یہیں کھڑا تھا۔ یعنی جہاں سے میں رکشا پر سوار ہوا تھا وہاں سے سینٹر اسٹور ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ ستم ظریف رکشا ڈرائیور نے آٹھ دس منٹ ادھر اُدھر گھما کر مجھے پھر وہیں پر اتار دیا تھا۔ یعنی بقول گیت نگار، لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے، یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے۔

بنکاک میں ہیرا پھیری اور نوسر بازی سے سیاحوں کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ وہ تلقین کوئی ایسی بے جا بھی نہیں ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر لوگ با اخلاق اور خوش مزاج ہیں۔ ہلکے پھلکے تفریحی انداز میں بات کرنا پسند کرتے ہیں۔ خاص طور سے اگر دکان داروں کے ساتھ خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا جائے تو سودا سستے داموں بھی مل سکتا ہے۔ آج دن بھر ڈٹ کر سونے کی وجہ سے میری آنکھیں کچھ سوجی سوجی تھیں۔ شاید ستم ظریف رکشا ڈرائیور نے یہی سمجھا تھا کہ میں نشے میں ہوں جو سینٹر اسٹور کے سامنے کھڑا ہو کر سینٹر اسٹور کے لیے رکشا ہائر کر رہا ہوں۔ اس نے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

ابھی میں سینٹر اسٹور کی طرف بڑھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک جانی پہچانی آواز نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ سون تھی۔ وہ بلائے ناگہانی کی طرح پتا نہیں کہاں سے نمودار ہو گئی تھی۔

''اوہ ٹورسٹ! یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

''اوہ سون! تم یہاں لیکن کیسے؟''

وہ بولی۔ ''بتاتی ہوں لیکن پہلے سڑک کے کنارے سے پیچھے تو ہٹو۔ دیکھو ساری ٹریفک تمہاری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی ہے۔ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ تم سڑک پار کرنا چاہ رہے ہو۔''

اب میں نے دھیان دیا تو پتا چلا کہ تیز رفتار گاڑیاں اور موٹر سائیکل وغیرہ میرے قریب آ کر بالکل آہستہ ہو جاتی ہیں۔ تا کہ میں سڑک پار کر سکوں۔ دراصل میں سڑک کے

عین کنارے پر اس طرح کھڑا تھا جیسے سڑک پار کرنا چاہ رہا ہوں۔"

بنکاک کے لوگوں میں جو اچھی عادات دیکھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تیز رفتار سڑکوں پر سڑک پار کرنے والوں کے لیے گاڑیاں آہستہ کر دی جاتی ہیں۔ بہر حال بنکاک کی ٹریفک کو مثالی نہیں کہا جا سکتا۔ "ٹریفک جام" وغیرہ کا سلسلہ یہاں بھی ہماری طرح موجود ہے۔ اس کے علاوہ پلوشن وغیرہ کی قباحتیں بھی ہیں۔

سون تنک کر بولی۔ "ٹورسٹ! اسی لیے تو تم سے کہا تھا کہ اجنبی شہر میں ایک شناسا کا ہونا ضروری ہے۔ قدم قدم پر ضرورت پڑتی ہے، ابھی تمہاری وجہ سے ساری ٹریفک جام ہو جانا تھی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور رکشے والی بات میری زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ رکشا والے نے ابھی میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ سون کے علم میں آ جاتا تو یقیناً یہیں فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے وہ پانچ منٹ کا ایک اور لیکچر مجھے پلا دیتی۔

"کہاں گھوم رہے ہو ٹرسٹ! آج تو تم نے سارا دن ہوٹل میں آرام کرنا تھا۔"

"بس آرام کرتے کرتے اکتا گیا تھا۔ سوچا ایک چکر سینٹر اسٹور کا ہی لگا آؤں۔"

"کیسے آئے ہو؟"

"پ...... پیدل!" میں نے جلدی سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے بنکاک کے رستوں کی اچھی خاصی پہچان ہو گئی ہے تمہیں۔ بھئی ذہین آدمی کی یہی تو شناخت ہوتی ہے۔"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے ناخوشگوار موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"مجھے ذرا کلب جانا تھا۔ تھوڑا سا کام ہے۔ بس دس پندرہ منٹ کا۔ اس کے بعد میں فارغ ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں سینٹر اسٹور کی شاپنگ میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔"

پچھلے تین چار دن میں سون نے اپنی افادیت ثابت کی تھی۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔"

ہم پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ایک کافی کشادہ دو رویہ سڑک تھی۔ دونوں طرف اونچی عمارتیں موجود تھیں۔ چلتے چلتے سون ایک دم رک گئی۔ "تم برا تو نہیں مناؤ گے؟"

"کس بات کا؟"

"کلب میں جانے کا...... وہ نائٹ کلب ہے نا۔ ذرا شوخ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"چلو تمہاری خاطر وہ شوخ قسم کے لوگ بھی دیکھ لیں گے۔ آخر بنکاک آئے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو خمیازہ بھگتنا ہی ہے۔ ویسے میرے خیال میں تو تمہارا یہ سارا شہر ہی نائٹ کلب ہے۔"

"یہاں تم تھوڑی سی زیادتی کر رہے ہو۔"

میں مسکرا کر رہ گیا۔ ہم پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ یہ رات کا وقت تھا، پھر بھی اکثر لوگ کن انکھیوں سے سون کو دیکھ لیتے تھے۔ مصنوعی روشنی میں بھی اس کی شکل شیشے کی طرح دکتی تھی۔ قریباً سو میٹر کی دوری پر نائٹ کلب کا جگمگاتا نیون سائن دکھائی دے رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت اثر، بنکاک کا مجھ پر ہونے لگا ہے۔ شاید یہی "بنکاکیت" تھی۔ جس نے یہاں پہنچتے ہی اکمل کو بھی متاثر کیا تھا اور وہ ایک دم بے لگام گھوڑے جیسا ہو گیا تھا۔ بلکہ وہ تو گھوڑا بھی نہیں رہا تھا۔ اڑن کھٹولا بن گیا تھا۔ اس کے رویے نے مجھے بے حد مایوس کیا تھا۔

ہم بلند و بالا عمارت میں داخل ہوئے۔ ہلکی موسیقی کی آواز آنے لگی تھی۔ کلب کے فرش صاف ستھرے اور چمکیلے تھے۔ مجھے ایک ادھیڑ عمر عورت نظر آئی۔ وہ منحنی سی تھی لیکن خوب میک اپ کیا ہوا تھا۔ بال گھونسلے کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے دیکھ کر ہالی ووڈ کی کسی جادوگرنی کا منظر ذہن میں ابھرتا تھا۔ میرے سامنے دو انڈین لڑکوں نے اس سے بات چیت کی۔ لڑکے اسے کچھ نوٹ تھما رہے تھے لیکن وہ انکار کر رہی تھی اور مزید کا تقاضا کر رہی تھی۔ اسی دوران بڑے غصیلے انداز میں اس نے نوٹ فرش پر پھینک دیئے۔ ایک لڑکے نے شرمندہ ہو کر نوٹ اٹھائے، دوسرے نے پتلون کی جیب سے کچھ مزید نوٹ نکال کر پہلے نوٹوں میں شامل کیے اور یہ نوٹ منحنی سی تھائی عورت کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

ہم آگے بڑھے تو منحنی چڑیل نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا، لیکن پھر وہ غالباً سون کو پہچان گئی تھی۔ اس کے بوسیدہ ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچے اور اس نے ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہاں داخل ہونے کے لیے کوئی ٹکٹ وغیرہ کا چکر بھی ہے۔ میں نے یہ بات سون سے پوچھی، تو وہ عام

سے لہجے میں بولی۔ ''ہاں...... یہاں شو بھی ہوتا ہے نا۔''
اس سے پہلے کہ میں شو کی تفصیلات پوچھتا، ہم ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں سون نے دو لڑکیوں سے تھائی زبان میں بات چیت کی۔ انہیں ایک کاغذ دیا۔ پھر وہ میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک دروازے پر پہنچ گئی۔ یہاں بل ڈاگ کی شکل والا ایک شرابی گیٹ کیپر موجود تھا۔ وہ بھی سون کو پہچانتا تھا۔ ہم دروازے سے گزرے تو بالکل یہی لگا کہ کسی سینما ہال میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہاں ایک روشن اسٹیج تھا وہ خوب رو لڑکیاں مختصر لباس میں ڈانس کر رہی تھیں۔ یہ ہال نیم دائرے کی شکل میں تھا۔ ہال کے عقبی حصے میں مزید کرسیاں موجود تھیں۔ یہاں موجود تماشائی شو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ناؤنوش میں بھی مصروف تھے۔ ان کے لمحات کو مزید رنگین بنانے کے لیے رنگین تتلیاں بھی آس پاس موجود تھیں۔ کوئی بغل میں دبکی ہوئی تھی تو کوئی ہم آغوش نظر آ رہی تھی۔ ہال میں روشنی موجود تھی اس لیے ویٹر بھی با آسانی...... آ جا رہے تھے۔ جن انڈین لڑکوں کو باہر دیکھا تھا وہ بھی تماشائیوں میں موجود تھے۔

''پلیز بس پانچ منٹ!'' سون نے کہا اور ایک میز پر جا بیٹھی۔

یہاں ایک تھائی جوڑا پہلے سے موجود تھا۔ میرا مختصر تعارف کرانے کے بعد سون ان سے باتوں میں مصروف ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ان سے کسی طرح کے حالات دریافت کر رہی ہے۔ شو وغیرہ کی طرف اس کی بالکل توجہ نہیں تھی۔ باتوں کے دوران ہی میں نے طائرانہ نظر سے اسٹیج کی طرف دیکھا اور کھوپڑی بھک سے اڑ گئی۔ اسٹیج پر ناچنے والی دونوں لڑکیوں کے جسم پر اب لباس کا ایک تار بھی نہیں تھا۔ اس ہوش ربا منظر سے نگاہیں چرانا آسان نہیں تھا اور اس پر نگاہیں جمانا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں نے کرسی کا رخ تھوڑا سا پھیر لیا اور اپنے سامنے رکھے کولڈ ڈرنک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سامنے رکھے ایک بروشر پر میری نظر پڑی۔ یہ دراصل اس کلب کے شو میں پیش کیے جانے والے آئٹمز کی تفصیل تھی۔ مزید لکھا گیا تھا کہ شو شام سے رات گئے تک مسلسل چلتا رہتا ہے۔ یعنی شو ختم ہونے کے بعد پھر وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی جب چاہے اٹھ کر جا سکتا ہے، جب چاہے آ سکتا ہے۔ اب میں نے آئٹمز کی فہرست پر نگاہ دوڑائی تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ نہایت ''انسانیت سوز قسم'' کی تفصیل تھی۔ انسان تو انسان ''جانور'' بھی اس میں ملوث تھے یا یوں کہیں کہ ملوث کیے گئے تھے۔ بندر اور سانپ وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

میں نے اسٹیج کی طرف دیکھا کوئی دس عدد حسینائیں اسٹیج کے اوپر ہی شاور لے رہی تھیں۔ وہ اپنے مادری لباس میں تھیں۔ جو لوگ تالیاں بجا رہے تھے ان میں میں نے ایک دو سالہ بچے کو بھی دیکھا۔ وہ شاید اپنے باپ کی گود میں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسٹیج پر پرفارم کرنے والی لڑکیوں میں اس کی پھوپھی، خالہ یا ماں شامل ہو۔ عجیب مادر پدر آزاد ماحول تھا اور پروگرامز کی فہرست کے مطابق اس سے اگلا جو پروگرام اسٹیج پر پیش ہونے والا تھا، اسے دیکھنے کے لیے شیطان لعین کے دیدے درکار تھے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کک...... کیا بات ہے؟'' سون نے پوچھا۔

ان لمحوں میں جیسے اسے احساس تک نہیں تھا کہ اسٹیج پر کیا تماشا ہو رہا ہے۔ ''میں باہر جا رہا ہوں تم فارغ ہو کر آ جاؤ۔''

''بس میں بھی...... تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔'' وہ شولڈر بیگ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے اپنے شناسا جوڑے سے کھڑے کھڑے چند باتیں کیں پھر میرے ساتھ ہال سے باہر نکلتی چلی گئی۔ میں جب ایک بار چلا تو پھر سڑک پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ سون میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے میرا کندھا تھاما۔ ''کیا بات ہے شاداب! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم خاموش رہو ورنہ میں تم سے کچھ الٹا سیدھا بول دوں گا۔''

''بھئی کیا ہوا ہے؟ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ یہ نائٹ کلب ہے۔ یہاں اس قسم کے ''شو'' بالکل عام سی بات ہے۔''

''کیا تم یہ سمجھ سکتی ہو کہ یہ میرے لیے بھی عام سی بات ہو گی؟'' میں بلند آواز سے بولا۔ سون نے جواب میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن عین اس وقت نوجوانوں سے بھری ہوئی ایک کار ہمارے عین سامنے سے بڑی آہستہ روی سے گزری۔ کار میں نیم عریاں لباسوں والے لڑکیاں لڑکے ایک دوجے پر لدے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سون کے شناسا تھے۔ انہوں نے سون کو دیکھ کر ''ہائے ہاؤ'' کا شور مچایا اور ہاتھ ہلائے۔ سون نے بھی ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ کار آگے نکل گئی۔ اسی دوران میں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک ٹیکسی رکوائی تھی۔ اس سے پہلے کہ سون کچھ کہتی میں دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

وہ تذبذب میں تھی۔ ''کیا مجھے بھی جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں میں اکیلا جا رہا ہوں، شکریہ!'' اس کے ساتھ ہی میں نے ڈرائیور کو ٹیکسی آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

''سنو...... میری بات تو سنو......'' سون کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ ٹیکسی آگے بڑھ چکی تھی۔

اگلے روز صبح میری آنکھ ایک دستک پر کھلی۔ میں نے سوچا کاش یہ اکمل کی دستک ہو لیکن جب دستک دوسری بار ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہ نسوانی دستک ہے۔ اتنی صبح سون کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں نے دیوار گیر کھڑکی کا پردہ وا کیا۔ بالکونی میں حسب معمولی رجنی گندھا کے پھول مہک رہے تھے۔ میں نے مڑ کر دروازہ کھولا۔ باہر سون ہی تھی۔ وہ بڑے معقول لباس میں تھی۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔

''کیا اپنی رقم لینے آئی ہو؟''

''کیسی رقم؟''

''چار پانچ دن میرے لیے گائیڈ کے فرائض انجام دیتی رہی ہو تم۔''

''تم ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو۔ میں اب بھی تمہارے لیے گائیڈ کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔ باقی جہاں تک معاوضے کی بات ہے وہ بھی میں چھوڑوں گی نہیں...... لیکن فی الحال تو میں معاوضہ لینے نہیں آئی۔ تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم اتنا ناراض کیوں ہوئے ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ ناراضی کی کوئی وجہ نہیں تھی؟ تم مجھے ایک بدنام ترین جگہ پر میری مرضی کے خلاف لے گئیں۔ بالفرض میرا کوئی شناسا مجھے وہاں داخل ہوتے دیکھ لیتا...... تو کیا ہوتا۔''

''اچھا میں مانتی ہوں کہ غلطی میری ہی ہے لیکن تم بھی تو مجھے بے عزتی کے ساتھ سڑک کے کنارے چھوڑ آئے تھے۔ کیا یہ آداب کے خلاف نہیں؟''

''شکر کرو کہ میں آداب کی خلاف ورزی میں زیادہ آگے نہیں گیا۔''

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے گھورتی رہی۔ پھر ایک دم ڈھیلے لہجے میں بولی۔ ''اچھا چلو چھوڑو اس بات کو۔ آئندہ میں زیادہ احتیاط رکھوں گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی ادا سے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے کن انکھیوں سے اس کی صورت دیکھی۔ چہرے پر بے چارگی کی جھلک دیکھ کر مجھے ترس سا آ گیا۔ میں نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا شاور لے لوں پھر اس بارے میں سوچتے ہیں۔''

وہ فرمانبرداری سے ایک طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں باتھ روم میں چلا گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو اس نے بڑی صفائی سے میز پر ناشتا چنا ہوا تھا۔ وہ بڑی زود فہم تھی۔ پچھلے تین چار دنوں میں ہی اسے بخوبی معلوم ہو گیا تھا کہ ناشتے میں مجھے کیا کیا پسند ہے۔ میرے کہنے پر اس نے میرے لیے چائے بھی بنائی۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی میری نگاہیں اس کے کلائی کے کنگن پر جمی تھیں۔ کلائی اور کنگن کا یہ ملاپ اتنا خوبصورت تھا کہ دل خود بخود اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ یک دم اس نے میری محویت کو نوٹ کر لیا۔ زیرِ لب مسکرا کر بولی۔ ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''کک...... کچھ نہیں۔''

''یہ کنگن میرے والد نے مجھے شادی پر دیا تھا۔'' اس کے منہ سے جیسے بے اختیار ہی نکل گیا تھا۔

''تمہاری شادی بھی ہوئی تھی؟''

وہ گڑبڑا گئی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ ''ہاں...... ہوئی تھی لیکن نہ ہونے جیسی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''چھوڑو ان باتوں کو......'' وہ اٹھی اور فریج کی طرف بڑھی۔

''کیا کرنے لگی ہو۔''

''میں تمہارے فریج سے ایک بیئر لے لوں۔''

''یہاں بیئر نہیں ہے۔ اگر ہوتی بھی تو میں تمہیں لینے نہ دیتا کیونکہ...... ہمارے درمیان معاہدہ ہے جب تک تم میرے ساتھ رہو گی کوئی نشہ نہیں کرو گی۔''

''تمہاری ساری پابندیاں وہی ہیں جو بدھا نے اپنے اوپر لگائی تھیں۔'' وہ زور سے ہنسی لیکن پھر ایک دم اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔

دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے ٹیکسی ڈرائیور چنکی کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر سون کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ چنکی کی موجودگی میں وہ ایک دم اپنے آپ میں سمٹ جاتی تھی۔ چنکی کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ پٹی یقیناً

اسی دھینگا مشتی کی نشانی تھی جو تین روز پیشتر کروکوڈائل فارم کے نزدیک ہوئی تھی۔ چنکی کا حلیہ اور چال ڈھال سب کچھ مقامی لوفروں کی طرح تھا۔ وہ کرایہ لینے آیا تھا۔ میں نے سون کی ہدایت کے مطابق اسے پورا کرایہ یعنی اڑھائی سو بھات دے دیئے۔ اس نے شکریہ ادا کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ نوٹ گن کر پتلون کی جیب میں ٹھونسے اور بولا۔ ''آج کدھر کے ارادے ہیں جی؟''

''آج بس پیدل چلنے کا موڈ ہے۔'' میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

وہ ہم دونوں پر نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے واپس چلا گیا۔

میں نے سون کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں میں کوئی ناتا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''میرا خیال ہے کہ تم اپنے بارے میں بہت سی باتیں چھپاتی ہو۔''

''مثلاً کیا؟''

''مثلاً...... یہ چنکی...... مثلاً تمہارے والدین...... مثلاً...... تمہارے بائیں بازو پر یہ کالے کالے نشان۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہ نشان کسی پرانے مار پیٹ کا نتیجہ ہیں غالباً تمہارے ساتھ کافی سختی ہوتی رہی ہے۔''

''شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں خود پر ہونے والی سختی کی وجہ سے اس پیشے سے منسلک ہوئی ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں جہاں اور جس حال میں ہوں بہت خوش ہوں انجوائے کر رہی ہوں۔'' وہ ایک ادا سے بولی۔

ہم کمرے سے باہر نکل آئے اور پھر ہوٹل سے باہر چلے آئے۔ وہ میرے پہلو میں چل رہی تھی۔ جو نظر سون کی طرف اٹھتی تھی اس کی انتہائی خوبصورت رنگت دیکھ کر ذرا چونکتی ضرور تھی۔ ''چلو آج بوبے مارکیٹ چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''تم نے تو بتایا تھا کہ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔''

''کیا مطلب! بوبے مارکیٹ میں صرف شادی شدہ جا سکتے ہیں۔''

''بھئی، وہاں لوگ زیادہ تر بچوں کے کپڑے اور جوتے وغیرہ خریدنے جاتے ہیں۔ تم کس کے لئے خریدنے ہیں؟''

''ہونے والے بچوں کے لیے۔'' میری زبان سے پھسل گیا۔

یہ پہلی ہلکی پھلکی بات تھی جو میرے منہ سے نکلی تھی۔ وہ جیسے کسی ایسی ہی بات کی منتظر تھی۔ میری شادی اور ہونے والے بچوں کو موضوع بنا کر اس نے قہقہہ بار گفتگو شروع کردی۔ ہنستے ہوئے وہ بیر بہوٹی بن جاتی تھی۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹیں ڈھلک کر اس کے چہرے کو اطراف سے چھپا لیتی تھیں۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ لڑکی غلط پیشے سے منسلک ہے۔ اس پیشے سے وابستہ چہرے اپنا اجلا پن کھو کر ایک خاص سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی حرکات و سکنات کا عامیانہ پن بالکل عیاں ہوتا ہے مگر سون کے سلسلے میں معاملہ بالکل مختلف تھا۔ کسی وقت تو اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ سرسبز پہاڑی مقام کی نوجوان پہاڑن معصومیت کی چادر اوڑھے اپنی بکریوں کے پیچھے اچھلتی کودتی چلی آرہی ہے۔

میں نے کئی بار سوچا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ وہ نائٹ کلبوں میں جاتی ہے۔ ڈرنک بھی کرتی ہے۔ یقیناً غیر مردوں کے ساتھ سوتی بھی ہوگی، اس کے باوجود وہ الھڑ اور معصوم نظر آتی ہے۔ حقیقت میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی ایک ہی وجہ میری سمجھ میں آتی تھی اور وہ یہ کہ سون کو اس پیشے سے منسلک ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی اور گناہ کی تاریکی اور ویرانی نے اس کے خدوخال کو ابھی ڈھانپنا شروع نہیں کیا تھا۔ ٹیکسی کے ذریعے ہم بوبے مارکیٹ پہنچے تو دوپہر ہونے والی تھی۔ یہاں خریداری کافی آسان تھی۔ بچوں کے جوتے کپڑے اور کھلونے وغیرہ کثرت سے نظر آتے تھے۔ کوالٹی کے لحاظ سے مال کو ایک دو اور تین نمبر دیئے گئے تھے۔ اسی اعتبار سے قیمتیں بھی تھیں۔ مال کی کوالٹی اس کے نمبر کے عین مطابق تھی۔ سون نے خریداری میں بڑی خوش اسلوبی سے میری مدد کی۔ بچوں کے کھلونے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ابھر آتی تھی جیسے وہ خود بھی ایک بچی ہی ہو۔ وہ ایک گڑیا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ گڑیا تھائی دلہن کے روپ میں تھی۔ سون کے چہرے پر شفق کی سی سرخی پھیلی ہوئی تھی، اچانک میں نے اس کے چہرے کا بدلتا ہوا تاثر دیکھا۔ اس کا خوبصورت رنگ یکدم زرد ہو گیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بے اختیار میرے کندھے پر آیا، میری قمیض اس نے مٹھی میں جکڑی۔ وہ جیسے سہارا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک دم وہ لہرائی میں نے اسے سنبھالا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

اگر میں نہ سنبھالتا تو وہ بری طرح لڑھک جاتی پھر بھی وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ میں

گھٹنوں کے بل گر پڑا، سون کا سر میری گود میں تھا۔ ”سون...... سون...... کیا ہوا ہے تمہیں؟ سون آنکھیں کھولو۔“ میں نے اسے پکارتے ہوئے کہا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے یہ صورتحال سنگین محسوس ہوئی تھی۔

وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں نے اس کے ریشمی گالوں کو تھپکا، اسے تھوڑا سا جھنجھوڑا اس کی پلکوں میں لرزش پیدا ہو گئی۔ چند سیکنڈ میں ہمارے گرد درجنوں افراد جمع ہو گئے تھے۔

”سون آنکھیں کھولو۔“ میں نے اس کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں درز پیدا ہوئی مگر وہ آنکھیں پوری نہیں کھول سکی۔ ”کیا یہاں نزدیک کوئی ڈاکٹر ہے۔“ میں نے ایک ادھیڑ عمر شخص سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ ادھیڑ عمر شخص کوئی جواب دیتا ہجوم کے اندر سے ٹیکسی ڈرائیور چنکی برآمد ہوا۔ اس کی یہاں موجودگی حیران کن تھی۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھا۔ وہ سون کے قریب بیٹھ گیا پھر اس نے بالوں سے پکڑ کر اسے ذرا زور سے ہلایا۔ تھائی زبان میں تیز تیز کچھ کہا۔ اس کا لہجہ کرخت تھا۔ تب اس نے نیم دراز سون کو گردن سے تھام کر سیدھا بٹھا دیا۔ اس نے ایک بار پھر سخت لہجے میں سون سے کچھ کہا، ساتھ ہی سون کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔

سون نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی پھر وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک طرف سے چنکی نے دوسری طرف سے میں نے اسے سہارا دیا۔ چنکی نے تھائی زبان میں دو تین جملے مزید سون سے کہے پھر وہ ہجوم کے اندر گم ہو گیا۔ چند لمحے بعد ہجوم بھی چھٹنا شروع ہو گیا۔ میں نے سون کو ایک قریبی بینچ پر بٹھایا۔ اسے کولڈ ڈرنک پلایا۔ ”یہ کیا ہوا تھا تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں...... میں اب جانا چاہتی ہوں۔“ وہ میرے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

”کہاں جانا چاہتی ہو؟“

”اپنے گھر...... تم بس مجھے ٹیکسی میں بٹھا دو۔“

وہ کافی ڈسٹرب نظر آتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اس طرح ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں، چلو آؤ میرے ساتھ۔“

''نہیں میں چلی جاؤں گی۔تم بس مجھے......''

''نہیں۔'' میں نے تحکم سے کہا۔''میں تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اسے لے کر ٹیکسی تک آیا۔ جو سامان خریدا تھا وہ بھی ٹیکسی میں ڈال لیا۔''کیا ہوا تھا تمہیں؟'' میں نے راستے میں پوچھا۔

''مجھے خود پتا نہیں بس چکر سا آ گیا تھا۔''

''پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا؟''

''شاید ایک دفعہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا لیکن یہ پرانی بات ہے قریباً ایک سال پرانی۔''

مجھے لگا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ میں نے اس کی غلط بیانی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔''مجھے شک تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور چنکی تمہیں پہلے سے جانتا ہے۔ آج یہ شک یقین میں بدل گیا ہے۔ اس نے تمہیں جس طرح ہوش میں لانے کی کوشش کی ہے اس سے بخوبی اندازہ ہوا ہے کہ وہ تمہیں پہلے بھی ایسی کیفیت میں دیکھ چکا ہے اور شاید تمہاری مدد بھی کر چکا ہے۔''

''تم خوامخواہ شرلاک ہومز بننے کی کوشش کر رہے ہو۔'' اس نے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائی۔

''اس کے علاوہ ایک حیرانی کی بات یہ بھی ہے کہ چنکی بوبے مارکیٹ میں ہمارے اردگرد موجود تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے پیچھے وہاں کیا کرنے آیا تھا۔''

ایک دم مجھے لگا کہ سون کا رنگ زرد ہو گیا ہے۔ مجھے فوراً غلطی کا احساس ہوا، ابھی وہ پوری طرح سنبھلی نہیں تھی۔ مجھے اس سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں تھیں۔ میں نے فوراً گفتگو کا رخ موڑ دیا اور اس سے اس کے اہل خانہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میرے سوالوں کے جواب میں سون نے کہا۔''میں اپنی والدہ کے ساتھ ایک قریبی فلیٹ میں رہتی ہوں والدہ آنکھوں سے معذور ہیں۔ میری ایک بہن ہے۔ وہ مجھ سے ایک سال چھوٹی ہے اور محکمہ ڈاک میں کام کرتی ہے۔'' (بعد ازاں یہ ساری معلومات غلط ثابت ہوئیں)

میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ جلد ہی اس کا فلیٹ آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے اپنے فلیٹ میں آنے کی دعوت دے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے اور گڈ بائے کہہ کر نیچے اتر گئی۔ ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ گھوم کر مجھ سے کہنے لگی۔''کل کا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا۔''یہ مت بھولو کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

''اچھے ڈاکٹر ہو۔ جانتے بوجھتے کچھ بھی نہیں ہو۔'' اس نے ایسے عجیب لہجے میں کہا کہ میں چونک گیا۔

مندرجہ بالا جملہ ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا تھا۔ اس رنگ کو مجھ سے چھپانے کے لیے اس نے رخ پھیرا اور فلیٹ کی طرف چلی گئی۔

میں رات کو بستر پر لیٹ کر دیر تک سون کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کیسی لڑکی تھی۔ اپنے چہرے پر گناہ کی کالک مل کر پھر رہی تھی لیکن یہ کالک بھی اس کے چہرے کو کالا نہیں کر سکی تھی۔ اس کے اندر کی روشنی اس سیاہی پر غالب آئی ہوئی تھی۔ آج اپنے فلیٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے جو فقرہ مجھ سے کہا تھا وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس فقرے کا آہنگ بہت عجیب سا تھا۔ ایک پوشیدہ جذبہ تھا۔ جو بے اختیار الفاظ کے قالب میں ڈھل کر اس کے ہونٹوں تک چلا آیا تھا۔ بہر حال ابھی میں اس جذبے کو کوئی واضح معنی نہیں پہنا سکا تھا۔

اگلے دو روز بھی ہم دونوں نے ساتھ ساتھ ہی بنکاک میں گھومتے گزارے۔ وہ بہت نارمل نظر آتی تھی۔ اس دن بوبے مارکیٹ میں بے ہوش ہو جانے والے واقعے کو وہ تقریباً بھول ہی گئی تھی۔ میں نے ایک دو بار باتوں باتوں میں اسے کریدنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بڑی صفائی سے گفتگو کا رخ موڑنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے یہی تاثر دیا تھا کہ گرمی اور تھکاوٹ کی وجہ سے اسے چکر آ گیا تھا۔ بنکاک میں یہ میرے آخری دن تھے۔ میں نے ایک پورا دن رابنسن اسٹور میں گزارا۔ سون بھی میرے ساتھ رہی۔ وہ شاپنگ میں میری بھرپور مدد کرتی رہی۔ شاپنگ کے دوران میں ہی ڈنر کا وقت ہو گیا۔ ہم نے لنچ بھی ہلکا پھلکا کیا تھا، زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے ادھر ادھر گھوم کر کوئی اچھا سا ریسٹورنٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی پھر ایک کلب نما ہوٹل میں گھس گئے۔

ہوٹل میں گھستے ہوئے یکبارگی میری نظر پہلو کی طرف گئی اور میں ٹھٹک گیا۔ کوئی سایہ سا ایک رنگین شیشے کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور چنکی تھا۔ اس کا قد کاٹھ اور بالوں کا انداز سو فیصد چنکی کا تھا۔ بس میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے اپنے اس شک کا اظہار سون سے کرنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ میں اس کا موڈ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔ یہاں ایک بار بھی تھا۔ بار کے طویل کاؤنٹر کے سامنے کئی جوڑے تمتمائے ہوئے چہروں کے ساتھ موجود تھے۔ یہاں دیکھا ہوا ایک منظر ہمیشہ کے لیے میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ میں نے ایک درمیانی عمر کے شخص کو دیکھا۔ وہ کسی یورپین ملک سے تعلق رکھتا تھا۔ اچھے قد کاٹھ کا تھا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی اور پڑھا لکھا نظر آتا تھا۔ اس نے ایک دھان پان نوخیز سی لڑکی کے گلے میں بانہیں ڈال رکھی تھیں۔ موسیقی کی لے پر تھرکنے کے ساتھ ساتھ وہ لڑکی کے ساتھ عجیب و غریب حرکات میں مصروف تھا۔ اس شخص کی عامیانہ حرکات اور حرکات کا گھٹیا پن دیکھ کر اتنی کوفت ہوئی کہ دل بیزار ہو گیا اور تو اور سون بھی خجل سی نظر آئی۔

اگلے روز شام کو جب میں اور سون کمرے میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ سون نے اچانک کہا۔ ''تین دن بعد تم چلے جاؤ گے۔ میں خود کو بہت اداس محسوس کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''تین دن بعد جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ تم اب کی بات کرو۔ اب ہم ساتھ ہیں، مستقبل کے اندیشوں میں اپنے آج کو کیوں خراب کریں۔ چلو آؤ ذرا مٹر گشت کر کے آتے ہیں۔''

''نہیں......'' وہ بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی۔ ''آج بس کمرے میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی ایک لٹ اس کے نہایت ریشمی رخساروں کو چھو رہی تھی۔ وہ اچانک بولی۔ ''کیا تمہارا دل نہیں چاہتا مجھے چھونے کو؟''

میں ایک دم گڑبڑا گیا۔ کسی نے جیسے میرے دل کا چور پکڑ لیا تھا، اپنے چہرے کے تاثرات کو میں نے بمشکل چھپایا۔ ''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟''

وہ بولی۔ ''کیا تمہارے دل میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھے ہیں۔ تم اپنے بازو کی ایک معمولی سی حرکت سے مجھے چھو سکتے ہو لیکن تین دن بعد جب تم چلے جاؤ گے تو ہمارے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ پیدا ہو جائے گا۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمارے درمیان اب بھی ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔''

''تم بڑے سخت دل ہو ٹورسٹ! جی چاہتا ہے کہ تم سے روٹھ جاؤں۔''

''تو روٹھ جاؤ۔''

''یہ بھی مشکل ہے۔ اس طرح تو جو اگلے دو تین دن تمہارے ساتھ گزارنے ہیں ان سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔''

''ان دو تین دنوں سے اگر تم نے کوئی غلط توقع وابستہ کر رکھی ہے تو اسے دل سے نکال دو۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک ادھوری انگڑائی لی۔ پھر صوفے پر پیچھے کو کھسکتے ہوئے اپنی کہنی صوفے کے ہتھے سے ٹکائی اور اپنا ہاتھ کنپٹی پر رکھ کر سر کو سہارا دیا۔ میری طرف ادا سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم دوستی کی حد تک تو جا ہی سکتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ہاتھ تھامنا، گلے لگانا، تھوڑا سا چوم لینا۔'' وہ بے باکی سے بولی۔

''مرد اور عورت کے درمیان اس طرح کے تعلق کو دوستی کا نام دینا حماقت ہے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تمہارے نزدیک جنس ہی سب کچھ ہے۔''

''تم الفاظ کے ہیر پھیر سے مجھے گمراہ نہیں کر سکتی ہو۔''

''میری بات کا جواب دلیل سے دو تو بات بھی ہے۔'' اس نے اپنے بالوں کو اس طرح جھٹکا کہ کچھ بال میرے شانے تک آ پہنچے۔

میں نے کہا۔ ''شاید تم بھول رہی ہو کہ میں ایک ٹورسٹ ہوں اور تم گائیڈ...... اور ہمارے درمیان کچھ شرائط طے ہو چکی ہیں۔''

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

پچھلے تین چار دن میں ہمارے درمیان اجنبیت کی دیوار کافی حد تک گر گئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے سون کے اندر ایک مظلوم و مجبور لڑکی نظر آئی تھی۔ وہ اپنے اندر کے اندھیرے کو ہنگامی راتوں کی چکا چوند سے دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اس زعم کا شکار تھی کہ ایک ہنستی مسکراتی زندگی گزار رہی ہے حالانکہ اس کے اندر دکھ کا موسم ٹھہرا ہوا تھا۔

''اچھا تو میں چلتی ہوں۔'' اس نے اپنے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے کہا تو اس کا کنگن خوبصورت کلائی سے پھسل کر نیچے کی طرف چلا گیا۔

''کل کتنے بجے آؤ گی؟''

''جتنے بجے تمہارا حکم ہو ٹورسٹ!'' اس نے اٹھ کر شولڈر بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف اکمل کی آواز سن کر میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے غصے میں فون بند کر دیا۔ حسب توقع چند سیکنڈ بعد پھر فون کی گھنٹی بجی۔ آٹھ دس گھنٹیاں ہو چکیں تو میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے اکمل کی آواز آئی۔ "ہیلو میں اکمل بول رہا ہوں۔"

"میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" میں نے شدید غصے میں فون پھر بند کر دیا۔

تیسری مرتبہ پھر گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر اکمل کو بے نقط سنائیں۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ ظاہر ہے کہ قصور سراسر اسی کا تھا۔ اس نے قریباً سات دن مجھے سخت اذیت میں مبتلا رکھا تھا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ سون کا ساتھ مل گیا تھا ورنہ یہ سات دن مجھے ایک قیدی کی طرح کمرے میں بند ہو کر گزارنا پڑتے۔ فون پر ہی ہم دونوں میں کافی دیر تک تلخ کلامی ہوتی رہی۔ اکمل بنکاک میں ہی تھا اور "پتایا بیچ" کی طرف ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے مجھے یہ اطلاع دی کہ کل صبح گیارہ بجے کے قریب وہ واپس آ رہا ہے۔ بنکاک میں اپنے باقی دو روز وہ میرے ساتھ گزارے گا۔

میں نے کہا۔ "اب تم مجھے اپنا منحوس بوتھا نہ ہی دکھاؤ تو اچھا ہے۔ بس میرے کاغذات کسی کے ہاتھ بھجوا دو زندگی بھر تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

"میں جانتا ہوں تم اس وقت غصے سے پھٹ رہے ہو۔ لہٰذا کل تک کے لیے خدا حافظ۔" اس نے فون بند کر دیا۔

"تمہارا دوست تھا نا؟" سون نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "کیا وہ واپس آ رہا ہے؟" سون نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کب؟" وہ ذرا پریشانی سے بولی۔

"کل صبح۔"

سون کے روشن چہرے پر پژمردگی کا سایہ لہرا گیا۔ کچھ دیر تک کمرے میں گمبھیر خاموشی رہی۔ اس خاموشی میں بس ٹی وی کی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ "کیا بات ہے چپ کیوں ہو گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کل اور پرسوں کے پروگرام بھی کینسل؟" وہ بولی۔

"ہاں بھئی! وہ تو کینسل کرنے ہی پڑیں گے۔"

"یعنی آج...... میرا اور تمہارا آخری دن ہے۔"

"ہاں کل سے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ جو چاہو پہن سکتی ہو۔ جو چاہو پی سکتی ہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ کل سے میں پابند ہو جاؤں گی۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

اس لہجے نے مجھے پہلے بھی ایک بار چونکایا تھا۔ یہی وہ لہجہ تھا جس میں سون نے کہا تھا۔ "اچھے ڈاکٹر ہو۔ جانتے بوجھتے کچھ بھی نہیں ہو۔" یہ لہجہ اس لہجے سے بالکل مختلف تھا جس میں وہ عام طور پر بات کرتی تھی۔

ایک دوسرے سے جدا ہونے کا وقت ایک دم قریب آ گیا تھا۔ صورت حال کو محسوس کر کے میرا رویہ آپوں آپ نرم ہونے لگا تھا۔ میں نے کہا۔ "سون! پچھلے سات روز میں میں نے تم پر کئی پابندیاں لگائے رکھی ہیں اس کے لیے میں تم سے معذرت خواہ ہوں۔"

وہ نم ناک آنکھوں سے بولی۔ "معذرت تو مجھے کرنی چاہیے۔ میں خوامخواہ تم سے چمٹ گئی۔ اپنی بیکار باتوں سے تمہارے کان کھاتی رہی۔ اگر میری جگہ تمہیں کوئی اچھا اور سچ مچ کا گائیڈ ملا ہوتا تو تم اس سیر سے زیادہ بہتر طور پر لطف اندوز ہو سکتے۔"

"اچھا یہ شکووں شکایتوں والی باتیں چھوڑو آج یہ آخری شام ہمارے پاس ہے۔ اگلے دو روز میں بنکاک میں تو موجود ہوں گا لیکن تم سے نہیں مل سکوں گا۔ چلو اس شام کو اچھے طریقے سے گزاریں۔ ذرا گھومتے پھرتے ہیں۔ پھر کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ [illegible] گے...... اور پھر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں گے۔"

"او کے!" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور کھڑی ہو گئی۔

بنکاک جگمگا رہا تھا۔ ہم صاف ستھرے فٹ پاتھوں پر چلتے چلے گئے۔ تھائی لینڈ، ملائیشیا اور سنگاپور وغیرہ میں اکثر جگہوں پر اوپن ائیر ریسٹورنٹ نظر آتے ہیں۔ سڑک کے کنارے کھلی جگہوں پر میز کرسیاں لگا دی جاتی ہیں اور لوگ سرراہ کام و دہن کی تواضع میں مصروف نظر آتے ہیں۔ گرد و غبار چونکہ نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے "ہائی جینک" مسائل بھی پیدا نہیں ہوتے۔ چہل قدمی کے دوران ہم باتوں میں مصروف رہے۔ سون مجھ سے پاکستان کے بارے میں سوالات کرتی رہی، پھر میرے اہل خانہ کے بارے میں اور میری

روز مرہ مصروفیات کے بارے میں جاننے کی خواہش کرتی رہی۔ میں نے بس ضروری باتیں بتائیں اور کئی سوالوں کے جواب گول کر گیا۔ سون نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ زود فہم تھی اور سمجھ گئی تھی کہ وہ صرف اتنا ہی جان سکتی ہے جتنا میں اسے بتانا چاہوں گا۔

چہل قدمی کرتے ہوئے ہم شہر کے زیادہ بارونق علاقے کی طرف نکل آئے۔ رابنسن اسٹور بھی اسی علاقے میں واقع تھا۔ نجانے کیوں لوگوں کے ہجوم میں میری نگاہیں بار بار چنکی کو تلاش کرنے لگتی تھیں۔ ذہن میں یہ شک سا تھا کہ وہ بدبخت ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہوگا۔ اگر وہ نہ ہوا تو اس کا کوئی ساتھی ہوگا چنکی اور سون کے درمیان گہرے تعلق کے حوالے سے مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔ ہاں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ جس طرح سون نے اپنے کئی سوالات پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اسی طرح میں بھی اپنے اس سوال پر زیادہ اصرار مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ہر شخص کی اپنی نجی زندگی ہوتی ہے اور اس کے حوالے سے راز داری برتنے کا اسے پورا حق ہوتا ہے۔

گھومنے پھرنے سے بھوک کافی چمک گئی تھی۔ رابنسن اسٹور کے قریب ہی ایک اچھا ریسٹورنٹ تھا۔ سون کے خیال میں یہاں کا کھانا اچھا تھا مگر جب ہم اس ریسٹورنٹ پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ پتا چلا کہ کل رات ریسٹورنٹ کے عقبی حصے میں آتش زدگی کا واقعہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے آج ریسٹورنٹ بند ہے۔

"اب کیا کریں۔" میں نے اپنے خالی پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سون سے پوچھا۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ سادگی سے بولی۔

اچانک مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ جب میں نے انڈین ریسٹورنٹ سے ناقص کھانا کھا کر اپنا ہاضمہ خراب کیا تھا تو سون نے بتایا تھا کہ انڈین ریسٹورنٹ کے پاس ہی ایک سری لنکن ہوٹل ہے جس کی بریانی لاجواب ہوتی ہے۔ میں نے سون کو وہ بات یاد دلائی اور کہا کہ کیوں نہ آج اس آخری ڈنر میں وہ بریانی ٹیسٹ کر لی جائے۔

سون بولی۔ "وہ جگہ تو یہاں سے کافی دور ہے۔"

"کتنی دور ہے؟"

"پانچ چھ کلومیٹر تو ہوگی۔ چلیں ایسا کرتے ہیں بڑے چوک تک رکشا میں چلے جاتے ہیں پھر پیدل چلیں گے۔"

"سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔" میں نے اردو میں کہا۔

"او کے! یہ تم نے کیا کہا۔"

"سات دن سے انگریزی بول بول کر منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ تھوڑی سی اردو بول کر زبان کا ذائقہ ٹھیک کیا ہے۔ میں نے اردو میں کہا ہے جیسے تمہاری مرضی۔"

"تمہاری زبان بڑی اچھی ہے۔ ہمارے فلیٹ کے پڑوس میں ایک پاکستانی جوڑا کئی مہینے تک رہائش پذیر رہا ہے۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کی اردو سنا کرتی تھی۔ اگر میں نے کبھی انگریزی کے علاوہ کوئی زبان سیکھی تو وہ اردو ہوگی۔ سنا ہے کہ تمہارے ہاں اقبال نام کا ایک بہت بڑا شاعر ہے۔"

سون کے منہ سے علامہ اقبال کا ذکر سن کر مجھے حیرت ہوئی اور کچھ فخر بھی محسوس ہوا۔

شاید اس بارے میں ہم مزید باتیں کرتے لیکن اسی اثناء میں ہمیں رکشا مل گیا اور ہم خوش گوار ہوا میں سفر کرتے مین چوک کی طرف روانہ ہو گئے۔ سون نے اپنے لہجے کی اداسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "شاید! قدرت کو تھوڑی دیر مزید ہمارا ساتھ منظور ہے۔ ریسٹورنٹ کھلا ہوتا تو اب تک ہم کھانا شروع کر چکے ہوتے۔" میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

رکشا والے نے غالباً روانہ ہونے سے پہلے بیئر کے چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیے تھے۔ ٹھنڈی ہوا لگی تو اس کا سرور دو چند ہو گیا۔ وہ ترنگ میں آ کر کچھ گنگنانے لگا۔ اس کی آواز بڑی میٹھی تھی اور سر میں بھی تھی۔ بنکاک کی جگمگاتی سڑکوں پر یہ سریلا رکشا ڈرائیور، نشے میں ہونے کے باوجود احتیاط سے رکشا چلا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کی ڈرائیونگ لطف دے رہی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ موسم کا اثر ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اندر کے موسم کا اثر ہو..... آج میرا موڈ بہت اچھا تھا۔ میں نے سون سے پوچھا۔ "یہ کیا گا رہا ہے سون؟"

وہ بولی۔ "یہ ایک قدیم تھائی گیت ہے۔ اس میں سمندر کا ذکر ہے جو بہت وسیع اور بہت طویل ہے۔ ایک حیران بلبل پام کے ایک بلند درخت پر بیٹھ کر دور دیکھتا ہے اور سوچتا ہے یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے، یہ ہوا کہاں سے چلتی ہے۔ یہ سورج کی سرخ گیند کہاں اوجھل ہوتی ہے؟ وہ اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جس طرح سمندر میں گم ہونے والی لہریں پھر پلٹ کر کنارے پر آتی ہیں۔ جس طرح دن میں تھم جانے والی ہوا، رات پچھلے پہر پھر چلنے لگتی ہے، جس طرح گم ہونے والا سورج دوبارہ

آسمان پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا ساتھی جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا، ایک دن واپس آ جائے گا۔"

"بہت اچھا گیت ہے۔" میں نے کہا۔

"گیت ہمیشہ اچھے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو اچھا نہ ہو وہ گیت نہیں ہو سکتا۔"

میں نے زور سے کھانس کر گلے پر ہاتھ رکھ لیا اور آگے کو جھک گیا۔

"کیا ہوا؟" وہ گھبرا کر بولی۔

"پپ...... پانی۔" میں نے کہا۔

وہ مزید گھبرا گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ رکشا والے کا شانہ ہلا کر رکشا رکوا دیتی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ خفا خفا نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ "یہ کیا ڈراما تھا۔ پانی کیوں مانگ رہے تھے۔"

"بھئی جب میرا فلسفہ تمہارے گلے میں اٹکا تھا تو تم بیئر مانگتی تھیں۔ میں بیئر کیسے مانگتا میں نے تو پانی ہی مانگنا تھا۔"

"یعنی میں نے تمہارے حلق میں فلسفہ پھنسایا ہے؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولی۔ "تم بہت خراب ہو ٹورسٹ! مجھے ڈرا ہی دیا۔"

"ہاں تم نے سوچا ہو گا، یہ مر گیا تو کیا ہو گا۔ ظاہر ہے کہ جلد باز ٹورسٹ اپنے گائیڈ جو پورے سات دن کا معاوضہ ادا کیے بغیر ہی خدا کو پیارا ہو جائے تو یہ بڑے اندھیر کی بات ہے۔"

وہ بولی۔ "ہاں معاوضہ تو میں لوں گی اور ضرور لوں گی۔ محنت کی ہے کوئی بیگار نہیں کی۔"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ "چلو ابھی حساب کر لو جو کام نمٹ جائے وہ اچھا ہے۔"

"نہیں ابھی نہیں۔" اس نے میرا ہاتھ روک دیا۔ "ابھی میری خدمات ختم نہیں ہوئیں۔ جس وقت تمہیں گڈ بائے کہوں گی اس وقت حساب بھی کر لوں گی۔"

رکشا والے نے بریک لگا کر ہماری گفتگو کو بھی بریک لگا دیئے۔ چوک آ گیا تھا۔ کرایہ ادا کر کے ہم اتر آئے۔ اب رات کے ساڑھے دس ہونے والے تھے۔ سڑکوں پر گہما گہمی میں بس معمولی کمی واقع ہوئی تھی۔ ہم فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ سامنے ہی عصمت ہوٹل تھا۔ پاکستانی کھانوں کی مہک آ رہی تھی۔ نوید کے نو عمر بچے کو ایک تھائی جوڑے نے بانہوں میں لیا ہوا تھا اور باری باری چوم رہے تھے۔ بچہ واقعی بڑا پیارا تھا۔ مجھے اکمل کی بات یاد آ گئی۔

ہوٹل میں آنے والے گاہکوں کی "اس بچے سے چوما چاٹی" دیکھ کر وہ بولا تھا، یار مجھے تو لگتا ہے کہ پورے بنکاک میں یہ واحد بچہ ہے۔ تمام اہل بنکاک اسی کو پیار کر کے گزارا کرتے ہیں۔ بنکاک میں ہمیں بچے واقعی کم نظر آئے تھے۔ صرف ایک دن جنرل پوسٹ آفس کی بلڈنگ کے سامنے ہم نے بچوں کی چند ٹولیوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھا تھا۔ اور ان کے ساتھ تصویریں بنوائی تھیں۔

عصمت ہوٹل کے عین سامنے وہ ہوٹل تھا جس میں، میں رہائش پذیر تھا، یعنی ہوٹل ٹروکیڈرو، ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم شمال کی طرف بڑھے۔ کھمبے کے نیچے ہمارا پرانا یار ٹوپی والا موٹا دلال چوکس کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اندر ایک ٹیپ ریکارڈر فٹ ہے جس پر ایک "ڈرٹی" ٹیپ چلتی رہتی ہے اور آواز آتی رہتی ہے۔ "ہیلو مین...... بیوٹی فل گرل...... لولی گرل...... ویری لو پرائس۔"

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خفگی ابھری۔ یہ وہی خفگی تھی جو موٹا گاہک ہاتھ سے نکل جانے پر کسی لالچی دکان دار کی آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ دلال کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم بڑی سڑک کی طرف چلے گئے۔

سری لنکن ہوٹل کافی بڑا تھا۔ تین چار منزلہ عمارت تھی۔ صفائی ستھرائی بھی نظر آتی تھی۔ ہم سب سے اوپری منزل پر چلے گئے۔ یہ ایک گول ڈائننگ ہال تھا۔ چاروں طرف شیشے لگے ہوئے تھے، یہاں سے دور تک بنکاک کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ ہر طرح سے ایک معیاری ہوٹل نظر آتا تھا۔ ہال کی ڈیکوریشن بھی سری لنکن اسٹائل میں کی گئی تھی۔ ویٹروں نے سری لنکن لباس پہن رکھے تھے۔ سون نے بریانی کا آرڈر دیا۔ میں نے کہا۔ "بھئی! اب تو بھوک بہت چمک گئی ہے ڈبل ڈنر ہونا چاہئے اور ساتھ میں سوپ بھی۔"

"تمہاری بھوک چمکی ہوئی ہے اور میری مری ہوئی ہے۔" اس نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"بس یونہی۔" وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں بولی۔

میں جلدی سے رخ پھیر کر ویٹر کو مزید آرڈر لکھوانے لگا۔ میں نے اسے تکے اور روٹی وغیرہ کا آرڈر بھی دیا۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنکس بھی لکھوائے۔ ویٹر چلا گیا تو وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ "مجھے اب تک جتنے لوگ بھی ملے ہیں تم ان سے مختلف نکلے ہو۔ میرے قریب ہوتے ہوئے بھی مجھ سے بہت دور رہے ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں

کافی عرصے تک بھول نہ پاؤں گی۔"

"کہیں تم نے اس دوری کو اپنے حسن کی توہین تو نہیں سمجھا؟"

"بناوٹ مت میں کوئی ایسی حسین بھی نہیں ہوں۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر بولی۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو، تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ شروع میں مجھے تمہاری دوری ناگوار گزری تھی لیکن پھر یہ ناگواری بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور اب تو یہ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ ہاں...... اس کی جگہ اب ایک اور طرح کی کسک دل میں ہے۔"

"کیسی کسک؟"

"مجھے خود بھی پتا نہیں۔" اس کی پلکیں جھک گئیں۔

باہر سے کسی نیون سائن کی گلابی روشنی سون کی جھکی ہوئی پلکوں پر پڑ رہی تھی۔ اس کی شیشے جیسی جلد اتنی شفاف اور خوبصورت نظر آ رہی تھی کہ اس پر نگاہ ٹکانا مشکل تھا۔ میرے جی میں آئی کہ ایک بار اس جلد کو چھو کر دیکھ لوں۔ اس کی نرمی اور ملائمت کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے محسوس کروں۔

پچھلے چھ سات دنوں میں وہ کئی بار بہانے بہانے سے مجھے خود کو چھونے کی دعوت دے چکی تھی۔ آج شام بھی اس نے دوستی کے حوالے سے ایسی ہی بات کی تھی۔ اس سے پہلے ایک دن ایک پارک میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی کنگن والی کلائی میرے سامنے کر دی تھی اور بولی تھی۔ "ذرا چھو کر تو دیکھو مجھے ٹمپریچر تو نہیں؟" میں نے بس انگلیاں چھو کر ہاتھ پیچھے ہٹا لیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ بظاہر اس کا ٹمپریچر ٹھیک ہے۔ وہ تنک کر بولی تھی۔ "تم تو مجھے ڈاکٹر بھی نہیں لگتے ہو۔ بھلا ایسے دیکھا جاتا ہے مریض کو۔" میں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی تھی کہ مریض مریض میں فرق ہوتا ہے...... لیکن...... آج...... پتا نہیں کیوں...... دل کا موسم کچھ اس طرح کا ہو رہا تھا۔ سر شام سون نے جو باتیں کہی تھیں وہ میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک دوست کی حیثیت سے میں اسے الوداع کہہ سکتا ہوں۔ دوست کی طرح اسے چھو کر گلے لگا سکتا ہوں اور اگر تھوڑی سی گنجائش مزید نکال لوں تو اسے چوم بھی سکتا ہوں۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ بغیر جنسی جذبے کے کسی کو چھوا اور چوما جا سکتا ہے یا شاید وہ ٹھیک نہیں کہہ رہی تھی۔ خیالات ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ ایک گہری سانس لے کر میں نے ذہن کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ خیالات پھر ترتیب وار ذہن میں آنے لگے۔ کیا الوداعی طور پر اسے چھو لوں۔ ایک

بار...... ایک آخری بار...... پھر ہم نے کون سا ملنا ہے، کون سا دوبارہ سامنا ہونا ہے۔ آج یہ باب یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ چند دن بعد میں اسے بھول چکا ہوں گا اور وہ مجھے...... اب دوبارہ ملنا نہیں، کوئی رابطہ نہیں رکھنا تو پھر چند سیکنڈ کے لیے قریب آنے میں کیا حرج ہے۔ اسے اچھی طرح الوداع کہہ دوں گا تو اس کی بات رہ جائے گی۔ وہ ایک ٹوٹے دل کے ساتھ یہاں سے رخصت نہیں ہوگی۔

میری نگاہ سامنے سون پر پڑی تو مجھے لگا کہ وہ کسی چیز کو بڑے دھیان سے دیکھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں کسی بہت گہری سوچ میں تھیں۔ چہرہ بالکل منجمد دکھائی دیتا تھا۔ اس کے انداز پر ذرا چونک کر میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ پہلے تو مجھے کوئی خاص شے دکھائی نہیں دی۔ پھر میری نگاہ ایک چہرے پر جم گئی۔ یہ ایک تھائی لڑکی تھی۔ وہ نویاہتا دلہن تھی۔ ساتھ میں یقیناً اس کا شوہر تھا۔ فیملی کے باقی ممبر بھی تھے۔ وہ ایک بڑی میز کے گرد کرسیاں سنبھال رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سون کی نگاہ دلہن پر جمی ہے اور اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا رہا ہے۔ یہ کیفیت بس چند سیکنڈ برقرار رہی۔ سون نے ایک دم اپنا رخ پھیر لیا اور اپنی ساری توجہ "مینو" پر مرکوز کر دی۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد اس کا اترا ہوا چہرہ معمول پر آ گیا۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ اس کے بعد سون نے اپنا رخ دلہن اور اس کی فیملی کی طرف سے بالکل پھیر لیا تھا اس نے بھول کر بھی ان کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ان لوگوں نے کھانا نہیں کھایا۔ صرف آئس کریم کھا کر وہ اٹھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہی سون کے تاثرات معمول پر آئے۔

میں نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا بہت واضح طور پر کیا تھا۔ اس سے پہلے بوبے مارکیٹ میں جو کچھ ہوا تھا وہ بھی میرے ذہن میں نقش تھا۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ دونوں واقعات میں "دلہن" مشترک تھی۔ وہاں بوبے مارکیٹ میں سون نے میرے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے گڑیا کے روپ میں دلہن دیکھی تھی یہاں اس کا سامنا ایک جیتی جاگتی دلہن سے ہوا تھا۔ میرا ذہن اس حوالے سے شاید مزید بھی الجھتا رہتا مگر سون نے اچانک مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ چہک کر بولی۔ "ٹورسٹ! وہ دیکھو فوٹو گرافر۔"

پولورائڈ تصویریں کھینچنے والا ایک فوٹو گرافر "سیاح خواتین و حضرات" کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ سون دوڑ کر گئی اور اسے کھینچ کر میرے پاس لے آئی۔ اس نے تھائی زبان میں فوٹو

گرافر سے کچھ کہا، وہ میری اور سون کی تصویر کھینچنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہمارے عقب میں ایک شاندار "ان ڈور" پودا تھا۔ سون نے اپنی کرسی ذرا میری طرف کھسکا لی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے تھے اور عریاں دودھیا کلائی پر کنگن آڑھا ترچھا لٹکا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ بعد تصویر ہمارے سامنے تھی۔ اچھی تصویر آئی تھی۔ خاص طور سے سون کی دھیمی سی مسکراہٹ کیمرے نے بڑی اچھی طرح کیچ کی تھی۔ میں نے فوٹو گرافر کو ادائیگی کے لیے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو سون جلدی سے بولی۔ "نہیں اس کی پے منٹ میں کروں گی، کیونکہ یہ تصویر میرے پاس رہے گی۔ اگر تمہیں تصویر چاہیے تو ایک اور اتروا لو۔"

"نہیں...... بس ایک ہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔

یہ میری طرف سے بے رخی کا مظاہرہ تھا۔ تاہم میری طرف سے ہونے والے ایسے کئی دوسرے "مظاہروں" کی طرح سون نے اس مظاہرے کا بھی برا نہیں منایا۔

ہم کھانا کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ شیشوں کے پار بنکاک کی ہزار ہا روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور ان روشنیوں سے آگے سمندر تھا۔ سمندر جو فاصلوں کی علامت تھا۔ مجھے اس سمندر کے پار جانا تھا۔ اپنے دیس میں، اپنے لوگوں میں...... کینڈل ڈنر کرتے ہوئے میری نظر بار بار سون کے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ جوں جوں رخصت کا وقت قریب آ رہا تھا وہ اداس ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی پلیٹ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ بولی۔ "مجھے یاد کرو گے؟"

"یاد کرنا یا نہ کرنا ایک قدرتی عمل ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں تمہیں یاد کروں گا...... اور تمہارے ساتھ ساتھ ان سات دنوں کو بھی۔ یہ میں نے بڑے اچھے دن گزارے ہیں۔"

"میں بھی تمہیں یاد کروں گی۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

میں چپ ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید وہ اب پھر مجھ سے میرا ایڈریس وغیرہ مانگے گی لیکن اس نے نہیں مانگا۔ یقیناً وہ سمجھ گئی تھی کہ ایسا کر کے وہ سوائے خجالت کے کچھ حاصل نہ کر سکے گی اور وہ خجل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے یہ خواہش مکمل طور پر دبالی تھی۔

خاموشی بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے میں پھر یہاں آؤں...... اگر آیا تو اسی ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تم سے بھی ملاقات ہو جائے۔"

"کب تک آؤ گے؟"

"ہو سکتا ہے کہ تین چار ماہ تک۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے سال...... یا پھر اس سے اگلے سال۔"

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "میں تقریباً روزانہ ہی نیوٹرو کیڈرو (ہوٹل) میں آتی ہوں۔ کم از کم ہفتے میں چار پانچ مرتبہ تو ضرور آتی ہوں۔ تم جب بھی نیوٹرو کیڈرو میں آؤ گے مجھے فوراً پتہ چل جائے گا۔"

"کافی پیو گی؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"آج جو تم پلاؤ گے میں پی لوں گی۔"

میں نے کافی منگوائی۔ ہم چسکیاں لیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ سون نے اپنی کلائی اٹھائی اور ننھی سی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "رات کے گیارہ بجے ہیں۔ آج ہم رخصت ہو رہے ہیں۔ ٹھیک بارہ روز پہلے یہی وقت تھا جب ہوٹل کے ڈسکو کلب میں ہم پہلی بار ملے تھے۔ میں رقص کرنے والوں کے درمیان سے راستہ بناتی تمہارے پاس آئی تھی اور تم سے پوچھا تھا کہ کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں؟"

"تم نے کہا تھا۔ ہاں پاکستان سے آئے ہیں۔"

"اور میں نے کہا تھا، میرا اندازہ بھی یہی تھا۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔ نیون سائن کی روشنی میں اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت نظر آتی تھیں۔ وہ جیسے بیتے ہوئے ان لمحوں کو یاد کر رہی تھی، اس کی آنکھوں سے مسرت، نورانی شعاعوں کی طرح پھوٹ رہی تھی میں پھر کہوں گا اس کی جلد بڑی ہی شفاف تھی۔ اس کی کلائی پر آڑا ترچھا لٹکا ہوا کنگن دلکش نظارہ دیتا تھا۔

ہمارے ارد گرد بنکاک کی روشنیاں ہزار ہا جگنوؤں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور ان روشنیوں سے آگے سمندر تھا۔ سمندر جو فاصلوں کی علامت ہے، جو کناروں کو جدا کرتا ہے۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "بارہ دن پہلے یہی وقت تھا جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے ٹورسٹ! اور اچھا وقت تو اور بھی تیزی سے گزرتا ہے نا؟"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس نے کافی کا آخری گھونٹ لیا اور بجھی بجھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ رخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ میں بھی جانتا تھا کہ رخصت ہونے کا وقت آ گیا

ہے۔

میں نے حوصلہ جمع کر کے کہا۔ ''کیا خیال ہے چلیں؟''

اسے جھٹکا سا لگا لیکن فوراً ہی وہ سنبھل گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ شولڈر بیگ کی طرف بڑھایا۔ میں اپنے پرس میں سے ڈھائی ہزار بھات پہلے ہی نکال چکا تھا۔ یہ بھات ان خدمات کا معاوضہ تھے جو سون نے پچھلے سات دنوں میں میرے لیے بطور گائیڈ انجام دی تھیں۔ میں نے شولڈر بیگ کی زپ کھول کر آہستگی سے یہ بھات سون کے بیگ میں رکھ دیئے۔

اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ نہ ہی کوئی جملہ بولا۔ بس خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بیگ اٹھا کر کندھے سے لٹکا لیا۔ ہم دونوں لفٹ کے ذریعے نیچے آئے اور پھر سڑک پر نکل آئے۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ دن بھر قدرے حبس رہا تھا لیکن اب بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سون کے بال دھیرے دھیرے اڑ رہے تھے۔ ہم پیدل ہی چلتے رہے۔ پتا نہیں کیوں وہ بالکل خاموش تھی۔ میں نے ایک دو باتیں کیں، جس کا جواب اس نے بس ہوں ہاں میں دیا۔ شارٹ کٹ لگانے کے لیے ہم ایک پارک کے اندر سے گزرے۔ رات کے پھول مہک رہے تھے۔ دودھیا روشنی مصنوعی تھی لیکن بالکل چاندنی کی طرح نظر آتی تھی۔ اکا دکا لوگ ابھی تک چہل قدمی میں مصروف تھے۔ ایک جگہ چند نابینا نوجوان گروپ کی صورت میں زمین پر بیٹھے تھے۔ وہ آرکسٹرا بجا رہے تھے۔ ان کے سامنے بچھے کپڑے پر بہت سے بھات اور Stanngs پڑے تھے۔ میں نے بھی دس بھات کا نوٹ کپڑے پر ڈال دیا۔

''تم نے کب جانا ہے؟'' اچانک سون نے پوچھا۔

''آج سے تین دن بعد، جمعے کے روز...... لیکن وقت کا پتا نہیں۔''

''کیا میں ائرپورٹ پر تمہیں الوداع کہنے آؤں؟''

''نہیں بھئی تمہیں بتایا ہے نا کہ ابھی کنفرم نہیں کہ کس وقت جانا ہے۔ یہ بھی پتا نہیں کہ جمعے کو جاتے ہیں یا نہیں۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ اس سے پہلے بھی میں نے اس سے فاصلہ برقرار رکھنے والی جتنی باتیں کی تھیں، ان کے جواب میں وہ خاموش ہی رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی کسی بات

پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے اچھی لگتی رہی تھی، اب کی بار بھی اچھی لگی۔ اب رخصت ہونے میں دو چار منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ میں نے چلتے چلتے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نہایت حسین جلد کے پیچھے اس کے تاثرات اوجھل تھے۔ آخر ہم پارک کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ ہم پارک کے اندر ایک گھنے درخت کے نیچے پھول دار جھاڑیوں کے پہلو میں کھڑے تھے اور ہمارے سامنے ایک دوراہا تھا۔ ایک سڑک نیوٹرو کیڈرو ہوٹل کی طرف جاتی تھی، دوسری مین چوک کی طرف، جہاں سے سون کے فلیٹ کی طرف جانے والا راستہ پھوٹتا تھا۔ اب اپنے اپنے راستے پر چلنے کا وقت آ گیا تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا اور عجیب وارفتگی کے عالم میں سون نے اپنا نرم ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس کا لمس دل کے اندر تک اترتا محسوس ہوا۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ آج کے بعد ہم کبھی نہ ملیں۔''

''ہاں ہوسکتا ہے۔'' وہ جیسے کسی گہرے کنویں میں سے بولی۔

''یہ آخری چند گھنٹے اچھے گزرے ہیں نا۔''

''ہاں بہت اچھے۔'' اس نے کہا۔ وہ غیر محسوس طور پر میرے بہت قریب آ گئی تھی۔ اس کی سانس میری ٹھوڑی پر اور ٹھوڑی کے نیچے گردن سے ٹکرائی۔ ایک خوشبودار دھند سی میرے اردگرد پھیل گئی۔ ان لمحوں میں میرے سارے آدرش اور نظریات اس دھند میں تحلیل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی لیکن وہ تحلیل ہو گئے۔ میری نگاہ سون کے خوبصورت ہونٹوں پر جم کر رہ گئی۔ دل کے اندر سے آواز آئی، ایک بار ان ہونٹوں کو چھو کر دیکھ لو۔ آج یہ بہت قریب ہیں پھر سینکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوں گے۔ ان جادو اثر لمحات میں میں نے خود کو اس بچے کی طرح محسوس کرلیا جو ہمیں اپنے والدین کے ساتھ کروکوڈائل فارم میں ملا تھا اور جس نے بے اختیار سون کے ریشمی رخساروں کو اپنی انگلی سے چھونا شروع کر دیا تھا۔

میں نے سون کو ذرا اپنی طرف کھینچا۔ وہ اور قریب ہو گئی۔ میرے ہونٹ یکباری جل اٹھے تھے۔ ایک میکانکی حرکت کے تحت میں سون کے چہرے کی طرف جھکا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے اور اس کے چہرے کے درمیان فقط چند انچ کا فاصلہ تھا، جب

اچانک اس نے اپنا چہرہ ایک طرف ہٹا لیا۔

مجھے جیسے کسی نے گہری نیند سے بری طرح جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میں نے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا لیکن ہونٹوں پر ایک گریز پا مسکراہٹ تھی۔ اس کے نرم ہاتھوں پر سے میری گرفت خود بخود ختم ہو گئی۔ وہ چند انچ پیچھے ہٹی اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”جہاں بہت سی باتیں ان کہی رہ گئی ہیں۔ اس ”بات“ کو بھی ان کہا رہنے دو۔“

”کک...... کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”میں تمہارے اس بوسے کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ جو تمہارے ہونٹوں سے کبھی میرے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکا...... اچھا...... خدا حافظ......“ اس نے میرا دایاں ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں پھر اس نے ہاتھ لہرایا اور جلدی سے رخ پھیر کر مخالف سمت میں مڑ گئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ پندرہ بیس قدم دور جانے کے بعد ایک دودھیا بلب کی روشنی میں وہ پھر میری طرف گھومی اور ہاتھ لہرایا۔ اس کی ریشمی کلائی میں اس کا خوبصورت کنگن چمکا۔ میں نے بھی بجھے دل کے ساتھ ہاتھ لہرایا، وہ ایک دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

❁❁❁

اگلے روز حسب وعدہ گیارہ بجے کے لگ بھگ اکمل ہوٹل میں وارد ہو گیا۔ بیل ہونے پر میں نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے اکمل تھا۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں رخ پھیر کر کمرے میں آ گیا۔ پانچ دس منٹ تک ہمارے درمیان تلخ کلامی ہوئی پھر دھیرے دھیرے لب و لہجہ دھیما پڑ گیا۔ میں نے سب سے پہلے اکمل سے اپنے سفری کاغذات وصول کئے اور انہیں تالے میں رکھا۔ اکمل کچھ کمزور نظر آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے دو تین روز بخار رہا ہے۔ زیادہ سگریٹ نوشی سے اس نے اپنے ہونٹ بھی سیاہ کر رکھے تھے۔

اگلے دو روز تک یوں تو ہم دونوں ساتھ رہے مگر ہمارے درمیان بہت کم بات ہوئی۔ کہتے ہیں کہ انسان کی اصل پہچان سفر کے دوران میں ہوتی ہے۔ بنکاک کا یہ پندرہ سولہ روزہ سفر مجھے بھی اکمل کی پہچان کرا گیا تھا۔ وہ ایک بالکل مختلف روپ میں میرے سامنے

آیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میرے اور اس کے مزاج میں بہت سی باتیں مختلف ہیں۔ ان دونوں میں مجھے کئی بار سون کا خیال بھی آیا تھا۔ وقت رخصت اس نے جو رویہ اپنایا تھا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ اپنے ظاہری رنگ و روپ اور شائستگی وغیرہ سے قطع نظر وہ ایک کال گرل تھی۔ اپنے ہفت روزہ ساتھ کے دوران میں وہ متعدد بار اشاروں کنایوں میں مجھے ”قربت“ کی دعوت دے چکی تھی۔ آخری شام کو بھی اس نے الفاظ کے ہیر پھیر سے مجھے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے دوستی کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا کہ لوگ دوستی کے حوالے سے بھی تو ایک دوجے کو چھو لیتے ہیں۔ ان سب باتوں کے بعد جب میں نے وقت رخصت اس کو چھونے کی کوشش کی تھی تو وہ ایک دم منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی اور مجھے اپنی نگاہوں میں خجل کر دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بھی تاؤ آ رہا تھا۔ میں نے ایسا عمل کیوں کیا جس کی وجہ سے کسی کو مجھے شرمندہ کرنے کا موقع ملا۔

تیسرے دن بروز جمعہ سہ پہر کے وقت ہم پیکنگ وغیرہ کر کے ائر پورٹ جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔ ہوٹل کا کرایہ پندرہ ہزار بھات کے لگ بھگ بنا۔ بذریعہ ٹیکسی ائر پورٹ پہنچے۔ یہ شام بھی قریباً ویسی ہی تھی۔ جیسی پندرہ روز پہلے کی شام تھی۔ چمکیلے آسمان اور خوشگوار حرارت والی شام لیکن وہ آمد کی شام تھی، یہ رخصتی کی شام تھی۔ ہم کئی تلخ اور خوشگوار یادیں لیے اس شہر سے واپس جا رہے تھے۔ ہاں یہ وہی شہر تھا جسے بنکاک کہا جاتا ہے۔ جسے وینس آف ایسٹ بھی کہا جاتا ہے۔ جسے سٹی آف انجلز بھی کہا جاتا ہے۔ جسے بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ کچھ اچھا کہا جاتا ہے کچھ برا کہا جاتا ہے۔ دریائے (Chao Phraya) کے کنارے یہ شہر اپنے بازاروں اور اپنے شبستانوں میں ہزار ہا کہانیاں سمیٹے [illegible] پھیلا ہوا ہے۔

بنکاک کے ائر پورٹ کی رونق دیدنی تھی۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ وہیں سکیورٹی کے ارکان میں کچھ سکھ حضرات بھی نظر آئے۔ دنیا کے اکثر خطوں کی طرح بنکاک میں بھی سردار صاحبان تھوک کے حساب سے ملتے ہیں۔ میں اور اکمل ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے جب اچانک ایک چودہ پندرہ سال کا تھائی لڑکا ہمارے قریب آیا۔ اس کی گردن بہت پتلی تھی۔ اس نے آنکھوں پر عینک بھی لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو پیکٹ تھے۔ ایک پیکٹ قریباً ایک فٹ ضرب دو فٹ کا تھا۔ دوسرا نسبتاً چھوٹا تھا۔ دونوں کو بڑی نفاست سے پیک کیا گیا تھا۔ ایک پیکٹ پر لکھا تھا۔ ”ٹورسٹ کے

لیے'' دوسرے پر لکھا تھا ''ٹورسٹ کے والدین کے لیے'' ان پیکٹوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا رقعہ بھی تھا۔ میں نے رقعہ کھول کر دیکھا۔ یہ سون کی ہینڈ رائٹنگ میں تھا۔ سون نے لکھا تھا۔

''گستاخی کی معافی چاہتی ہوں ٹورسٹ! یہ دو چھوٹے چھوٹے تحائف میری طرف سے قبول کرو۔ میں نے یہ تحائف ناجائز کمائی سے نہیں خریدے...... جائز کمائی سے خریدے ہیں۔ میں نے چند دن ایک مہربان کے ساتھ گائیڈ کے طور پر کام کیا ہے۔ یہ اسی کام کا معاوضہ تھا۔''

اکمل بھی بڑے غور سے رقعے کی تحریر دیکھ رہا تھا۔ وہ آنکھیں نچا کر بولا۔ ''واہ بھی واہ! تم تو چھپے رستم نکلے ہو۔ یہ سون صاحبہ کہاں سے آ ٹپکیں...... اور ان کا حدود اربعہ کیا ہے۔''

کچھ تو مجھے سون پر غصہ تھا کچھ اکمل کا تفتیشی انداز دیکھ کر میں جھلا گیا۔ میں نے تحائف لڑکے کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ! میں انہیں قبول نہیں کر سکتا۔''

لڑکے کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ ہکلا کر بولا۔ ''لیکن جناب......''

''میں نے کہا ہے نا...... میں نہیں لے سکتا۔'' میں نے سختی سے کہا اور اکمل کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج کی حدود میں داخل ہو گیا۔

اکمل بدستور مجھے کھوجی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر سون پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ مجھ سے کسی طرح کا رابطہ نہ کرے، کیونکہ آخری دو تین دنوں میں میرا دوست میرے ساتھ ہو گا، پتا نہیں کہ یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی یا پھر جان بوجھ کر اس نے تغافل کیا تھا۔ لاؤنج کے اندر بھی اکمل مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس نے مجھ سے دو چار سوالات بھی کیے جن کے مناسب جواب دے کر میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ شاید وہ اس حوالے سے مزید میرا دماغ کھاتا لیکن اسی دوران میں اچانک کچھ دیر کے لیے افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا۔ پتا نہیں کیسے افواہ پھیل گئی کہ ہمارے طیارے میں بم ہے۔ ہمارے سامان کی مکمل چیکنگ ہو چکی تھی، افواہ کے بعد دوبارہ چیکنگ ہوئی۔ یقیناً جہاز کو بھی ری چیکنگ کے عمل سے گزارا گیا ہو گا۔ خدا خدا کر کے ایک گھنٹے کی تاخیر سے ہم لاؤنج سے جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔

اکمل نے اس صورتحال کا کافی اثر لیا۔ اس کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ جہاز کے ''ٹیک آف'' کے بعد بھی وہ کافی دیر تک گم صم رہا۔ میرے حق میں یہ بہتر ہی تھا۔ سون کے حوالے سے

میں اس کے بیزار کن سوالات سے بچا ہوا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔ پی آئی اے کی یہ پرواز پہلے سمندر اور پھر ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے پر پرواز کرتی ہوئی پاکستان کی طرف بڑھتی رہی اور میرا ذہن نہ چاہنے کے باوجود سون میں الجھا رہا۔ بنکاک میں قیام کے دوران میں نے اسے بالکل اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی آئندہ اہمیت دینے کا ارادہ تھا لیکن بنکاک چھوڑنے کے بعد سے وہ مجھے مسلسل یاد آ رہی تھی۔ بے معنی خیالات سے ذہن کو ہٹانے کے لیے میں کھڑکی سے نیچے جھانکنے لگا۔ جہاز انڈیا پر سے گزر رہا تھا اور نیچے گہری تاریکی تھی۔ اس ''تاریک سمندر'' میں کہیں کہیں روشنیوں کے جھرمٹ نظر آتے تھے۔ یہ وہ چھوٹے بڑے شہر تھے جو ہمارے نیچے سے گزر رہے تھے۔ میں اس منظر میں کچھ ایسا کھویا کہ تھوڑی دیر کے لیے باقی سب کچھ میرے ذہن سے نکل گیا۔ بنکاک...... ہوٹل نیو ٹروکیڈرو، پتایا بیچ، چنگی، سون آخری شام اور آخری شام کے دوراہے پر ایک نامکمل ملاقات کی کسک، سب کچھ ذہن سے محو ہو گیا۔ میں نیچے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ تاریک سمندر میں گاہے گاہے نمودار ہونے والے یہ روشنیوں کے جھرمٹ وسیع و عریض بستیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان بستیوں میں ہزارہا چار دیواریاں ہیں، ان ہزارہا چار دیواریوں میں بے حد و شمار لوگ ہیں۔ کچھ ہنس رہے ہیں، کچھ رو رہے ہیں۔ کچھ ان مٹ کہانیوں کو جنم دے رہے ہیں، ایسی کہانیاں جن میں دوراہے ہوتے ہیں۔ ایسے دوراہے جن کے سرے پر کھڑے ہو کر لوگ الوداعی ملاقاتیں کرتے ہیں۔ سوچتے سوچتے ذہن پھر سون کی طرف منتقل ہونے لگا۔ اس کی ناقابل فہم اداؤں میں الجھنے لگا۔ میں نے سر جھٹک کر نگاہ کھڑکی سے ہٹا لی۔

❁❁❁

لاہور آنے کے بعد چند دن تک میں سخت ''اپ سیٹ'' رہا۔ نہ چاہنے کے باوجود سون کا چہرہ بار بار میری نگاہوں میں آ جاتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ عجیب و غریب لڑکی مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتی تھی اور شاید سمجھانا بھی چاہتی تھی۔ اس کی زندگی بھید بھری تھی۔ اس کے روز و شب کے پیچھے کوئی کہانی سرسرا رہی تھی۔ میں نے اس کے صاف شفاف بازو پر ایک دو جگہ براؤن داغ سے دیکھے تھے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا اندازہ تھا کہ یہ داغ چوٹوں کا نتیجہ ہیں۔ عین ممکن تھا کہ یہ چوٹیں مار پیٹ کا نتیجہ رہی ہوں۔

پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ سون بنکاک میں جو زندگی جی رہی ہے وہ اس کی من مرضی کی زندگی نہیں ہے لیکن اگر وہ زندگی من مرضی کی نہیں تھی تو پھر وہ اتنا خوش کیوں نظر آتی تھی۔ اس نے پرزور الفاظ میں کہا تھا کہ وہ اپنے روز و شب کو بہت انجوائے کر رہی ہے۔ اپنے ہر ہر لمحے سے مسرت کشید کر رہی ہے۔ کیا وہ جھوٹ بول رہی تھی، یا پھر قیدی پرندے کی طرح وہ بھی اپنے قفس سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ اسے سود و زیاں کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے کسی وقت مجھے بنکاک میں اپنے آخری لمحے یاد آ جاتے تھے۔ بنکاک ائرپورٹ پر ایک نامعلوم لڑکے نے مجھے سون کے تحائف پہنچانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ سون نے اپنے تحریری پیغام میں لکھا تھا کہ یہ تحائف اس نے جائز کمائی سے بھیجے ہیں، اس نے ایک مہربان کے لیے گائیڈ کے طور پر خدمات انجام دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ''مہربان'' میں ہی تھا۔

کسی وقت میرے ذہن میں آتا تھا کہ میں وہ تحائف لے ہی لیتا۔ تحائف کو ٹھکرا کر میں نے اس کی دل شکنی کی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے میری توقع سے زیادہ دکھ پہنچا ہو۔ دراصل میں اس وقت خود بھی دکھ کی کیفیت میں تھا۔ توہین آمیز دکھ کی یہ کیفیت اس دو راہے پر پیدا ہوئی تھی جب سون نے میری توقع کے بالکل برخلاف میری طرف سے منہ

پھیرا تھا۔ جب توقع کے بالکل برخلاف کوئی بات ہو جائے تو پھر دل و دماغ میں ہلچل تو ہوتی ہی ہے۔

پتا نہیں کیوں میرے ذہن میں شک تھا کہ جس وقت وہ نامعلوم لڑکا ائرپورٹ پر میرے پاس آیا تھا تو سون بھی آس پاس ہی کہیں موجود تھی۔ شاید وہ کسی کونے کھدرے میں سے مجھے اور اکمل کو دیکھ رہی تھی۔ میں سون کے حوالے سے اپنے خیالات کو ذہن سے بھلانے کی کوشش کرتا تھا اور خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کر لیتا تھا۔ والد صاحب کو دمہ کی شکایت تھی۔ سردی کی وجہ سے ان کی طبیعت ذرا بگڑی ہوئی تھی۔ چند روز کے لیے انہیں لہٰذا اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ وہ اسپتال سے فارغ ہو گئے تو میرے پاس پھر فرصت ہی فرصت تھی۔ ایم بی بی ایس فائنل کے نتائج آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میرا زیادہ وقت ٹی وی دیکھتے گزر رہا تھا۔ کسی وقت شام کو یار دوست آ جاتے اور ایک دو گھنٹے کے لیے گپ شپ ہو جاتی۔ میری بھابی شاہین کی بہن رخشندہ میری ہم عمر ہونے کے باوجود مجھ سے دو سال پہلے ڈاکٹر بن گئی تھی۔ اس کی وجہ میری بیماری تھی۔ میٹرک کے بعد فرسٹ ائیر میں [illegible] کا شکار ہوا تھا اور قریباً ڈیڑھ برس تک میری صحت زبردست پیچیدگیوں کا شکار رہی تھی۔ میرے جسم کے بال جھڑ گئے تھے۔ وزن خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا اور یہ کہا جائے [illegible] ہوگا کہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

میں رخشندہ کی بات کر رہا تھا۔ وہ ایک ہونہار ڈاکٹر تھی، خوش شکل اور خوش اخلاق بھی تھی۔ تاہم میرا نظریہ یہ تھا کہ وہ کچھ کھسکی ہوئی ہے۔ اس پر ہر وقت سماجی خدمت کا بھوت سوار رہتا تھا۔ سماجی خدمت کے بارے میں سوچنا کوئی قابل تنقید عمل نہیں لیکن چوبیس گھنٹے اس حوالے سے بات کرتے رہنا اور موقع محل دیکھے بغیر اپنے خیالات کو دوسرے پر Force کرنا ضرور غیر معمولی رویہ ہے۔ رخشی کا یہی رویہ اسے دوسروں سے ممتاز بھی کرتا تھا اور ''[illegible]ٹک'' بھی کرتا تھا۔ کسی کسی محفل میں تو وہ بالکل تنہا رہ جاتی تھی اور یار لوگ اس [illegible] کر گزر جاتے تھے لیکن وہ بھی اپنی ہٹ کی پکی تھی۔ پچھلے دو برسوں میں اس کے رویے میں شدت ہی آئی تھی۔ اس کی گفتگو میں پہلے سے زیادہ زور پیدا ہوا تھا اور اس کے خیالات پہلے سے زیادہ واشگاف ہوئے تھے۔ اب تو وہ اپنے نظریات کو بنیاد بنا [illegible] لکھنے بھی لگی تھی اور اس کے کالم کبھی کبھی اخبارات و رسائل میں نظر آتے

رخشی کا موضوع وہی تھا جسے میڈیکل کے شعبے میں سب سے گھسا پٹا موضوع سمجھا جاتا ہے۔ یعنی ڈاکٹر بننے کے بعد دکھی انسانیت کی خدمت کا عزم، اکثر میڈیکل اسٹوڈنٹ اپنے تعلیمی دور میں اس ''موضوع'' کو شدت سے رگڑے دیتے نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے دیہات میں طبی سہولتوں کے فقدان اور غریب طبقے کی حالت زار پر زوردار بحثیں کی جاتی ہیں۔ بلند بانگ ارادے باندھے جاتے ہیں، مستقبل کی زبردست پلاننگ کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو اس سلسلے میں چھوٹی موٹی تنظیمیں بھی بن جاتی ہیں...... لیکن نتیجہ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا...... ٹائیں ٹائیں فش...... وہی بے ڈھنگی چال جو پہلے تھی سو اب بھی رہتی ہے۔ وہی روزگار کے چکر۔ وہی شہری سہولتوں کی کشش۔ وہی بہتر ماحول کی تمنا، وہی ذاتی مجبوریاں، ڈاکٹر بننے کے بعد سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔ دیہات وہی دیہات رہتے ہیں۔ شہر وہی شہر رہتے ہیں۔ کچے گھروندے اور عالیشان کلینک کا فاصلہ ہر آنے والے دن میں کچھ اور بڑھ جاتا ہے...... لیکن سینکڑوں ہزاروں میں کوئی ایک آدھ ڈاکٹر ایسا بھی نکل آتا ہے جو اپنے زمانہ طالب علمی کے آدرشوں سے چمٹ جاتا ہے اور وہ سب کچھ کرنے پر تل جاتا ہے جو اس نے ماضی میں سوچا ہوتا ہے۔ ایسے ڈاکٹر کو اس کے کولیگ اور ساتھی ''خبطی'' کہتے ہیں۔ رخشی بھی ان میں سے ایک تھی۔

اس کو کہیں سے ایک جبار نام کا چوہدری ٹکر گیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ اس کا بھائی بنا ہوا ہے۔ رخشی نے اپنے اس چوہدری بھائی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ گاؤں گاؤں لیے پھرتی تھی۔ یہ چوہدری ایک کھاتا پیتا شخص تھا۔ اثر ورسوخ والا بھی تھا۔ وہ سماجی خدمت کے کاموں میں رخشی کی مدد کرتا تھا۔ رخشی اپنی ٹیم کے ساتھ دور دراز دیہات میں جاتی تھی۔ وہاں کے حالات کا جائزہ لیتی تھی اور پھر جس گاؤں کو موزوں سمجھتی تھی وہاں ایک کلینک کھول دیتی تھی۔ جس میں ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر یا اچھا کوالیفائیڈ کمپاؤنڈر خدمات انجام دیتا تھا۔

رخشی جب کبھی مجھ سے ملتی تھی چھوٹتے ساتھ ہی اپنے پسندیدہ موضوع پر آ جاتی تھی اور پھر اگلے ایک دو گھنٹے کے لیے مجھے صرف اپنے کان استعمال کرنا ہوتے تھے۔ رخشی کی ہمیشہ یہ خواہش رہتی تھی کہ میں اپنی مصروف زندگی میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس کے ساتھ دیہات میں جاؤں اور دیکھوں کہ وہاں وہ لوگ کس طرح دیہاتی لوگوں کو طبی سہولتیں فراہم کر رہے ہیں۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ رخشی کے بے حد اصرار کی وجہ سے میں نے

اس کی ٹیم کے ساتھ مضافاتی علاقے میں جانے کا ارادہ کر لیا مگر ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ در پیش ہو گیا پھر ایک بار ہمت کر کے میں رخشی کے ساتھ شیخوپورہ کے ایک گاؤں تک گیا بھی لیکن انہی دنوں موسلا دھار بارشیں شروع ہو گئیں، راستے بند ہو گئے اور ہم آگے جانے کے بجائے وہیں ایک نمبردار کی حویلی میں دو دن قید رہنے کے بعد لاہور واپس آ گئے۔ بہر حال ان واقعات کو اب قریباً ڈیڑھ سال گزر چکا تھا۔

والد صاحب کو شیخ زید اسپتال سے گھر آئے پانچواں چھٹا روز تھا، میں ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں مصروف تھا، رخشی ایک دھماکے سے وارد ہو گئی۔ اس نے زور سے دروازہ کھولا اور کمرے میں چلی آئی۔ ''ہیلو شاداب! کیسے ہو؟'' اس نے حسب معمول ہانک لگائی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور جواباً ہیلو کہا۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کے بال تراشیدہ تھے۔ وہ شلوار قمیض پہنتی تھی۔ پاؤں میں اکثر جوگرز ہوتے تھے۔ وہ میرے سامنے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔ ''سنا ہے کہ لمبا چوڑا سیر سپاٹا کر کے آئے ہو۔ تھائی لینڈ گئے ہوئے تھے۔ ساتھ میں وہ تمہارا چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا یار اکمل بھی تھا۔ ویسے یہ بات میں تمہیں بتا دوں۔ اس کی آنکھیں جتنی چھوٹی ہیں اتنی ہی تیز بھی ہیں۔ بالکل بردے کی طرح۔ خاص طور سے لڑکیوں کو تو ایسے دیکھتا ہے جیسے چھلنی کر دے گا۔ تمہارے لیے اس کی کمپنی زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''مشورے کا شکریہ! ویسے میں آپ کی وجہ نزول پوچھ سکتا ہوں۔ آپ تو غالباً پچھلے دو ماہ سے اپنے کسی دورے...... میرا مطلب ہے کہ طبی دورے پر تھیں۔''

''بالکل تھی...... اور یہ دورہ کافی کامیاب بھی رہا ہے۔ ہم نے تین دیہات میں نہ صرف طبی سہولتیں فراہم کی ہیں بلکہ انہیں برقرار رکھنے کا تسلی بخش انتظام بھی کیا ہے۔''

''اب آئندہ کے کیا ارادے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت نیک!'' وہ رسان سے بولی اور اس کے نہایت ہموار اور سفید دانت چمک اٹھے پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''اور تمہارے ارادے کیا ہیں؟'' اس کا لہجہ ذرا چبھتا ہوا تھا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''سنا ہے کہ بنکاک بہت رومانٹک شہر ہے۔ بلکہ شاید اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔''

"کہتے ہیں کہ شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے۔ بعض لوگ خشک ترین شہروں میں بھی رنگینیاں ڈھونڈ لیتے ہیں اور بعض بنکاک جیسے شہروں سے بھی ایک صوفیانہ تغافل کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔"

"اکمل جیسا بندہ ساتھ ہو تو صوفیانہ تغافل کچھ مشکل نہیں ہو جاتا؟"

"تم مجھ پر شک کر رہی ہو؟"

"نہیں کوئی شدید نوعیت کا شک تو نہیں ہے۔"

"تو کمزور نوعیت کا شک بتا دو۔"

"بھئی اتنے بڑے شہر میں کوئی حسین چہرہ تو نظر میں آیا ہی ہوگا۔ تھوڑی بہت گپ شپ ہوئی ہوگی۔ سنا ہے وہاں نائٹ کلب بھی بہت ہیں۔ ہر طرف خوبصورت شکاریوں نے جال بچھا رکھے ہوتے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے میری نگاہ تصور میں سون کا چہرہ چمک گیا۔ اس کی شفاف کلائی میں پھسلتا ہوا کنگن اور ساحل کی تیز ہوا میں اڑتے ہوئے ریشمی بال، ایک لمحے کے لیے میں بنکاک میں گیا اور اگلے ہی لمحے اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ میں نے اپنے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی رخشی سے کہا۔ "خوبصورت چہرے تو لاہور میں بھی بہت ہیں، اس کے لیے میرا بنکاک جانا ضروری نہیں تھا۔ میں صرف سیاحت کے لیے گیا تھا۔"

وہ مسکرائی اور اس کے ہموار دانت پھر چمکے۔ ذرا شوخ انداز میں بولی۔ "جہاں تک مجھ ناچیز کی معلومات ہیں، سیاحت کا لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سیاحت میں کسی علاقے کے قدرتی مناظر، رسم و رواج، کھانوں اور باشندوں کا مشاہدہ شامل ہوتا ہے۔ باشندوں کے مشاہدے کے سلسلے میں بھی بعض لوگ بڑے Choosy ہوتے ہیں اور "مخصوص" بندوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔"

وہ ہمیشہ بے باکی سے بات کرتی تھی مگر آج کچھ زیادہ ہی بے باکی دکھا رہی تھی۔ میں کوئی مناسب جواب ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ پھر بول اٹھی۔ "اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ میں مانتی ہوں کہ تم وہاں سیاحت کرنے ہی گئے تھے لیکن سیاحت کے حوالے سے تھوڑی سی توجہ اپنے ملک پر بھی فرمائیے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"یہاں بھی دیکھنے کو بہت کچھ ہے مسٹر شاداب! ایک دفعہ تو چلو میرے ساتھ۔ میں

تمہیں زندگی کا ایک اور رخ دکھاؤں۔ سچ کہتی ہوں دیکھ کر دم بخود نہ ہو جاؤ تو نام بدل دینا۔ پرسوں ہم سیالکوٹ کے ایک گاؤں جا رہے ہیں۔ بڑی زبردست سیر ہو جائے گی تمہاری۔ باجی کہہ رہی تھیں کہ آج کل تم فارغ بھی ہو۔ انکل کی طبیعت بھی اب بالکل ٹھیک ہے۔ میں ابھی انہیں چیک کر کے آ رہی ہوں۔ وہ بھی کہہ رہے تھے کہ شاداب ہر وقت کمرے میں گھسا رہتا ہے، اسے کھینچ تان کر باہر نکالو۔ تمہارے ساتھ تھوڑی سی آؤٹنگ کر آئے۔"

اس سے پہلے جب بھی رخشی نے اس موضوع پر بات کی تھی مجھے قائل نہیں کر سکی تھی لیکن اس مرتبہ نہ جانے کیوں اس کی بات میرے دل کو لگ رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں خود بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے ماحول سے فرار چاہتا تھا۔ تھائی لینڈ سے واپسی کے بعد سے جو قنوطیت اور اداسی مجھ پر طاری تھی اسے مصروفیت کے غبار میں اوجھل کرنا چاہتا تھا۔

میں نے جب رخشی کے ساتھ چلنے کی ہامی بھری تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔ شاید اسے بھی توقع نہیں تھی کہ میں مان جاؤں گا۔ وہ بھی بس اتمام حجت کے طور پر ہی دعوت دے رہی تھی۔

"اوہ شاداب! تم واقعی سنجیدہ ہو؟"

"یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، تم واقعی سنجیدہ ہو یا یونہی وقت گزاری کے لیے میرے کان کھا رہی تھیں۔"

"میں تو دو سال سے سنجیدہ ہوں بھئی، تم ہی چکنے گھڑے بنے ہوئے تھے۔ ویسے شاداب سچ کہتی ہوں تم انجوائے کرو گے۔ تھائی لینڈ کی سیر تو تم نے کی ہے، اب ذرا اپنے ملک میں بھی تھوڑا سا گھوم کر دیکھو۔"

❁❁❁

ہم گوجرانوالہ سے مشرق کی طرف پچیس تیس میل سفر کر چکے تھے۔ یہ گاؤں پسرور کے نواح میں کہیں واقع تھا۔ اس کا نام راج والی تھا۔ ہماری ٹیم میں ڈاکٹر رخشی کے علاوہ چوہدری جبار، اس کا ملازم فیقا...... ایک ڈاکٹر حمزہ اور ایک کمپاؤنڈر اشفاق شامل تھے۔ ہم نے پہلے چوہدری جبار کی جیپ پر سفر کیا۔ یہ جیپ کافی بڑی تھی تاہم کچے پکے راستوں پر سفر کر کر کے کھٹارا ہو چکی تھی۔ جہاں پختہ سڑک ختم ہوئی وہاں ایک سخت ناہموار کچا راستہ شروع ہو گیا۔ روہی نالے کے ساتھ ساتھ اس کچے راستے پر جیپ بہت آہستہ رفتار سے

ریگتی رہی راستے کے اختتام پر سفر اور بھی دشوار ہو گیا۔ دلدلی زمین اور گڑھوں کو عبور کرتے ہوئے ہم تقریباً دو میل مزید آگے گئے اور راج والی گاؤں پہنچے۔ اس وقت شام ہونے والی تھی۔ دیہاتی علاقے کی شدید سردی ہڈیوں میں گودا جما رہی تھی۔ گاؤں کا نمبردار خدا بخش ہمارے چوہدری جبار کو جانتا تھا۔ چوہدری جبار نے چند روز پہلے خدا بخش کو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ خط دے دی تھی۔ ہم راج والی پہنچے تو نمبردار کے گھر میں ہمارے قیام کا انتظام موجود تھا۔ طعام کا انتظام بھی فوراً شروع ہو گیا۔ جس کا اندازہ مرغیوں کی تین چار چیخوں سے ہوا۔ ہم اس حویلی نما مکان کے مردانے حصے میں ٹھہرے تھے جبکہ رخشی کا قیام گھر کی خواتین کے ساتھ تھا۔ رہائشی سہولتوں کے لحاظ سے یہ جگہ کسی طور بھی رخشی جیسی نرم و نازک لڑکی کی رہائش کے لائق نہیں تھی لیکن وہ بالکل مطمئن بلکہ خوش نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کو مکمل طور پر ان مشکلات کے سانچے میں ڈھال چکی ہے۔

چوہدری جبار کی شکل و شباہت چوہدریوں جیسی ہی تھی۔ اسے ایک جواں سال چوہدری کہا جا سکتا تھا۔ عمر بتیس سال کے قریب رہی ہو گی۔ قد ساڑھے چھ سے کچھ ہی کم ہو گا۔ گرانڈیل جسم، اوپر کو اٹھی ہوئی گھنی مونچھیں۔ جبڑے چوڑے اور مضبوط اسے دیکھ کر ایک کرخت دیہاتی کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ لیکن اس سے ملنے اور بات کرنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ انسان کی ظاہری شکل و شباہت اکثر دھوکا بھی دیتی ہے۔ چوہدری بڑے شائستہ انداز میں بات چیت کرتا تھا۔ جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے کی ساری سختی ایک دم خوشگوار نرمی میں ڈھل جاتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ یہ رخشی اور دیگر ڈاکٹروں کی صحبت کا نتیجہ تھا یا پھر چوہدری شروع سے ہی ایسا تھا۔

دیہاتی علاقے میں میرا آنا جانا بہت کم ہوا تھا۔ بچپن میں ایک دفعہ کسی میلے پر والد صاحب ہم بہن بھائیوں کو اپنے گاؤں لے کر گئے تھے۔ پھر جب میٹرک کے بعد میں شدید بیمار ہوا تھا، تبدیلی آب و ہوا کے لیے میں ننھیال گیا تھا۔ تاہم ننھیال کو بھی میں گاؤں نہیں کہہ سکتا وہ ایک درمیانے سائز کا قصبہ تھا۔ اب اپنے ہوش و حواس کے ساتھ مجھے پہلی بار ایک مکمل گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔

گاؤں میں قیام کے پہلے روز ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں زندگی شہروں سے بے حد مختلف اور انوکھی ہے۔ شاید رخشی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں حیران رہ جاؤں گا۔ اپنے قیام کا پہلا سارا دن میں نے چوہدری کے ملازم فیقے کے ہمراہ گاؤں کی سیر میں گزارا۔

رجوالی گاؤں کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کے نشیب و فراز تھے۔ یہ ہرگز پہاڑی علاقہ نہیں تھا، پھر بھی ایک کچے ٹیلے کی وجہ سے گاؤں کی ایک تہائی آبادی بلندی پر واقع تھی۔ اس بلندی کو "تھے" کہا جاتا تھا۔ تھے پر واقع مکانات بہت دور سے نظر آ جاتے تھے۔ راج والی گاؤں میں غربت اور پس ماندگی در و دیوار سے چپکی ہوئی نظر آتی تھی۔ لوگ بے حد سادہ دل اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔ یہاں مجھے کچھ میواتی لوگ بھی نظر آئے۔ گاؤں میں مجھے جاہلیت کا جو سب سے پہلا منظر دکھائی دیا، وہ قابل دید تھا۔ میں نے ایک سائیکل سوار فقیر کو دیکھا۔ فقیر جس نے نہایت میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے سائیکل کے ڈنڈے پر پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کی غلیظ پنڈلیاں ننگی تھیں اور ان پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سائیکل کا ہینڈل ایک دبلے پتلے نوجوان نے تھام رکھا تھا اور سائیکل کے ساتھ پیدل چلا آ رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ چند افراد نے لپک کر اس شخص کی قدم بوسی کی۔ اس شخص نے اپنی کیچ بھری آنکھیں کھول کر شانِ بے اعتنائی سے اپنے پاؤں چومنے والوں کی طرف دیکھا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گیا۔

میں نے فیقے سے پوچھا۔ "یہ کون ہے۔"

فیقا بولا۔ "ایسے لوگ یہاں ہر گاؤں، دیہہ اور قصبے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تعویذ گنڈا اور جھاڑ پھونک کرنے والا شخص ہے۔"

"گویا یہاں کا پیر ہے؟"

"پیر نہیں...... پیر کا خاص چیلا ہے۔ اب آپ سوچیں چیلے کے یہ ٹھکے ہیں تو پیر کے کیا ہوں گے۔"

"پیر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

فیقا بولا۔ "ابھی تو مجھے بھی ٹھیک سے پتا نہیں، لیکن آج کل میں اس کا دیدار ضرور ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی ہماری ڈاکٹر صاحبہ سے لڑنے جھگڑنے کے لیے پہنچ جائے۔ ہم جس گاؤں میں بھی جاتے ہیں وہاں سب سے زیادہ تکلیف ان جھاڑ پھونک کرنے والوں اور نیم حکیموں وغیرہ کو ہی ہوتی ہے۔"

شام کو گاؤں کے ایک زمین دار حاجی شمشاد کی طرف ہماری ٹیم کی دعوت تھی۔ حاجی شمشاد ایک ملنسار اور سمجھ دار زمین دار لگتا تھا۔ دیہاتی انداز کی یہ دعوت خاصی مزے دار تھی۔ دیسی گھی میں پکا ہوا دیسی مرغ، مکھن کے تڑکے والا ساگ، پراٹھے، گڑ کے باداموں

والے چاول اور کھیر وغیرہ۔

کھانے کے بعد بات چیت کا دور ہوا۔ رخشی نے دیہات میں طبی سہولتوں کی کمی کے بارے میں اپنا نظریہ بیان کیا۔ اس کا خیال تھا کہ دیہات میں بے شمار اموات صرف اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ بیمار لوگوں کو بروقت علاج کی سہولت نہیں ملتی۔

حاجی شمشاد صاحب بولے۔ ”آپ کی بات بھی ٹھیک ہے ڈاکٹرانی جی...... لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ شہروں میں ایک ایک گلی کے اندر دس دس ڈاکٹر دکانیں کھول کر بیٹھے ہیں۔ دیہاتی علاقوں کی طرف کوئی بھول کر بھی رخ نہیں کرتا۔“

رخشی نے کہا۔ ”حاجی صاحب! اس میں کچھ قصور ڈاکٹروں کا بھی ہے، مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ یہاں مشکلات کتنی ہیں۔ ایک ڈاکٹر اگر ہمت کرتا ہے اور شہری سہولتوں کو چھوڑ کر دور دراز گاؤں میں پہنچتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ قدم قدم پر اس بے چارے کا حوصلہ توڑا جاتا ہے۔ اس کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ یہاں کے جھاڑ پھونک کرنے والے اور نیم حکیم اسے ہر طرح سے بھگانے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اوقات تو ایسے ڈاکٹروں کو جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔“

”میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں ڈاکٹرنی جی...... لیکن ہر جگہ تو ایسا نہیں ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیے...... یہ ہمارا گاؤں ہے۔ یہاں آپ آئے ہیں۔ آپ کھلے دل سے کام کریں۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہاں کے لوگ کتنے قدر شناس ہیں۔ باقی جہاں تک ٹونے ٹوٹکے کرنے والوں اور نیم حکیموں کی بات ہے، آپ کو ان کے بارے میں اپنے دل کے اندر تھوڑی سی گنجائش پیدا کرنی چاہیے۔ اب آپ دیکھیں نا کہ بے شمار آبادی ایسی ہے جس کو ڈاکٹر نصیب نہیں ہے۔ وہاں یہی ٹونے ٹوٹکے کرنے والے اور نیم حکیم اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق لوگوں کو اپنے جال میں جکڑے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”میں نے سنا ہے کہ یہاں آپ کے گاؤں میں بھی ایک پیر صاحب ہیں اور لوگ ان پر بڑا اعتقاد رکھتے ہیں۔“ رخشی نے کہا۔

”بے شک پیر صاحب ہیں اور لوگ ان پر اعتقاد بھی رکھتے ہیں، لیکن آپ کو ان کی طرف سے کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ وہ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں پیر صاحب اپنا کام کرتے رہیں گے۔“

یوں تو حاجی صاحب نے فرما دیا تھا۔ کہ ہم اپنا کام کرتے رہیں، پیر صاحب اپنا کام

کرتے رہیں گے لیکن عملاً ایسا ہو نہیں سکا۔ اگلے دو روز میں ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ ہماری ٹیم کے یہاں آنے سے پیر صاحب کی دم پر پاؤں آیا ہوا ہے اور وہ بری طرح لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ یہ پیر صاحب خاصے کیم شحیم تھے۔ میں نے انہیں گاؤں کے کوئیں پر دیکھا جہاں وہ منہ ہاتھ دھو رہے تھے۔ تین چار مرید ان کے ارد گرد مودب کھڑے تھے۔ ایک نے تولیہ پکڑ رکھا تھا دوسرے نے صابن تیسرا پیر صاحب کا عصا لیے کھڑا تھا۔ یہ عصا نما لاٹھی کافی موٹی تھی۔ اس پر چمک دار میخیں لگی ہوئی تھیں۔ بالائی سرے پر گھنگرو سے بندھے ہوئے تھے۔ پیر صاحب کو یہاں وڈے سائیں کہا جاتا تھا۔ وڈے سائیں کی مونچھیں گھنی تھیں، داڑھی کا پھیلاؤ چہرے کے مطابق کافی زیادہ تھا۔ وڈے سائیں کی آنکھیں گہری سرخ تھیں، جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ سرخی بھنگ کے نشے کی وجہ سے تھی۔ ایک موٹی گودڑی جس میں سینکڑوں رنگ برنگے پیوند لگے تھے وڈے سائیں نے اوڑھ رکھی تھی۔

وڈا سائیں مجھ سے پندرہ بیس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس نے میری طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھا اور پھر بڑبڑانے والے انداز میں اپنے مریدوں سے کچھ کہا۔ چوہدری جبار اس وقت میرے ساتھ تھا۔ طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں دیکھ کر وڈے سائیں کا دل باغ باغ ہو گیا ہے۔ اس کے بس میں ہو تو خوشی سے ناچنا شروع کر دے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے دیکھنے کے انداز سے تو واقعی یہی لگتا ہے۔“

چوہدری جبار بولا۔ ”یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ پچھلے دو برسوں میں ہم درجنوں دیہات میں گئے ہیں ڈاکٹر صاحب...... قریباً ہر دیہہ میں ہمیں کوئی نہ کوئی وڈا سائیں ضرور ملا ہے اور ہمارے پہنچنے سے اس کو اتنی ہی خوشی ہوئی ہے جتنی اس خبیث کو ہو رہی ہے۔“

”نہیں جبار صاحب! آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہئے ہو سکتا ہے کہ یہ پیر صاحب ایسے نہ ہوں جیسے آپ سمجھ رہے ہیں۔“

”چھوڑیں ڈاکٹر صاحب! اس معاملے میں میرا تجربہ آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ اپنی چھوٹی بہن (رخشندہ) کے ساتھ رہ کر میں نے اس بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے۔ پھر اس بارے میں میرا ذاتی تجربہ بھی تو ہے نا۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے چوہدری جبار کے لہجے میں درد کی ایک لہری دوڑ گئی۔ یوں

محسوس ہوا جیسے ایک دم اس کے گلے میں آنسو بھر گئے ہیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”لگتا ہے آپ کو کوئی پرانی بات یاد آ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں کوئی زیادہ پرانی بھی نہیں۔ بس سمجھیں کہ ابھی تو زخموں سے خون بہہ رہا ہے۔“

مجھے اور چوہدری جبار کو ایک ہی کمرا ملا تھا۔ رات کو لحاف میں گھسنے کے بعد میں نے چوہدری جبار کو تھوڑا سا کریدا تو اس نے اپنی روداد سنا دی۔ چوہدری جبار کو دو تین سال پہلے زبردست شاک لگا تھا۔ اس کی جواں سال بیوی اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے موقع پر ہلاک ہو گئی تھی۔ اس کا نام زرینہ تھا۔ جبار کے بٹوے میں اس کی تصویر بھی موجود تھی۔ وہ خوش اندام خوبصورت لڑکی تھی۔ سرتاپا ایک دیہاتی مٹیار، میاں بیوی میں بڑی محبت تھی۔ شادی کے بعد زرینہ دو برسوں میں بس دو تین رات کے لیے ہی میکے میں رہی ہو گی۔ دونوں ایک دوجے کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ جب جبار کے پہلے بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو گاؤں کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بڑی تیز طرار عورت تھی۔ عورتوں کو زچگی کے مرحلے سے گزارنے کے علاوہ وہ حکمت گری بھی کرتی تھی۔ ماں کے پیٹ میں بچے کی پوزیشن نارمل نہیں تھی۔ یہ سراسر اسپتال کا کیس تھا۔ لیکن دائی رکھی پیسوں کے لالچ میں خود ہی کوشش کرتی رہی۔ نیم کے پتے، دیسی گھی، ہلدی، اپلوں کی راکھ پتا نہیں کیا کچھ اس نے منگوایا اور جبار بھاگ بھاگ کر یہ چیزیں لاتا رہا۔ بچے کی پیدائش میں تاخیر ہوتی گئی اور بدنصیب زرینہ درد سے تڑپتی رہی۔ جبار نے کئی بار دائی رکھی سے پوچھا کہ اگر معاملہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تو وہ لوگ اسے ٹریکٹر ٹرالی پر اسپتال لے جاتے ہیں لیکن رکھی انہیں مسلسل تسلیاں دیتی رہی۔ رکھی کی بڑی بہن بھی دایہ گری کرتی تھی۔ رکھی نے شام سے کچھ دیر پہلے اسے بھی بلا لیا۔ دونوں بہنوں نے ٹونے ٹوٹکوں میں مزید دو تین گھنٹے ضائع کر دیئے۔ جب سب کچھ ان کے بس سے باہر ہو گیا تو انہوں نے جبار سے کہا کہ جتنی جلدی ہو سکے بیوی کو اسپتال لے جاؤ۔

جبار سٹپٹا گیا۔ یہ کام اگر دن کے وقت ہو جاتا تو آسان تھا۔ اب سخت اندھیرے اور گہری دھند میں مرکز صحت یا تحصیل کے اسپتال تک کا سفر آسان نہیں تھا۔ لیکن سفر کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ زرینہ کو چارپائی پر ڈال کر ٹریکٹر ٹرالی میں رکھا گیا اور وہ لوگ بلا کی سرد میں مرکز صحت کی طرف روانہ ہوئے۔ قریب ترین مرکز صحت بھی وہاں سے چھ سات میل کی مسافت پر تھا۔ گہری تاریکی اور ناکافی روشنی میں یہ فاصلہ انہوں نے دو گھنٹے میں طے

کیا۔ اس دوران میں جبار اپنی قریب المرگ بیوی کا سر گود میں رکھے بیٹھا رہا، اسے تسلیاں دیتا رہا۔ مرکز صحت میں پہنچ کر ان کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ لیڈی ڈاکٹر وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ ڈاکٹر تھا لیکن وہ بھی کلینک سے قریباً دو میل دور اپنے گھر میں سو رہا تھا۔ کلینک میں موجود ایک ادھیڑ عمر کمپاؤنڈر نے زرینہ کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی اور جبار سے کہا کہ اس کی بیوی کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ بچہ پیٹ میں مر چکا ہے اور پیٹ میں خون بھی بھرتا جا رہا ہے۔ اگر ایک آدھ گھنٹے میں یہ تحصیل اسپتال نہ پہنچ سکی تو بچے گی نہیں۔

جبار نے زرینہ کی چارپائی ٹرالی میں رکھوائی اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے تاریکی میں حتی الامکان رفتار سے ٹریکٹر کو تحصیل اسپتال کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ابھی وہ اسپتال سے تین چار میل دور ہی تھے کہ ٹرالی میں موجود جبار کی والدہ اور بہن نے رونا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ جبار سے کہہ رہی تھیں کہ وہ تیز چلائے۔ جبار نے بدحواسی میں رفتار اور بڑھا دی۔ وہ لمحے اس کی زندگی کے بدترین لمحے تھے۔ ایک موڑ پر ٹریکٹر کچے راستے سے اچھل کر کھیت میں اتر گیا اور ٹرالی سمیت الٹ گیا۔ زرینہ پانی لگے کھیت کے کیچڑ میں گری تھی۔ وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب اس نے آخری ہچکی لی اس کا سر جبار کی گود میں تھا۔

زرینہ کی موت کے بعد کئی ماہ تک جبار پاگلوں کی طرح رہا۔ اسے کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں تھا پھر وہ سخت بیمار پڑ گیا۔ اسے یرقان ہو گیا تھا۔ اس کے لواحقین اسے علاج معالجے کے لیے لاہور لے گئے۔ یہاں وہ کوئی چھ ماہ تک زیر علاج رہا۔ لاہور ہی میں اس کی ملاقات ڈاکٹر رخشی سے ہوئی۔ اس وقت تک رخشی دیہات میں طبی مرکز بنانے کا کام شروع کر چکی تھی۔ رخشی نے چوہدری جبار کے اندر پھر سے جینے کا حوصلہ پیدا کیا۔ اس نے جبار کو بتایا کہ اپنی محبوب بیوی کو یاد رکھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کسی اور جبار کو اپنی زرینہ سے جدائی برداشت نہ کرنی پڑے۔ جو بے شمار جانیں طبی سہولتوں کے نہ ہونے سے موت کے کنارے پر پہنچ جاتی ہیں وہ زندگی کی طرف لوٹ سکیں۔ رخشی نے جبار کو تفصیل سے اپنے پروگرام اور اپنے عملی اقدام کے بارے میں بتایا۔ دھیرے دھیرے جبار کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب اس کے اپنے ہی دل کی آواز ہے۔ یہ آواز اس کے دل کے کسی تاریک گوشے میں چھپی ہوئی تھی اور اب

ڈاکٹر رخشندہ کی آواز کی لہروں پر سوار ہو کر اس کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنا تن من دھن اس کام پر لگا دے گا اور ہر قدم پر ڈاکٹر رخشندہ کا ساتھ دے گا۔

اب پچھلے قریباً ڈیڑھ برس سے ان دونوں کا ساتھ تھا۔ وہ بڑی ہمت کے ساتھ ڈاکٹر رخشندہ اور ڈاکٹر حمزہ وغیرہ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ہماری باتوں کے دوران میں ہی رخشی بھی وہاں آ گئی۔ وہ سخت سردی اور ناکافی سہولتوں کے باوجود بھی بالکل چوکس نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی بھی تھی۔ بچی خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی رخشی ہم سے باتیں کرنے لگی۔ وہ بولی۔ "یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم کی کمی ہے...... جاہل شخص جو عقیدہ ایک بار بنا لیتا ہے پھر اس سے ہٹنا اس کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عقیدے کو غلط ثابت ہوتے دیکھتا ہے پھر بھی عقیدے سے منہ پھیرنے کے بجائے حقیقت سے منہ پھیر لیتا ہے۔"

وہ بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "یہ ایک طرح سے اس گاؤں میں ہمارا پہلا کیس ہے۔ آج سے قریباً چھ مہینے پہلے اس بچی کی بڑی بہن دماغ کی رسولی کا شکار ہو کر جاں بحق ہوئی ہے۔ اس کا باپ ایک سال تک مقامی پیر وڈے سائیں کا علاج کراتا رہا اس کے علاوہ وہ دوسرے نوسر بازوں کے پاس بھی بھاگا بھاگا پھرتا رہا مگر بچی کی طبیعت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ ان کی برادری میں ایک پڑھا لکھا شخص تھا۔ اس نے بہت زور لگایا کہ بچی کا باپ اسے لاہور لے جا کر علاج کروائے لیکن اسے وڈے سائیں پر اندھا اعتماد تھا۔ وڈا سائیں دماغ کی رسولی کا علاج معمولی ٹونے ٹوٹکوں سے کرتا رہا۔ جب بچی آخری اسٹیج پر آ گئی تو اسے لاہور پہنچایا گیا جہاں وہ سروسز اسپتال میں دم توڑ گئی۔ خیر یہ تو ایک واقعہ تھا اور ایسے واقعات ان علاقوں میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اب حیرانی اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس دوسری بچی میں بھی وہی ساری علامتیں ظاہر ہوئی ہیں جو پہلی بچی میں تھیں۔ سر درد کی شکایت، بہکی بہکی باتیں کرنا، ڈرنا وغیرہ...... سب کچھ وہی ہے کیونکہ مرض بھی وہی ہے بچی کے برین میں ٹیومر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر بچی کو ابھی لاہور پہنچا دیا جائے اور جنرل اسپتال میں اس کی سرجری ہو جائے تو نوے فیصد امکان ہے کہ وہ تندرست ہو جائے گی، لیکن بچی کا جاہل باپ ایک بار پھر پرانی رٹ لگا رہا ہے۔ اس کے منہ میں پہلے کی طرح وڈے سائیں کی زبان ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ بچی پر سایہ ہے۔ ڈاکٹروں نے کچھ کرنا ورنا نہیں جو کچھ کرنا ہے سائیں جی نے کرنا ہے۔"

میں نے پھول سی بچی کو دیکھا۔ اس کی عمر بمشکل چھ سال رہی ہو گی۔ پہلی بار درد کی ایک لہری میرے سینے میں اٹھی۔ بچی خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھ رہی تھی اور ریوڑیاں چبا رہی تھی۔ رخشی نے جو باتیں کی تھیں ان میں زیادہ تر انگلش کے الفاظ استعمال ہوئے تھے۔ لہٰذا اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

رخشی نے کہا۔ "شادا ایسی کہانیاں یہاں عام بکھری ہوئی ہیں۔ بندہ جب گہرائی سے ان کہانیوں کو دیکھتا ہے تو اپنے جذبات پر کنٹرول نہیں رکھ سکتا۔ اس کا تن من دکھ سے بھر جاتا ہے۔"

اگلے دو روز میں چوہدری جبار اور رخشی نے کلینک کے لیے جگہ ڈھونڈ لی ابتدائی طور پر اس نے نمبر دار کی حویلی کی بیٹھک میں ہی مریضوں کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ہم بیشتر دوائیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ یہ دوائیں مفت یا بہت کم قیمت پر مستحق لوگوں کو دی جا رہی تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ رخشی کے لیے لوگوں کی نگاہوں میں عزت و احترام کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ خاص طور سے عورتیں اس کی طرف متوجہ ہو رہی تھیں۔ باجی جی...... باجی جی کہتے ان کا منہ نہیں سوکھتا تھا۔ دوسری طرف وڈا سائیں بھی بس کھول رہا تھا۔ ابھی تک اس نے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس کے چیلے چانٹے حسب توقع دبی دبی زبان میں پروپیگنڈا کرنے لگے تھے۔ وہ ڈاکٹری دواؤں کو نشہ آور قرار دے رہے تھے اور اس بات کو غیر اسلامی کہہ رہے تھے کہ عورتیں، مرد ڈاکٹر کے سامنے جائیں اور اسے اپنی صحت کے بارے میں بتائیں۔ (وڈا سائیں ان پابندیوں سے آزاد تھا عورتیں کھلم کھلا اس کے پاس جاتی تھیں اور اس سے ننگی گالیاں بھی سنتی تھیں۔ راز و نیاز کی بات کہنے کے لیے وہ اس سے اکیلے میں بھی مل لیتی تھیں) بہر حال رخشی اور جبار چونکہ نمبر دار کے مہمان تھے لہٰذا کسی کو ابھی تک کھل کر مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

رخشی میرا بے حد خیال رکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس کی ٹیم میں نیا ہوں اور پہلی بار اس ماحول میں پہنچا ہوں۔ سردی بھی توقع سے زیادہ تھی۔ اس نے جبار کے ملازم فیجے کو میرے لیے اسپیشل لاہور بھیجا اور اسے ایک مشہور کمپنی کے سویٹر کا نمبر اور سائز وغیرہ لکھ کے دیا۔ شام تک یہ سویٹر گاؤں پہنچ گیا۔ زبردست سویٹر تھا۔ مجھے اچھا بھی لگا۔ رخشی تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ "کسی وقت ہم تمہیں بچھڑ کہا کرتے تھے اور اب تو تم......"

"ایک اسمارٹ سی ممی بن گئے ہو۔" میں نے اس کا ادھورا فقرہ مکمل کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وہ زیادہ ہنستی نہیں تھی لیکن جب ہنستی تھی تو لگتا تھا کہ اس کا پورا جسم ہنس رہا ہے۔ خاص طور سے اس کی آنکھیں، میں جب تک اس گاؤں میں نہیں آیا تھا اسے خبطی سمجھتا تھا۔ لیکن یہاں رخشی کی مصروفیات دیکھ کر اور لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے پرورش پانے والا احترام دیکھ کر مجھے اپنی رائے بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

رخشی نے ہاتھ بڑھا کر سویٹر کی چنٹیں وغیرہ درست کیں۔ مجھے گھما کر دیکھا اور جیسے بالکل غیر ارادی طور پر اپنی انگلیوں سے میرے بال بھی درست کر دیے۔ یہ کارروائی کرنے کے بعد یک لخت اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ "اچھا لگ رہا ہے۔" اس نے مختصر الفاظ میں تعریف کی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

ایسا کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رخشی کا جھکاؤ میری جانب ہے وہ اکثر باتوں میں اپنے اس جھکاؤ کا اظہار بھی کر دیا کرتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بڑے غیر محسوس طریقے سے ہوتا تھا اور شائستگی سے ہوتا تھا۔ رخشی میں کافی خوبیاں تھیں۔ میں بھی اسے برا ہرگز نہیں سمجھتا تھا، لیکن اس کے حوالے سے ابھی تک کوئی "خاص" جذبہ بھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جب بہت دنوں تک اس سے ملاقات نہیں ہوتی تھی تو ایک خلا سا محسوس ہونے لگتا تھا۔

یہ گاؤں میں ہمارے قیام کے چوتھے روز کا واقعہ تھا۔ صبح سویرے جب میں نمبردار کے ملازموں کو بھینس کا دودھ دوہتے دیکھ رہا تھا۔ چوہدری جبار میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ کہنے لگا۔ "گھوڑے کی سیر کرو گے ڈاکٹر صاحب؟"

میں نے کہا۔ "بس آپ کے ساتھ چل پڑے ہیں۔ جو کچھ آپ کرائیں گے کرتے جائیں گے۔"

وہ بولا۔ "یہاں سے پانچ چھ میل دور اپنا ایک پرانا یار ہے۔ اسکول سے ہم اکٹھے بھاگتے تھے پھر اکٹھے ہی نکالے گئے تھے ساتویں جماعت میں...... کافی عرصے سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ سوچا ہے کہ اتنی دور آئے ہیں تو اس کا دیدار ہی کر لیں۔"

"تو کیا اس کی طرف گھوڑوں پر جانا ضروری ہے؟"

"نہیں جیپ پر جائیں گے تو بھی وہ ہمیں خوش آمدید ہی کہے گا لیکن اس کے بعد ہمیں

جیپ دوسری لینا پڑے گی۔ راستہ خراب ہے اور جیپ کے لائق تو بالکل بھی نہیں۔"

اس روز پہلی بار مجھے گھوڑے کی اتنی طویل سواری کا تجربہ ہوا۔ مزہ تو آیا لیکن تھکاوٹ بھی خوب ہوئی۔ ہم جس "باغ پور" نام کے گاؤں میں پہنچے وہ راجوالی سے بھی گیا گزرا تھا۔ یہاں بجلی بھی نہیں تھی۔ وہی پرانی طرز کے کنویں اور خراس تھے جو آج سے ہزاروں سال پہلے بھی موہنجوداڑو وغیرہ میں استعمال ہوتے تھے۔ چوہدری جبار کے دوست اسلم نے ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ اس کے بے حد اصرار پر ہمیں باغ پور میں رات رہنا پڑا۔ چوہدری جبار تو شلوار قمیض میں تھا لیکن میں نے پتلون جرسی وغیرہ پہنی ہوئی تھی۔ رات کو سونے کے لیے جبار کے دوست نے مجھے بھی شلوار قمیض دی۔ صبح اٹھ کر ہم نے چادروں کی بکلیں ماریں اور سیر کو نکل گئے۔ کیکر کی مسواکیں کرتے ہوئے ہم باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ باتوں باتوں میں اسلم نے بتایا کہ اس کے چھوٹے بھائی کا بیٹا سخت بیمار ہے اسے دورہ سا پڑتا ہے، ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں، منہ سے جھاگ آنے لگتی ہے، بس یہی لگتا ہے کہ ختم ہونے لگا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کوئی دوا وغیرہ کروا رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "یہاں دوا کہاں جی! یہاں تو بس دعا ہی ہو سکتی ہے پھر بیماری بھی ایسی ہے کہ اس میں دوا نے کیا کام کرنا ہے۔ پرسوں ایک "اللہ والے" کو بلایا تھا اس نے کہا تھا کہ ایک دو دن بعد آؤں گا۔"

اسلم نے جو علامتیں بتائی تھیں ان سے مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ یہ مرگی کا کیس ہے۔ بہر حال حتمی فیصلہ مریض کو دیکھ کر اور ٹیسٹ وغیرہ لے کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم اس لڑکے کو دیکھنے چلے گئے۔ لڑکے کی عمر [illegible] چودہ سال کے قریب تھی۔ وہ بھلا چنگا نظر آ رہا تھا۔ چوہدری جبار نے اسلم سے درخواست کی تھی کہ گھر والوں کو میرے ڈاکٹر ہونے کا پتا نہ چلے۔ ویسے بھی میں شلوار قمیض اور گرم چادر میں تھا۔ سفر اور گرد و غبار کی وجہ سے حلیہ بھی ابتر ہو رہا تھا۔ اسلم گھر والوں کو بتا بھی دیتا تو شاید انہیں میرے ڈاکٹر ہونے کا یقین نہ آتا۔

میں دیہاتی لب و لہجے میں لڑکے سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ لڑکا اپنے کبوتر دیکھنے باہر چلا گیا تو میں نے اس کی ماں سے گفتگو کی۔ ماں بے چاری سادہ سی عورت تھی اور بے حد پریشان تھی۔ اس کے چار بچے تھے اور یہ اکلوتا بیٹا تھا۔ جب لڑکے کو دورہ پڑتا

تھا تو وہ خود بھی مرنے والی ہو جاتی تھی۔ والدین کو پختہ یقین تھا کہ بچے پر سایہ ہے۔ ماں بتا رہی تھی کہ اسے رات کو چھت پر کسی کے چلنے کی آوازیں آتی ہیں اور گھر کے دروازے خود بخود بند ہونے اور کھلنے لگتے ہیں۔ عورت کی باتوں سے مجھے واضح طور پر اندازہ ہو رہا تھا کہ بچے کی بیماری کے سبب وہ مختلف واہموں کا شکار ہے۔ ہم نے عورت سے اس ''اللہ والے'' کے بارے میں بھی پوچھا جو لڑکے کو دیکھ کر گیا تھا۔ عورت نے بڑے یقین اور حیرت انگیز بھروسے کے ساتھ کہا۔ ''پیر جی کہتے تھے کہ اس پر جنوں کا اثر ہے۔ جنوں کا بڑا سردار اپنے کسی کام سے بغداد گیا ہوا ہے۔ اس کے ماتحتوں سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، میں اسی سے بات کروں گا، وہ ایک دو دن تک واپس آ جائے گا۔''

عورت کی باتیں سن سن کر میں حیران ہو رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ لوگ اس قدر سادہ لوح بھی ہوتے ہیں۔ ایک خوشگوار اتفاق یہ ہوا کہ قریباً آدھ گھنٹے بعد ہماری موجودگی میں ہی وہ پیر صاحب وہاں تشریف لے آئے۔ میں انہیں دیکھ کر تھوڑا سا چونکا۔ یہ ننگی پنڈلیوں والا وہی غلیظ سا بندہ تھا جسے میں نے سائیکل کے ڈنڈے پر تشریف فرما دیکھا تھا، دیہاتی جھک جھک کر اس کے پاؤں چوم رہے تھے۔ (پتہ چلا تھا کہ یہ وڈے سائیں کا چیلا ہے۔ میں اور فیقے نے اسے دیکھا تھا لیکن اس نے ہمیں نہیں دیکھا تھا) آج یہ خاص چیلا بڑی اکڑفوں کے ساتھ یہاں موجود تھا۔

لڑکے کی ماں نے بڑے احترام کے ساتھ پیر صاحب کو رنگین پایوں والی کرسی پر بٹھایا پھر پیر صاحب کو دودھ کا گلاس پیش کیا گیا۔ میں اور چوہدری جبار ایک طرف خاموش بیٹھ کر یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ لڑکے کی ماں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''پیر جی! میرے بچے کا کیا بنے گا؟''

پیر جی نے نیم باز آنکھوں سے جواں سال عورت کے سراپے کو گھورا پھر گمبھیر آواز میں بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ بڑا سردار واپس آ گیا ہے۔ میں نے اسے یہاں بلایا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔ آج میں اس سے بات کر کے ہی جاؤں گا۔''

عورت نے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو کر پیر جی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ لڑکے کے باپ نے مسکین لہجے میں کہا۔ ''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیں، ہم ابھی حاضر کر دیتے ہیں۔''

پیر صاحب بولے۔ ''اس میں خرچہ تو کافی آتا ہے۔ بہر حال میں تم لوگوں پر زیادہ

بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ تم ایک تولہ خالص سونے کا انتظام کر لو یا اس کے برابر رقم ہو۔ رقم ہی ہو جائے تو اچھا ہے کیونکہ سونا اکثر خالص نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ دو کلو برفی لے آؤ اور کوکا کولا یا پیپسی کی ایک بڑی بوتل۔''

لڑکے کے باپ نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''باقی چیزوں کا انتظام تو ہو جاتا ہے۔ جی...... لیکن پیپسی کی بوتل...... ادھر سے تو نہیں ملے گی۔ اگر آپ کہیں تو تندپور سے پتا کر لیں۔''

''پتا نہیں کرنا۔ بوتل لے کر آنی ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔ خود جاؤ یا کسی کو بھیجو۔'' پیر جی [illegible] لہجے سے کہا۔

پیر جی کی باتوں سے پتا چلا کہ دو کلو برفی اور پیپسی کی بڑی بوتل جنوں کے سردار کے لیے منگوائی جا رہی ہے۔ یہ باتیں اتنی سنجیدگی سے ہو رہی تھیں کہ سن سن کر حیرانی ہوتی تھی۔ الو بننے والے کی عقل پر حیرت ہو رہی تھی اور الو بنانے والے کی عقل پر بھی۔

پیر جی نے بڑی متانت سے کہا۔ ''ایک کمرا خالی کر دو۔ وہاں میں سردار سے بات کروں گا۔''

عورت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کیا سردار جی خود یہاں آئیں گے؟''

''ہاں ہاں خود آئیں گے۔ اگر دیکھنا چاہو تو دیکھ بھی لینا۔''

عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''کیا میں اسے دیکھ سکوں گی؟''

''بالکل دیکھ سکو گی۔ اب جاؤ ایک تولہ خالص سونا لے آؤ یا رقم لے آؤ۔''

عورت بڑی نیاز مندی کے ساتھ جھک کر اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔ مریض لڑکا آ کر پیر جی کے پاس بیٹھ گیا۔ پیر نے لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں وہ ایک دو بار ہم پر بھی شک کی نظر ڈال چکا تھا۔ بہر حال اس نے ہم سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ ہم لڑکے کی تیمارداری کے لیے آئے ہوئے رشتہ دار ہیں۔

قریباً ایک گھنٹے بعد لڑکے کا باپ برفی اور پیپسی کی ایک لیٹر والی بوتل ڈھونڈ لایا۔ پیر جی بوتل لے کر کمرے کے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد کمرے میں سے بلند لہجے میں باتوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اگلے بیس پچیس منٹ یہ صورتحال برقرار رہی۔ لڑکے کے والدین کمرے سے باہر خشک ہونٹوں کے ساتھ دعائیں مانگنے میں مصروف تھے۔ بالآخر پیر

جی باہر نکلے۔ بڑے تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے باہر آ کر اعلان فرمایا کہ جنات کے سردار صاحب سے بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کسی ایک جن کا کام نہیں بلکہ جنوں کا پورا ایک قبیلہ لڑکے کے پیچھے ہے۔ لڑکے کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی گستاخی ہوئی ہے جس کی وجہ سے وہ پیچھے پڑ گئے ہیں۔ بہر حال اب سردار جی نے انہیں سمجھا دیا ہے اور ان کی طرف سے ضمانت بھی دی ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔"

لڑکے کی والدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "پیر جی! آپ نے کہا تھا کہ آپ سردار جن کو دکھائیں گے۔"

"ہاں دیکھ لو۔ ابھی وہ ادھر کمرے میں ہی بیٹھا ہے۔" پیر جی نے کہا۔

لڑکے کی والدہ اور والد پیر جی کے پیچھے پیچھے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں بھی تجسس سے مجبور ہو کر ان کے عقب میں چل دیا۔ پیر جی نے میاں بیوی کو سمجھایا۔ "جا کر انہیں سلام کہنا، وہ ناراض ہو گئے تو بڑی مصیبت ہو جائے گی۔"

میاں بیوی نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ ڈر کی وجہ سے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جو فراڈ کا شکار ہو رہے تھے، ان کی عقل پر رونا آ ہی رہا تھا، جو فراڈ کر رہا تھا اس کی عقل کا بھی ماتم کرنے کو دل چاہتا تھا۔ پاگل خانے! اگر تو نے ڈراما ہی کرنا ہے تو کوئی جان دار ڈراما کر...... جن کو برفی کھلا کر پیپسی پلا رہا ہے۔ بہر حال ہم بند کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچے۔ پیر جی نے بڑا سسپنس پیدا کرنے کے بعد تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ اندر کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ سامنے پلنگ پر کوئی بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ میاں بیوی نے بیک زبان "السلام علیکم" کہا۔ وہاں سے جواب کیا آنا تھا؟ پلنگ پر دراصل ایک بڑا تکیہ رکھ کر اس کے گرد لحاف لپیٹ دیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی لحاف لپیٹے بیٹھا ہو۔ اس کے سامنے پیپسی کی بڑی بوتل خالی پڑی تھی۔

جنات کے سردار کی بس ایک جھلک دکھانے کے بعد پیر جی نے دروازہ بند کر دیا۔ واپس مڑے تو ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ ان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے صرف لڑکے کے والدین کو "جن" کی زیارت کے لیے بلایا تھا، میں خوامخواہ شامل ہو گیا تھا۔ انہوں نے منہ میں کچھ بڑبڑا کر اپنی ناراضی کا اظہار فرمایا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انہوں نے جاتے جاتے لڑکے کیلیے ایک چھوٹا سا تعویذ لکھ کر دیا۔ حکم صادر فرمایا کہ اس تعویذ کو کسی صندوق کے اندر کپڑوں میں تہ میں رکھو۔ اس تعویذ کا مقصد

یہی تھا کہ کاغذ کی مختصر پرچی کپڑوں میں کہیں گم ہو جائے گی اور اگر لڑکے کو پھر دورہ وغیرہ پڑا تو اس کے لیے پیر جی کے پاس جواز ہو گا۔ وہ الٹا اہل خانہ کو ڈانٹیں گے کہ تعویذ گم ہو جانے کی وجہ سے کام خراب ہوا ہے۔

پیر جی رخصت ہونے لگے تو ایک دلچسپ صورتحال سامنے آئی۔ پیر جی کے پاس ایک تھیلا سا تھا۔ لڑکے کے والد نے احتراماً پیر جی کا تھیلا تھامنے کی کوشش کی۔ انہوں نے فوراً اسے پیچھے ہٹا دیا۔ وجہ ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ کم از کم میرے لیے تو ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ پیر جی کا تھیلا لڑکے کے والد نے آتے وقت بھی اٹھایا تھا۔ اس تھیلے کا وزن جاتے وقت وہ نہیں تھا جو آتے وقت تھا۔ اس میں دو کلو برفی کے علاوہ غالباً پیپسی کی وہ بوتل بھی موجود تھی جو پیر جی کے بقول جن نے پی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق پیر جی نے وہ ایک لیٹر مشروب بھی شاپر وغیرہ میں ڈال کر تھیلے میں رکھا ہوا تھا۔

پیر جی کی حرکتیں اور اہل خانہ کی سادہ لوحی دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔ اب رخشی کا کام اور کام کی اہمیت بڑی اچھی طرح میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات بمشکل قابو رکھا اور کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ مریض لڑکے کو مرگی کی شکایت ہے۔

راجوالی گاؤں واپس آ کر میں نے رخشی کو ساری صورتحال بتائی۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ "باغ پور" اور گرد و نواح کے علاقے میں وڈے سائیں کا چیلا سرگرم عمل ہے جسے پیر کہا جاتا ہے۔ رخشی بولی۔ "ہمارے ملک کے تقریباً سارے ہی دیہی علاقوں میں ان لوگوں کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط ہیں۔ یہ لوگ عوام الناس کو ورغلانے اور بھٹکانے کے لیے ایسے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ عموماً علاقے کے بااثر لوگ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہ بااثر لوگ ان نیم حکیموں اور شعبدہ بازوں سے کئی طرح کے فائدے حاصل کرتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کی آمدنی میں سے باقاعدہ حصہ بھی لیتے ہیں۔ اپنی دھاک بٹھانے کے لیے یہ اتائی معالج مختلف ڈرامے بھی کرتے ہیں، ان کے اپنے آدمی ہی ہوتے ہیں جو سادہ لوح لوگوں میں کئی طرح کی افواہیں پھیلاتے ہیں۔ اگر کوئی قسمت کا مارا ان اتائی معالجوں کے ہاتھوں مر جاتا ہے یا نقصان اٹھاتا ہے تو پھر یہ لوگ دوسرے بااثر افراد کے ساتھ مل کر معاملے کو سمیٹتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا مقامی مافیا ہے جس کے اثر سے نکلنا عام شخص کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔"

اس حوالے سے رخشی کے ساتھ سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس جاہلیت اور توہم پرستی کے خلاف رخشی کا پورا پورا ساتھ دیا جائے۔ واقعی یہاں بہت زیادہ کام کی ضرورت تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں دیکھ رہا تھا کہ میرے اردگرد ایسے بہت سے لوگ ہیں جو آنکھیں بند کر کے موت کے گڑھے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انہیں گرنے سے روکنے کی کوشش نہ کرنا سخت بے حسی کی بات تھی۔ رات کو بھی میں دیر تک جاگتا رہا اور اس حوالے سے سوچتا رہا۔ دیہات کا ماحول اور یہاں کے گمبھیر مسائل دھیرے دھیرے میرے ذہن کا گھیراؤ کر رہے تھے...... لیکن اس کے ساتھ ساتھ گزرے دنوں کی یادیں بھی گاہے گاہے دل و دماغ پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں۔ ذہن کے افق پر سون کا خیال یوں ابھرتا تھا جیسے نہایت تاریک بادلوں میں اچانک بجلی تڑپ جائے۔ میں اس سے ہزاروں میل دور آ گیا تھا...... لیکن وہ ذہن سے جدا نہیں ہوئی تھی، ہر روز ہی کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی ناتے سے وہ یاد آ جاتی تھی۔ کبھی اس کی ہنسی، کبھی اس کی باتیں کبھی اس کی آنکھیں اور کبھی رنگت، مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اپنی تمام تر احتیاط اور تجاہل عارفانہ کے باوجود میرے دل میں بھی اسے چھونے اور محسوس کرنے کی خواہش پیدا ہوگئی تھی لیکن جب وقت رخصت میں نے اسے پہلی اور آخری بار چھونے کی کوشش کی تھی تو اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا تھا۔ ایک ایسا جھٹکا جس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا تھا۔ شاید یہ اس ''جھٹکے'' کا ہی کرشمہ تھا کہ میں جو اسے مسلسل نظر انداز کرتا رہا تھا۔ اس سے دور آنے کے بعد اسے یاد رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ خاص طور سے بنکاک کی اس طلسماتی رات میں سون سے آخری ملاقات ذہن کے پردے پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

میں بیٹھے بیٹھے اکثر سوچنے لگتا تھا، سون کہاں ہو گی؟ کیا کر رہی ہو گی؟ کیا وہ بھی میرے بارے میں سوچ رہی ہو گی؟ اس آخری سوال کا جواب اکثر نفی میں ہی ہوتا تھا۔ میں بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ سون رنگ برنگ پھولوں کے درمیان منڈلانے والی ایک تتلی ہے۔ اس کے اردگرد اتنے منظر اور اتنے رنگ ہیں کہ کسی ایک مقام پر اس کی سوچ دیر ٹھہر ہی نہیں سکتی۔

پھر میں بڑی دیانت داری کے ساتھ خود سے یہ سوال کرتا کہ کہیں میرے اندر سون کے لیے کوئی لطیف جذبہ تو پیدا نہیں ہو رہا؟ اس سوال کا جواب بھی اکثر نفی میں ہی آتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس قسم کے کسی جذبے کا کوئی وجود نہیں۔ ایک ہلکی سی کسک

ضرور تھی کہ سون سے آخری ملاقات خوشگوار کیوں نہ رہی، اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

آئندہ روز صبح سویرے رخشی کے ذہن میں نہ جانے کیا آیا وہ مجھ سے بولی۔ ''شاد! آج اس لڑکے کی طرف چلتے ہیں جسے تمہارے خیال میں مرگی کی شکایت ہے۔''

''لیکن جائیں گے کیسے؟ کیا تم گھوڑے پر لمبی سواری کر لو گی۔''

''نہیں جیپ پر جائیں گے۔ میں نے جبار سے بات کر لی ہے۔ چھ سات میل تک تو جیپ چلی ہی جائے گی۔ اس سے آگے ہم پیدل مارچ کریں گے۔''

''دیکھ لو اگر تم اتنا چل سکو گی تو چلے چلتے ہیں۔''

''یہ سوال تو تم سے پوچھنا چاہیے۔ میں تو اس قسم کے ایڈونچرز کی عادی ہو چکی ہوں۔''

''اکثر عادی مجرم ہی پکڑے جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

ناشتے کے بعد ہم چوہدری جبار کے ساتھ جیپ میں سوار ہوئے اور باغ پور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ قریباً آٹھ میل تک ہم جیپ کے ذریعے سفر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جب جیپ پر آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا تو ہم نے جیپ کو ایک کھیت کے کنارے لاک کیا اور پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔ اس سے آگے باغ پور تک چار پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ سفر ہم نے خوشگوار دھوپ میں اردگرد کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور باتیں کرتے طے کیا۔ راستے میں ایک دو چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آئیں۔ ہم یہاں رکے...... ایک بستی میں ایک عمر رسیدہ کمپاؤنڈر کلینک چلا رہا تھا۔ اس کی درخواست پر ہم نے چند مریضوں کو دیکھا اور انہیں اپنے پاس سے دوائیں وغیرہ بھی دیں۔ مریضوں میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص رخشی کو پہلے سے جانتا تھا۔ سیالکوٹ کے ہی ایک قریبی گاؤں میں اس کی رہائش تھی۔ پچھلے برس اس کی بیٹی سخت بیمار ہوئی تھی۔ رخشی نے ہی اس کا علاج کیا تھا اور اس کی زندگی بچانے کا وسیلہ بنی تھی۔ رحمت نامی یہ ادھیڑ عمر شخص رخشی کے سامنے بچھ بچھ جا رہا تھا۔ اس کے محنت کش ہاتھ بار بار دعائیہ انداز میں رخشی کے لیے اٹھ جاتے تھے اور آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ رخشی کے لیے اس قسم کے جذبات میں نے اکثر لوگوں کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

ہم دوپہر کے وقت باغ پور گاؤں پہنچے اور پھر وہاں سے سیدھے اسلم کے گھر چلے آئے۔ اسلم ہمیں مریض لڑکے کے گھر لے گیا۔ لڑکے کے والد کا نام انور تھا۔ انور کو جب معلوم ہوا کہ میں دراصل ڈاکٹر ہوں اور میری ساتھی خاتون بھی ڈاکٹر ہے تو وہ بدحواس نظر

آنے لگا۔ یہی کیفیت اس کی بیوی کی تھی۔ انور نے ہاتھ جوڑتے ہوئے مجھ سے کہا۔
''آپ ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ہم آپ کی بڑی عزت کرتے ہیں جی۔ پر خدا کا واسطہ ہے جی، آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہمارے بچے کو جو تکلیف ہے اس کا علاج آپ کے پاس نہیں ہے۔ اسے سایہ ہے۔ ہم نے ایک اللہ والے سے اللہ اللہ کرایا ہے۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ وہی اللہ والا ہے نا! جس نے جن کو دو کلو برفی کھلا کر پیپسی کی بوتل پلائی تھی اور تم سے ایک تولہ سونے کے پیسے ہتھیائے تھے۔ یار! تم شکل سے سمجھ دار لگتے ہو، کیا یہ بات ماننے والی ہے کہ جن برفی کھائے گا اور پیپسی پیئے گا۔''

''ایسی باتیں ہماری سمجھ میں آ جائیں تو ہم بھی ''کرنی والے'' نہ ہو جائیں جی...... مجھے پتا ہے جی کہ آپ ہماری بہتری کا سوچ کر یہاں آئے ہیں۔ ہماری بہتری اسی میں ہے جی کہ آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ پیر جی اس بات پر سخت ناراض ہوں گے۔

مجھے غصہ آنے لگا۔ رخشی نے مجھے اشارے سے منع کیا۔ اس نے اسلم کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے طریقے سے اپنے چھوٹے بھائی کو سمجھائے۔ اسلم اپنے بھائی کو اندر کمرے میں لے گیا ساتھ ہی اس کی بھابی بھی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ باہر آئے تو نیم رضا مند نظر آ رہے تھے۔ رخشی نے نرم لہجے میں انور کی بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''خالہ جی! آپ جو بھی جھاڑ پھونک کروا رہی ہیں وہ اسی طرح کرواتی رہیں۔ ہمارے علاج سے آپ کی جھاڑ پھونک کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

ہم نے قریباً ایک گھنٹے تک لڑکے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس کی ہسٹری سے اندازہ ہوا کہ پانچ چھ سال پیشتر ریڑھے پر سے گرنے سے اس کے سر پر سخت چوٹ آئی تھی۔ عموماً بچپن میں سر پر کوئی شدید چوٹ آ جانے سے بھی مرگی کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ علامتیں خاصی واضح تھیں پھر بھی حتمی نتیجہ ''سی ٹی اسکین'' وغیرہ کے بعد ہی نکل سکتا تھا۔ رخشی نے دو تین ٹیسٹ لکھ دیئے اور ان لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ پہلی فرصت میں لاہور جا کر یہ ٹیسٹ کر والیں۔ اس نے اپنے ایک واقف کار ڈاکٹر کے نام انہیں خط بھی لکھ دیا۔ میو اسپتال کا یہ نیورو فزیشن ٹیسٹوں کے سلسلے میں ان کی مدد کر سکتا تھا۔

رخشی نے ایک دو گھنٹے کے اندر اندر جس طرح انور اور اس کے گھرانے کو آمادہ اور قائل کیا یہ میرے لیے متاثر کن تھا۔ اس کے طریقہ کار اور اندازِ گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا

کہ وہ اس حوالے سے کافی تجربہ کار ہو چکی ہے۔ ہماری آمد کے وقت جو گھرانا ڈاکٹر کے نام سے بدک رہا تھا ہماری روانگی کے وقت امید بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا اور ہمارے موقف سے متفق نظر آتا تھا۔

ہم اپنا لنچ ساتھ لے کر آئے تھے، پھر بھی ان لوگوں کا دل رکھنے کی خاطر ہم نے اپنے کھانے کو پیک رہنے دیا اور ان کا دیا ہوا کھانا کھایا۔ سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ ہم باغ سے روانہ ہوئے تو مطلع ابر آلود تھا۔ شمال سے جنوب کی طرف تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہم اپنے میڈیکل بیگ ہاتھوں میں تھامے نیم پختہ راستے پر پیدل چل دیئے۔ جلد ہی نیم پختہ راستہ بھی ختم ہو گیا اور ہمارا سفر مزید ناہموار ہو گیا۔ تیز ہوا کے سبب رخشی کے بال اڑ رہے تھے اور اس کا لباس ایک پہلو سے جسم کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔ جیسے وہ کوئی تصویر ہو اور اس کے جسمانی خدوخال کو مصور نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اجاگر کر دیا ہو۔ مجھے تھوڑی سی تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ بالکل چوکس نظر آتی تھی۔ راستہ طے کرنے کے ساتھ ساتھ ہم لطیفوں وغیرہ کا تبادلہ بھی کرتے جا رہے تھے۔ رخشی کی ہنسی خوبصورت تھی۔ وہ ہنستی تھی تو اس کا سارا جسم ہنستا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ہم نے ڈھائی تین میل سفر طے کیا ہوگا کہ اچانک بادل گہرے ہو گئے اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ سردی پہلے ہی کافی تھی بھیگنے کے بعد مزید سردی لگنے لگی۔ بہر حال اندھیرا پھیلنے سے آدھ گھنٹا پہلے ہم جیسے تیسے جیپ تک پہنچ گئے۔ چوہدری جبار نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا، رخشی حسب سابق پچھلی نشست پر چلی گئی۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اونچے نیچے راستے پر اچھلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ چوہدری جبار کو اس قسم کے راستوں پر ڈرائیونگ کا کافی تجربہ تھا، لیکن جب کوئی مسئلہ کھڑا ہونا ہو تو تجربہ دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ ہم راجوالی کی طرف قریباً چار میل فاصلہ طے کر چکے تھے جب ایک موڑ پر اچانک جیپ کا اگلا پہیہ پھسلا اور وہ راستے سے اتر کر کھیت کے گہرے نکڑ میں چلی گئی۔ اس کے بائیں جانب کے دو پہیے قریباً دو فٹ تک دھنس گئے اور وہ خطرناک زاویے سے ایک طرف جھک گئی۔ جب اسے گہرائی سے نکالنے کے لیے انجن نے زور لگایا تو اس کا پچھلا حصہ غیر متوقع طور پر گھوما۔ جیپ کا اگلا پہیہ تو اس حرکت کے سبب گہرائی سے نکل آیا لیکن پچھلے دونوں پہیے گہرائی میں چلے گئے۔ اب جیپ کی پوزیشن وہ تھی جو طیارے کی ٹیک آف کے وقت ہوتی ہے جیپ کا منہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور

پچھلا حصہ دبا ہوا تھا۔

ہم چار پانچ منٹ تک جیپ کو گڑھے سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہماری ہر کوشش پر پہیے بس کیچڑ کے اندر گھوم کر رہ جاتے۔ بارش زور پکڑ گئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔ جیپ اندر سے کافی گرم تھی کیونکہ جبار نے ہیٹر چلا رکھا تھا۔ اس حرارت کے سبب ہمارے کپڑے بھی کافی حد تک سوکھ چکے تھے۔ اب نئے سرے سے بارش میں بھیگنے کا خیال ہی کپکپا دینے والا تھا۔ مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ جبار قریبی گاؤں میں جاتا ہے اور وہاں سے کوئی ٹریکٹر وغیرہ لے آتا ہے تاکہ جیپ کو نکالا جا سکے۔ اس دوران ہم دونوں جیپ کے اندر ہی رہیں گے۔

جیپ کے ڈیش بورڈ میں چوہدری جبار کا بھرا ہوا لائسنسی ریوالور موجود تھا۔ اس نے ہمیں ریوالور کی موجودگی سے آگاہ کیا اور خود گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ تیز بارش میں نیم گرم جیپ کے اندر دبک کر بیٹھنا اور میوزک سننا کافی رومان انگیز تھا۔ ہم نے پریشانی کے باوجود اس صورتحال کو انجوائے کیا۔ ہم گاہے گاہے جیپ کو اسٹارٹ کر کے ہیٹر چلا لیتے تھے تاکہ گاڑی زیادہ ٹھنڈی نہ ہو پھر ہمیں خدشہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں جیپ کا ڈیزل ہی شارٹ نہ ہو جائے۔

گاڑی کے پچھلے حصے میں ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔ میں وہ کمبل اٹھا لایا۔ ہم نے اپنے زیریں جسم کمبل سے ڈھانپ لیے۔ جبار کو گئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ بہر حال ہمیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا۔ قریب ہی ایک کسان فیملی نے کھیت کے اندر کچے پکے کوٹھے بنا رکھے تھے۔ ادھ کھلے دروازوں کے اندر سے لالٹینوں کی مدھم روشنی جھانک رہی تھی۔ فیملی کا باریش سربراہ تھوڑی دیر پہلے آ کر ہم سے دریافت کر چکا تھا کہ ہمیں کسی طرح کی مدد کی ضرورت تو نہیں۔

اس علاقے کے لوگوں کو میں نے کافی ملنسار اور خلیق پایا تھا۔ بیٹھے بیٹھے رخشی کو اونگھ آنے لگی۔ اس کا سر سرکتے سرکتے میرے شانے سے آ لگا۔ میں نے ایک دم صورت حال پر غور کیا۔ ہم عملی طور پر ایک ہی کمبل میں نیم دراز تھے اور رخشی میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ یقیناً ہمارے جسموں کی گرمی ایک دوسرے کو سکون پہنچا رہی تھی۔ لیکن اچانک ہی اس سکون کے اندر سے میرے لیے بے سکونی کی کونپل پھوٹ نکلی۔ ایک عجیب سی بے چینی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ میں نے اپنا شانہ تھوڑا سا پیچھے سرکایا۔ رخشی کے سر کو جھٹکا

محسوس ہوا اور وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا سر پھر ہولے ہولے سرکتا ہوا میرے شانے سے آ لگا۔

کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے اس کا سر پھر سیدھا کر دیا۔ اس نے خوابناک نظروں سے مجھے دیکھا، ان میں ناراضی کی ہلکی سی جھلک بھی تھی۔ اس نے کمبل خود پر سے ہٹا دیا اور مجھ سے دور سمٹ کر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اگر چاہتے ہو تو میں جیپ سے باہر بیٹھ کر انتظار کر لیتی ہوں۔“

”ناراض ہو گئی ہو؟“

”مجھے کوئی حق نہیں تم سے ناراض ہونے کا۔ یہ تو میری بے وقوفی ہے کہ تمہارے بارے میں سوچتی ہوں۔ تمہیں اپنا سمجھتی ہوں۔“

اس کے لہجے میں کچھ ایسا درد تھا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ بات حقیقت تھی کہ رخشی کی اپنائیت اور گرم جوشی کا جواب میں نے ہمیشہ بے رخی اور رکھائی سے ہی دیا تھا۔ اس سے پہلے اپنی بے رخی پر مجھے کبھی ملال نہیں ہوا تھا لیکن پتا نہیں کیا بات تھی کہ رخشی کے ساتھ گاؤں آ کر اور یہاں اس کا ”کام“ دیکھ کر اس کے بارے میں میرے خیالات بہت حد تک بدل گئے تھے۔ وہ مجھے ایک مختلف لڑکی لگنے لگی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، پھر تھوڑا سا اس کی طرف کھسک کر کمبل اس کے گھٹنوں پر پھیلا دیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ریڈیو پر نغمہ گونج رہا تھا ”نہ چھڑا سکو گے دامن نہ نظر بچا سکو گے......“ نغمے کی خوبصورت موسیقی دل و دماغ پر اتر رہی تھی۔ جیپ کی کھڑکیوں سے باہر بارش مسلسل برس رہی تھی۔ گاہے گاہے بجلی چمکتی تھی اور کھیت کھلیان روشن ہو جاتے تھے۔ ان کھیتوں کے اندر محنت کش کسانوں کے گھروندے نظر آتے تھے۔ بیلوں کے بغیر دو بیل گاڑیاں آسمان کی طرف منہ اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کے قریب ہی ایک چھپر تلے مویشی تھے جن کی پشت پر بورے وغیرہ باندھ دیے گئے تھے تاکہ وہ بارش سے محفوظ رہیں۔ قریب ہی خشک بھوسے کا ایک بڑا ڈھیر تھا جسے مٹی سے لیپ کر بارش سے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اس ڈھیر کے نزدیک چارہ کترنے والا ٹوکا نصب تھا۔ یہ سارا منظر آسمانی بجلی کے بس ایک جھپکے میں دکھائی دے جاتا تھا۔ اگلے ہی لمحے گھٹا ٹوپ اندھیرا اور بارش سب کچھ ڈھانپ لیتی تھی۔

رخشی کا سر آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے پھر میرے کندھے سے آ لگا۔ تاہم اس مرتبہ ایسا

غنودگی کے سبب نہیں ہوا تھا۔ اس نے بے خودی کی حالت میں اپنا سر میرے شانے سے ٹکایا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے شاد؟ زندگی کے کسی ایک لمحے میں ہم جو کچھ سوچتے ہیں یا دیکھتے ہیں یا محسوس کرتے ہیں، وہ ہماری پوری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ہم کوشش کے باوجود اسے اپنے دل و دماغ سے جدا نہیں کر سکتے۔''

''کیا تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوا ہے؟'' میں نے اس کی کشادہ پیشانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاید ہوا ہے۔'' رخشی نے کہا۔ اس کا ہاتھ ہولے سے سرک کر میرے ہاتھ کے اوپر آ گیا تھا۔ اس کی گرم سانسیں میری گردن سے ٹکرا رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اگر تم میرے بارے میں اچھی سوچ رکھتی ہو تو میں بھی رکھتا ہوں۔ خاص طور سے تمہارے ساتھ گاؤں میں آنے کے بعد میں نے اکثر تمہارے متعلق سوچا ہے۔ تمہارے کام کی اہمیت مجھ پر واضح ہوئی ہے۔''

''صرف کام کی اہمیت؟'' اس نے ذرا شوخ سرگوشی کی۔

''نہیں تمہاری بھی۔'' میں نے اس کا نرم گرم ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

اس کا سر میرے شانے پر کچھ اور بھی آرام سے ٹک گیا۔ دفعتاً کہیں دور سے ٹریکٹر کی آواز سنائی دینے لگی۔ ''میرا خیال ہے کہ چوہدری صاحب کمک لے کر آ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک اداسی بھری گہری سانس لی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

آنے والے آٹھ دس دنوں میں میرا اور رخشی کا تعلق چند قدم مزید آگے بڑھا۔ درحقیقت بتدریج مجھے رخشی کے ''مقصد'' سے وابستگی پیدا ہو رہی تھی۔ رخشی کی سوچ میری سوچ بنتی جا رہی تھی۔ سسکتی ہوئی بے بس انسانیت کے لیے رخشی کے دل میں ہمدردی کا جو بے لوث جذبہ موجود تھا وہ میرے دل میں بھی ڈیرے ڈال رہا تھا۔ مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ مسیحائی کیا ہے اور ہمارے وطن کے دور دراز دیہات میں اس کی کتنی ضرورت ہے۔

میں اپنے گرد پیر پرستی اور عطائیت کے ڈسے ہوئے لوگ دیکھ رہا تھا۔ معمولی تکلیفیں تھیں جو بھیانک امراض میں ڈھل چکی تھیں یا ڈھلنے والی تھیں۔ پھول چہرہ بچے، روشن

پیشانیوں والی دوشیزائیں، محنت کش نوجوان، سادہ لوح بوڑھے۔ سب اپنی صحت کے حوالے سے خطرناک نوسر بازوں کے نرغے میں تھے۔ ان کے مصائب دیکھ دیکھ کر میرا دل رونے لگا تھا، جی چاہتا تھا کہ چوہدری کا ریوالور لے کر نکل جاؤں اور ہر نوسر باز کو شوٹ کر ڈالوں...... لیکن رخشی اور جبار وغیرہ نے مجھے سمجھایا کہ یہاں جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ یہاں کا مافیا تو چاہتا ہے کہ ہم مشتعل ہوں اور وہ ہمیں مکھن کے بال کی طرح نکال باہر کریں۔

ڈاکٹر رخشی اور چوہدری جبار کی ان تھک محنت دیکھ دیکھ کر میرے دل میں بھی یہ عزم راسخ ہو رہا تھا کہ میں اپنی زندگی کا رخ بدلوں۔ میں ان لوگوں کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہو جاؤں اور ایک ارفع جدوجہد کا حصہ بن جاؤں۔ میں اب سارا دن کلینک میں رخشی کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ شام کو ہم حویلی کے احاطے میں تھوڑی سی تفریح کرتے۔ بیڈمنٹن یا والی بال کھیلتے۔ رات کو دیر تک اپنے کام کے حوالے سے بات چیت ہوتی رخشی کا خیال تھا کہ جلد از جلد ''باغ پور'' میں بھی ایک کلینک قائم کر دیا جائے اور میں اس کی ذمے داری سنبھال لوں۔ اس سلسلے میں ہم رات گئے تک منصوبے بناتے رہتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ چوہدری جبار تھک کر سو جاتا۔ میں اور رخشی اکیلے بیٹھے رہتے۔ ہمارے درمیان کمرے کے فرش پر مٹی کی انگیٹھی دہکتی۔ آہنی سلاخوں والی کھڑکی میں سے سرما کی چاندنی اندر جھانکتی اور جب دھواں کھڑکی سے نکل جاتا اور کوئلے سرخ ہو جاتے تو ہم کھڑکی بھی بند کر لیتے۔ میں رخشی کی آنکھوں میں جھانکتا تو وہاں مجھے اپنے لیے ایک واضح پیغام نظر آتا۔ ''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اب سے نہیں بہت برسوں سے۔ میں اپنی محبت کا اقرار تمہارے ہونٹوں سے سننا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کھیت اور کھلیان، یہ سونی سونی خوشبو والی گلیاں یہ چاندنی راتیں...... یہ باتیں...... یہ سب تم پر ضرور اثر کریں گی۔ تمہارے ہونٹ اس انداز میں ہلیں گے جس انداز میں، میں چاہتی ہوں اور جس گھڑی ایسا ہو گا، تمہارا من مراد پا جائے گا۔ میں جی اٹھوں گی...... برسوں کی جادہ پیمائی نے جو تھکن میری روح میں اتاری ہے وہ لمحوں میں اڑن چھو ہو جائے گی۔''

رخشی اور چوہدری جبار کی کوشش سے سلیمان نامی لڑکے کے والدین کو بھی عقل آ گئی تھی۔ وہ اسے لاہور لے گئے تھے اور وہاں اس کا تسلی بخش علاج ہو رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی تھی۔ مناسب علاج میں تاخیر کے سبب مرض کافی بڑھ چکا تھا، بہر حال

بہتری کی امید موجود تھی۔ چھ سالہ بچی کے لیے ابھی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس کا باپ بہت سخت مزاج تھا۔ وہ بچی کو لاہور لے جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پہلے بھی میں اسپتال سے بچی کی لاش لے کر آیا تھا اب دوبارہ میں لاش لانا نہیں چاہتا۔ میں بچی کی حالت کو...... ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ رہ رہ کر میرا خون کھولتا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا ورنہ میں بچی کو اس کے لواحقین سے چھین کر لاہور لے جاتا۔

وڈے سائیں اور اس کے معاملات کو میں اب بڑی اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وڈا سائیں ایک زبردست ڈراما تھا۔ رخشی اور جبار کے بقول اس طرح کے ''ڈرامے'' دیہی علاقوں میں ہر جگہ دیکھے جا سکتے تھے۔ کہیں ایسے ڈراموں کی نوعیت کم سنگین ہوتی تھی کہیں زیادہ۔ وڈے سائیں کی جو ہسٹری مجھے مقامی افراد سے معلوم ہوئی وہ میں یہاں من وعن نقل کر رہا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو اس صریح جھوٹ کی ایک جھلک نظر آئے جو وڈے سائیں کی صورت، علاقے میں دندناتا پھرتا تھا۔

وڈا سائیں جسے علاقے میں ہر طبقے کے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، چند برس پہلے لاہور میں ریت ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ ٹرالیاں دریائے راوی سے ریت لاتی ہیں۔ ریت چڑھانے اور اتارنے کے لیے جو مزدور کام کرتے ہیں وڈا سائیں ان میں شامل تھا۔ وہ بے حد باتونی تھا اور بلند بانگ لہجے میں بات کرنے کا عادی تھا۔ وہ جلد ہی مزدوروں کے نگران کی حیثیت اختیار کر گیا اور اس نے خود کو ہی ''ریت کنٹرولر'' کا خطاب دے دیا۔ وڈا سائیں جس کا اصل نام قطب دین تھا شاعری میں بھی منہ مارتا تھا۔ الٹے سیدھے شعر جوڑ کر اپنے ہم کاروں کو سناتا تھا۔ کبھی کبھی بھونڈے انداز میں صوفیانہ شعر کہنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ کچھ عرصے بعد اس نے لاہور میں کام چھوڑ دیا اور گاؤں آ کر پیری فقیری شروع کر دی۔ شروع میں وہ صرف گڑ دم کر کے دیتا تھا لیکن بعد میں کئی قسم کی چیزوں پر پھونکیں مارنے لگا۔ وڈے سائیں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ایک موٹی گرم گدڑی چوبیس گھنٹے اوڑھے رکھتا تھا، نہایت سخت گرمی میں بھی وہ گدڑی اتارتا نہیں تھا۔ کم علم لوگ اسے بھی سائیں کی کرامات میں سے سمجھتے تھے۔ سائیں بے تحاشا گالیاں بھی نکالتا تھا، یہاں تک کہ اپنی بوڑھی ماں کو بھی غلیظ گالیاں دینے سے باز نہیں آتا تھا۔ ایک روز میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ وہ اپنی والدہ کو گالیاں دے رہا تھا۔

ہمارے اندیشے کے عین مطابق وڈے سائیں نے شہناز نامی بچی کو علاج کے لیے لاہور لے جانے کی مخالفت کی۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ بچی کے دماغ میں کوئی رسولی وغیرہ نہیں۔ اسے سایہ ہے۔ اگر اسے لاہور لے جایا گیا تو جنات اسے بھی مار دیں گے اور وہاں سے اس کی لاش واپس آئے گی جیسے اس کی بڑی بہن کی آئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ حاجی شمشاد بھی اس معاملے میں سائیں اور بچی کے لواحقین کی حمایت کر رہا ہے۔ گاؤں میں ہماری آمد کے فوراً بعد حاجی شمشاد نے ہماری دعوت کی تھی اور بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا تھا لیکن اس کی خوش اخلاقی میں مجھے نہ جانے کیوں کھوٹ سا محسوس ہوا تھا۔ حاجی شمشاد کے کردار میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکایا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے حاجی اتنا اچھا نہیں جتنا نظر آتا ہے۔

ایک روز میں اور رخشی حاجی صاحب سے ملنے ان کی حویلی میں گئے۔ مقصد یہی تھا کہ حاجی صاحب کو آمادہ کیا جائے کہ وہ بچی کے علاج کے سلسلے میں اس کے لواحقین پر اپنا اثر رسوخ استعمال کریں۔

رخشی نے کہا۔ ''حاجی صاحب! اس امر میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ بچی کے دماغ میں رسولی ہے۔ ابھی بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ اگر شہناز کے والدین اسے لاہور لے جانے پر راضی ہو جائیں تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔''

حاجی صاحب بولے۔ ''ڈاکٹرنی جی! آپ اپنی جگہ ٹھیک ہیں لیکن شہناز کا باپ بھی غلط نہیں کہتا ہے۔ وہ اپنی بڑی بچی کی لاش اسپتال سے ہی لے کر آیا تھا۔''

''کوئی بچی اسپتال لے جانے کی وجہ سے فوت نہیں ہوئی۔ اس کی جان جانے کی وجہ یہی تھی کہ اسے اسپتال لے جانے میں تاخیر کی تھی۔ اب باغ پورہ کے سلیمان کا کیس آپ کے سامنے ہی ہے۔ اس کے بارے میں بھی یہی کہا جا رہا تھا کہ اسے سایہ ہے۔ اب وہ لاہور میں علاج کرا رہا ہے اور تقریباً ٹھیک ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے چوہدری صاحب! اللہ تعالیٰ اس بچی کو بھی شفا دے گا۔''

''مگر ڈاکٹرنی جی! اتنا خرچہ کیسے اٹھائے گا شہناز کا باپ؟''

''وہ ہمت کرے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ اس کی بیوی اپنے گہنے بیچنے کو تیار ہے ہم بھی اپنی پوری کوشش کریں گے۔ شہر میں درد دل رکھنے والے ایسے لوگ ہیں جو ایسے مریضوں کی مالی مدد کرتے ہیں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

رخشی کے ہلکے سے طنز کو محسوس کر کے چوہدری شمشاد بولا۔ ''درد دل رکھنے والے لوگ یہاں بھی موجود ہیں ڈاکٹرنی صاحبہ...... لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ جن کی بچی ہے وہ اس معاملے میں اپنی رائے کو تبدیل کریں۔ اگر اختر بچی کو لاہور لے جانے پر تیار نہ ہوا تو بچی کیسے جائے گی۔ اختر اپنے گھرانے کا سربراہ ہے، اس کا راضی ہونا ضروری ہے۔''

''ہم اسی لیے تو حاضر ہوئے ہیں جی۔'' میں نے کہا۔ ''اختر آپ کی بہت عزت کرتا ہے، وہ آپ کی بات ٹالے گا نہیں۔''

''آج کے دور میں ہر بندہ خود مختار ہے۔ وہ دور گزر گئے جب لوگ بات مانتے تھے اور عزت کرتے تھے۔ بہر حال میں کوشش کرتا ہوں، کیونکہ...... ذاتی طور پر میرا بھی یہ خیال ہے کہ دم درود کے ساتھ ساتھ بچی کا ڈاکٹری علاج بھی ہونا چاہیے۔''

شمشاد علی نے ہمیں تسلی تشفی دے کر واپس بھیج دیا لیکن لگتا تھا کہ اس نے کیا کرایا کچھ نہیں۔ معاملہ جوں کا توں رہا۔ شہناز کی حالت بتدریج خراب ہوتی رہی پھر ایک دن چوہدری جبار نے اپنے طور پر ہمت کی۔ وہ شہناز کے گھر گیا اور اس کے والد اختر کے ساتھ سر پھوڑتا رہا۔ اختر نیم رضامند ہوا تو چوہدری جبار اپنے ذاتی خرچ پر اپنی جیپ کے ذریعے شہناز کو لاہور لے گیا۔ رخشی کی ہدایت پر میں بھی چوہدری جبار کے ساتھ گیا۔ ہم شہناز کو جنرل اسپتال لے آئے۔ بچی کے تفصیلی ٹیسٹ ہوئے۔ ''ٹیومر مارکرز'' سے ٹیومر کنفرم ہو گیا۔ ماہر نیورو سرجن نے آپریشن تجویز کیا۔ سرجن کا خیال تھا کہ آپریشن کے لیے یہ بہترین وقت ہے۔ ابھی ٹیومر کا پھیلاؤ اتنا بڑھا نہیں کہ آپریشن سے دماغ کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہو۔

شہناز کا ایک ماموں پڑھا لکھا شخص تھا۔ وہ ڈاکٹری علاج کا حامی تھا اور اس سلسلے میں جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ درحقیقت اگر ہم بچی کو اسپتال تک لانے میں کامیاب ہوئے تھے تو اس میں بچی کے ماموں رشید کا بھی کافی عمل دخل تھا۔ نادار مریضوں کی مدد کرنے والی ایک دو تنظیموں سے رخشی کے اچھے تعلقات تھے۔ رخشی کی درخواست پر ان میں سے ایک تنظیم نے بچی کے آپریشن میں معاونت کی ہامی بھری اس سلسلے میں پندرہ ہزار روپے کا فوری بندوبست بھی کیا گیا۔ ہم نے بھی اس سلسلے میں اپنے اپنے طور پر مالی تعاون کیا۔ علاج کے لیے قریباً ڈیڑھ لاکھ روپے درکار تھے۔ آٹھ دس روز میں ایک لاکھ روپے جمع ہو گئے۔

میں جنرل اسپتال میں ہر وقت بچی کے ساتھ تھا۔ اس کے پاس رہنے سے ایک عجیب سی وابستگی اس سے پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مجھے بڑی معصومیت سے ڈاکٹر چاچا کہنے لگی تھی۔ کسی وقت وہ اپ سیٹ ہوتی یا تکلیف میں ہوتی تو میں بستر پر اس کے پاس بیٹھ کر اسے کہانی سنانے لگتا۔ وہ کہانی سنتے سنتے میری گود میں سرک آتی۔ دیر تک اس کے پاس رہنے کے بعد میں اٹھ کر جاتا تو وہ منہ بسورنے لگتی۔ کسی وقت وہ کھانا نہ کھاتی تو اس کی والدہ میرے آنے کا انتظار کرتی۔ میں اس کے پاس بیٹھ کر ہاتھ سے کھلاتا تو وہ کھانے لگتی۔ وہ میری ہر بات مان جاتی تھی۔

ایک رات پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے جلیبیاں کھانے کی فرمائش کر دی۔ اسے کھانسی وغیرہ بھی ہو رہی تھی۔ مٹھائی اس کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ بہر حال اس کی فرمائش ٹالنا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں سخت سردی میں اسکوٹر لے کر نکل گیا اور قریباً ایک گھنٹے بعد اس کے لیے تازہ جلیبیاں بنوا کر لایا۔

تنہائی میں شہناز کی سادہ لوح والدہ اکثر آنکھوں میں آنسو بھر لاتی تھی۔ ایک دن ایسے ہی بے قرار ہو کر مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''میری شہناز بچ جائے گی ناں؟''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''انشاء اللہ! وہ یہاں سے صحت یاب ہو کر ہنستی کھیلتی واپس جائے گی۔''

''شہناز کا ابا مجھ کو ڈراتا رہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہم نے شہناز کو یہاں لا کر اچھا نہیں کیا۔ اس پر ہوائی چیزوں کا سایہ ہے۔ ہماری بڑی بیٹی کو بھی ہوائی چیزوں نے مار دیا تھا وہ اسے بھی......'' وہ سسکی لے کر چپ ہو گئی۔

''تمہاری بڑی بیٹی کی جان ہوائی چیزوں کی وجہ سے نہیں گئی۔ وہ اس لیے مری کہ تم لوگوں نے اسے اسپتال تک لانے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اب اللہ کے کرم سے شہناز وقت پر اسپتال آ گئی ہے۔ اب یہ بالکل محفوظ جگہ پر ہے۔ انشاء اللہ یہاں اسے کچھ نہیں ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہر وقت ہمارے پاس رہیں۔ آپ کو پاس دیکھ کر مجھے بہت تسلی ہوتی ہے اور شہناز کی تو بس جان میں جان آ جاتی ہے۔''

''میں زیادہ سے زیادہ وقت تم لوگوں کے پاس گزارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپریشن کے دوران میں چوبیس گھنٹے یہاں رہوں گا۔ فکر کی بالکل ضرورت نہیں۔''

اسی دوران میں شہناز بستر پر سے مجھے آوازیں دینے لگی۔ شہناز کی امی نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔ ہم شہناز کے پاس پہنچے، وہ ٹھنک کر بولی۔ ''ڈاکٹر چاچا! تم نے کل مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں چڑیا گھر دکھاؤں گا...... مجھے چڑیا گھر لے کر جاؤ۔''

میں نے اس کے گال پر چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو رات ہو چکی ہے، چڑیا گھر شام کو بند ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی بڑے ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ ابھی شہناز دو تین دن اور دوائی کھائے گی، اس کے بعد ہی وہ یہاں سے باہر جا سکے گی۔''

وہ پہلے تو ضد کے انداز میں ٹھنکتی رہی پھر بولی۔ ''میں جب ساری دوا کھا لوں گی تو پھر میرے سر کا درد بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ایک دم ٹھیک ہو جائے گا اور تمہیں ڈر بھی نہیں لگے گا۔ بخار بھی نہیں آیا کرے گا۔''

''بخار نہیں آئے گا تو پھر میں پکوڑے اور جلیبیاں کھا لیا کروں گی؟''

''بالکل کھاؤ گی...... بلکہ میں تمہیں خود کھلاؤں گا۔ ہم یہاں سے سیدھے چڑیا گھر دیکھنے جائیں گے۔ ہاتھی کی سواری کریں گے، پھر بادشاہی مسجد دیکھیں گے۔ مینار پاکستان پر چڑھیں گے۔'' اس کی آنکھوں میں خوشی کے ننھے منے دیے جل گئے۔ بولی۔ ''ڈاکٹر چاچا! اگر میں ساری دوائیاں آج ہی کھا لوں...... تو پھر ہم کل چلے جائیں گے۔''

میں نے اس کے ملائم گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں بیٹا! ساری دوائی ایک ہی بار نہیں کھائی جا سکتی۔''

اس کی معصوم آنکھیں گہری سوچ میں گم ہو گئیں۔ شاید وہ گولیوں اور دنوں وغیرہ کا حساب جوڑ رہی تھی۔

آپریشن کی تیاری پوری ہو چکی تھی۔ یہ آپریشن سے ایک دن پہلے کی بات ہے، صبح سویرے مجھے اسپتال سے ڈیوٹی ڈاکٹر کا فون آیا۔ والدہ نے مجھے جگا کر فون کے بارے میں بتایا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے بتایا کہ، آج علی الصبح مریضہ بچی شہناز کے والدین اسے خاموشی کے ساتھ اسپتال سے لے گئے ہیں۔

میرے لیے یہ بڑی حیران کن اور تکلیف دہ خبر تھی۔ ان بے وقوفوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنے نازک وقت میں کتنا غلط کام کر رہے ہیں۔ میں گھر سے بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا۔ وارڈ سرونٹ اور ایک نرس سے معلوم ہوا کہ کل رات گھنی مونچھوں اور لمبے قد والا ایک شخص شہناز کی خبر گیری کے لیے آیا تھا، اس کے ساتھ ایک گن مین بھی تھا۔ یہ چوہدری

وہ شخص اسپتال کے برآمدے میں دیر تک بچی کے والدین سے باتیں کرتا رہا تھا۔ بعد میں وہ بچی کے والد اختر کو ساتھ لے کر اسپتال سے باہر بھی گیا تھا۔ بچی کے والدین رات ہی سے گم صم نظر آ رہے تھے۔ ان کے دو تین اور رشتے دار بھی رات کو اسپتال میں موجود تھے۔ اب ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔

اسٹاف نے گھنی مونچھوں والے شخص کا جو حلیہ بتایا اس سے اندازہ ہوا کہ ہو نہ ہو یہ حاجی شمشاد علی ہو گا۔ میں نے شہناز اور اس کے لواحقین کی تلاش میں کچھ بندے دوڑائے ریلوے اسٹیشن، لاری اڈے اور راوی کے پل پر تلاش کیا گیا لیکن ان لوگوں کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ لوگ گاؤں روانہ ہو گئے ہیں، یہاں لاہور میں تو ان کا کوئی جان پہچان والا نہیں تھا۔ میں فوری طور پر راجوالی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرے خیال میں تو اسپتال سے اس قسم کا فرار قتل عمد کے مترادف تھا اور مجھے یقین تھا کہ لڑکی کے والدین کو اس فرار کے لیے ترغیب دی گئی ہے۔ میں ایک طویل اور کٹھن سفر طے کر کے قریباً آٹھ گھنٹے میں راجوالی پہنچا۔ یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ بچی اور اس کے والدین واپس راجوالی نہیں پہنچے تھے۔ بس ان کا ایک رشتے دار موجود تھا۔ اس نے بھی بتایا کہ وہ کل رات ہی چلا آیا تھا اسے کچھ خبر نہیں ہے کہ بعد میں اسپتال میں کیا ہوا۔

میں نے ساری صورتحال سے رخشی اور جبار کو آگاہ کیا۔ رخشی تحمل سے سنتی رہی۔ رنج و ملال تو اس کے چہرے پر بھی تھا لیکن وہ میری طرح بے چین نہیں تھی۔ غالباً وہ اس نوعیت کے اتنے کیسز دیکھ چکی تھی کہ اب ایسی حماقتوں پر اس نے ششدر ہونا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''رخشی! میں تو سمجھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرانی چاہیے۔ خدا کی پناہ...... ایسی حماقت...... اتنی غفلت!''

رخشی گہری سانس لے کر بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم اب اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان لوگوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔''

''اس کے سوا بھی کچھ کر سکتے ہیں۔'' میں نے تڑخ کر کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں حاجی شمشاد علی اور وڈے سائیں کا ہاتھ ہے۔ انہوں نے بچی کے علاج کے معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا تھا۔ ہم بچی کو لاہور لے گئے تھے اور وہ لوگ اسے اپنی شکست سمجھ رہے تھے۔''

''پھر بھی ہے شاداب صاحب! بچی اپنے ماں باپ کے ساتھ گئی ہے۔'' چوہدری جبار

نے کہا۔ ''قانونی طور پر والدین کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بچے کا علاج اپنی مرضی سے کروائیں۔ ایسا معاملہ قابل دست اندازی پولیس نہیں ہوتا۔''

''تو آپ کا مطلب ہے کہ ہم بھی اندھے اور بہرے بن کر بیٹھ جائیں۔ ہم جانتے بھی ہیں کہ وہ لوگ بچی کی جان لے لیں گے پھر بھی خاموش تماشائی بنے رہیں۔ کم از کم مجھ سے تو یہ سب نہیں ہوگا۔ اگر بچی نہیں ملی تو میں اس واقعے کی ایف آئی آر لکھواؤں گا۔''

''شاداب بابو! میں تمہیں ابھی سے بتا دیتا ہوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ الٹا ہم اپنا نقصان کریں گے۔''

''نقصان پہلے بھی تو ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپریشن کے لیے ساٹھ ستر ہزار کے ٹیسٹ ہو چکے ہیں اور دوائیں وغیرہ آ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ مزید بھی کئی طرح کے اخراجات ہو چکے ہیں۔ وہ سب کچھ ان لوگوں کی حماقت کے سبب ضائع جا رہا ہے۔''

ہم کلینک میں بیٹھے تھے۔ میری باتوں کے دوران میں ہی دو مریض آ گئے۔ رخشی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش کرا دیا۔ وہ اس بات پر سختی سے عمل کرتی تھی کہ عام لوگوں کے کانوں تک ہماری کوئی متنازعہ گفتگو نہ پہنچے۔ اس کا تجربہ یہ کہتا تھا کہ عام لوگوں میں ہی وڈے سائیں کے مخبر وغیرہ موجود ہوں گے۔

اگلے روز مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں رخشی یا جبار سے مشورہ کیے بغیر حاجی شمشاد علی کی حویلی جا پہنچا۔ حاجی شمشاد علی رنگین پایوں والی کرسی پر ٹھاٹ سے بیٹھا تھا۔ ایک میواتی اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ حقے کی لمبی نے شمشاد علی کے منہ میں تھی۔

اس نے اٹھ کر بڑی عزت سے مجھے بٹھایا اور فوراً چائے وغیرہ کا آرڈر دیا۔ اس کی زبان بڑی میٹھی تھی لیکن دل کی مٹھاس کے بارے میں مجھے شک تھا۔ ہم دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے تو میں نے شمشاد علی سے کہا۔ ''آپ گاؤں کے سرکردہ افراد میں سے ہیں۔ اختر اکثر آپ کے پاس بیٹھا نظر آتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اختر اور اس کی بیوی کو ڈھونڈنے میں ہماری مدد کریں۔''

شمشاد علی نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے کہ آپ کے دل میں میرے بارے میں شک ہے۔ شاید آپ سمجھتے ہیں کہ اختر کے اسپتال سے جانے میں میرا ہاتھ ہے۔ آپ کا شک بلاوجہ بھی نہیں ہے۔ میں کل شام اسپتال میں تھا اور میں نے اختر سے کل بات بھی کی تھی۔ شاید آپ کی جگہ میں ہوتا تو میرے دماغ میں بھی ایسی بات آ جاتی لیکن میں آپ

کو ہر طرح کی قسم دے سکتا ہوں کہ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ اختر کے اسپتال سے جانے کی مجھے بھی اتنی ہی پریشانی ہے جتنی آپ کو ہے۔''

''نہیں حاجی صاحب! میں آپ پر خدانخواستہ کسی طرح کا شک کرنے نہیں آیا۔ میں تو آپ سے مدد مانگنے آیا ہوں۔'' میں نے ایک لمحہ توقف کرتے ہوئے کہا۔ ''زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرا علم یہ کہتا ہے کہ اس بچی کو اسپتال کی اشد ضرورت ہے۔ یہ دیکھیں...... میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے باپ بن جائیں اور صرف اس بچی کے بارے میں سوچیں۔ کہیں یہ نہ ہو کہ وہ ہماری گروپ بندی اور آپس کی لڑائی کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اس کے پاس ٹائم بہت کم ہے۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ میرے دردمند لہجے نے حاجی شمشاد علی کو بھی متاثر کیا ہے اور اس کے اندر کچھ اتھل پتھل ہوئی ہے۔ وہ حقہ گڑگڑا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا اور بولا۔ ''وہ الو کا پٹھا اختر جا کہاں سکتا ہے؟ آلے دوالے اس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں۔ بس ڈیرہ نیل گاؤں میں اس کی ماں کا ایک بھائی رہتا ہے۔ وہاں جا سکتا ہے یا اس کی بیوی کا چھوٹا بھائی ہے جو شاد پور میں رہتا ہے۔''

''کہیں آپ بچی کے ماموں رشید کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''ہاں ہاں، وہی۔''

''اس کے بارے میں تو مجھے یقین ہے کہ بچی وہاں نہیں ہوگی۔ رشید تو خود دن رات کوشش کرتا رہا ہے کہ کسی طرح بچی کو لاہور پہنچایا جا سکے۔ ہاں جو آپ نے ڈیرہ نیل والی بات کی ہے، اس کے بارے میں غور کر لیں۔''

حاجی شمشاد نے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی وقت دو گھوڑیاں اصطبل سے نکلوائیں اور اپنے بیٹے کو جبار کے ملازم فیقے کے ساتھ ڈیرہ نیل بھیج دیا تاکہ اختر اس کی بیوی اور بچی کا سراغ لگایا جا سکے۔ بچی کے علاوہ اختر کا ایک دو سالہ بچہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ گھر میں صرف دادی رہ گئی تھی جس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ فیقے نے بتایا کہ وہ ڈاکٹروں کو قصوروار سمجھ رہی ہے اور واویلا کر رہی ہے کہ ڈاکٹروں کی وجہ سے اس کی پوتی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

حاجی شمشاد نے جو بندے بھیجے تھے وہ اگلے روز دوپہر کو واپس آئے۔ معلوم ہوا کہ اختر

اور اس کے گھر والے وہاں نہیں ہیں، نہ ہی ان لوگوں کو اختر وغیرہ کی کوئی خبر ہے۔ ہماری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ خاص طور سے میرا تو سوچ سوچ کر برا حال ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ میرے اپنے گھر کے کسی فرد کا مسئلہ ہے۔ میرا کوئی قریبی ہے جو میری آنکھوں کے سامنے رفتہ رفتہ موت کے منہ میں جارہا ہے۔ میں اپنے اندر کی تبدیلی پر حیران تھا۔

چند ہفتے پہلے تک میں رخشی اور ڈاکٹر حمزہ وغیرہ کو خبطی سمجھتا تھا۔ لیکن اب سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ خبطی نہیں ہیں وہ مجھ سے بہت بہتر سوچ رکھتے ہیں۔ سمندر کی صورتحال کا اندازہ کنارے سے نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس میدان میں اترا تھا تو اندازہ ہوا تھا کہ یہاں میرے ہی جیسے جیتے جاگتے لوگوں پر کیا بیت رہی ہے...... ابھی ایک دن پہلے میں نے بڑی دردمندی کے ساتھ حاجی شمشاد کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ میری یہ عاجزی کسی ذاتی مفاد یا بچاؤ کے لیے نہیں تھی۔ ایک ننھی سی جان کی خاطر تھی جس کی طرف موت کا بے رحم سایہ بڑھ رہا تھا۔ میں چند ہی ہفتوں کے اندر اپنے آپ میں کتنا تبدیل ہو گیا تھا۔ میرے اندر مصیبت زدہ انسانیت کے لیے پیدا ہونے والی یہ تڑپ بالکل غیر ارادی اور خودرو تھی۔

اگلے دو روز میں ہم نے پوری تندہی سے اختر کی تلاش جاری رکھی۔ جہاں جہاں شک ہو سکتا تھا وہاں وہاں پتا کرایا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ تیسرے روز صبح کے وقت میں اور جبار نہر کی طرف جارہے تھے۔ گاؤں سے باہر کنویں کے پاس وڈے سائیں سے آمنا سامنا ہوا۔ حسب معمول اس کے ساتھ ہٹے کٹے مریدوں کا ایک جتھا تھا۔ وڈا سائیں کھالے میں کھڑا تھا۔ اس کی نصف پنڈلیاں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا اور اپنے جھولے میں سے کوئی چیز نکال کر بہتے پانی میں پھینک رہا تھا۔ گاؤں کے ایک شخص نے بتایا۔ ”سائیں جی! ہر چاند کی ساتویں رات کو گاؤں والوں کی سلامتی کے لیے یہ عمل کرتے ہیں۔ وہ ایک سیر کالی مرچوں پر دم کر کر کے پانی میں پھینکتے ہیں۔ گاؤں والوں کا عقیدہ ہے کہ اس طرح بچوں اور بڑوں پر سے ہر طرح کی مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔“

”سب سے بڑی مصیبت تو یہ خود ہے۔“ میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

”آپ نے کیا کہا؟“ قریب کھڑے شخص نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ یہ اپنی کوئی بات کر رہے ہیں۔“ جبار نے فوراً مداخلت کی۔

وڈے سائیں نے گردن گھما کر ہماری جانب دیکھا اس کی آنکھوں میں واضح طور پر

ناگواری چمک تھی۔ گردن اکڑا کر اس نے ایک گرج دار نعرہ بلند کیا۔ مریدوں نے بیک زبان اس نعرے کا جواب دیا۔ وڈا سائیں کالی مرچوں کی مٹھیاں بھر بھر کر پانی میں پھینکنے لگا۔ اس کا انداز سخت معاندانہ تھا۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وڈا سائیں محاذ آرائی کے موڈ میں ہے۔

میں اور جبار باتیں کرتے ہوئے نہر کی طرف پیدل چل دیئے۔ میں نے کہا۔ ”جبار بھائی! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ سارا کیا دھرا وڈے سائیں اور شمشاد علی کا ہے۔ انہی لوگوں نے اختر کو آپریشن کے نتیجے سے ڈرایا دھمکایا ہے اور اسپتال سے بھگایا ہے۔ اختر اور شہناز کو یقیناً انہی لوگوں نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ میرا تو آپ لوگوں کو اب بھی یہی مشورہ ہے کہ اختر کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے براہ راست وڈے سائیں اور حاجی شمشاد پر دباؤ ڈالا جائے اگر وہ نہ مانیں تو سیدھے پولیس میں رپورٹ درج کرادی جائے۔“

”میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا یہ کام اتنا آسان نہیں ہے ڈاکٹر باؤ! میں نے سارا پتا کیا ہے۔ وڈے سائیں کے مریدوں میں کئی نامی گرامی لوگ شامل ہیں۔ زمین دار، پولیس والے، جج اور پتا نہیں کون کون، سنا ہے کہ علاقے کا ایم پی اے بھی یہاں آتا جاتا ہے۔ ہم وڈے سائیں پر ایک پرچا کٹوائیں گے تو وہ ہم پر چار پرچے کٹوا دے گا۔ ایسے لوگ اپنی ناک اوپر رکھنے کے لیے کوئی بھی الٹا سیدھا الزام لگا دیتے ہیں۔ پرسوں ہی حاجی شمشاد کا کارندہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ڈاکٹرنی جی کا مجھ سے کیا رشتہ ہے۔ میں نے کہا وہ میری بہن ہے۔ اس کا منہ بند ہو گیا لیکن ایسے لوگ اپنا منہ دیر تک بند نہیں رکھتے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہم بے بسی سے اختر کے ملنے کا انتظار کرتے رہیں۔“

”نہیں، ہم اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ دعا بھی کریں گے کہ اللہ اس بچی کی زندگی کا وسیلہ پیدا کرے۔ ڈاکٹر باؤ! ہماری تو صرف کوشش ہی ہوتی ہے باقی کرم تو اس اوپر والے نے کرنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مٹی سے بھی شفا دیتا ہے...... ہمیں اس کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔“

”جبار بھائی! اس کی ذات پر بھروسہ رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی عقل کو استعمال کریں۔ بے شک زندگی موت دینے والی وہ ذات ہے لیکن جب ہم دعا کرتے ہیں تو اپنی آنکھیں بند نہیں کر لیتے۔ ہم پوری طرح دیکھ بھال کر قدم

اٹھاتے ہیں۔"

پانچ چھ دن مزید اسی طرح گزر گئے۔ شہناز کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ شہناز کی دادی کو شہناز سے بہت پیار تھا۔ وہ رات دن مصلے پر بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی دعائیں بھی اثر دکھانے میں ناکام تھیں۔ شہناز جہاں بھی تھی اس کے لیے دو طرح کا خطرہ تھا، ایک تو یہ کہ وہ مناسب علاج سے محروم تھی۔ دوسرے وہ غیر مناسب علاج کی زد میں تھی۔ ٹونے ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک کے نام پر اس معصوم کے ساتھ نہ معلوم کیا کچھ کیا جا رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اس کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کی معصوم ادائیں، اس کی رو پہلی دھوپ جیسی مسکراہٹ...... ایک دن جب میں کلینک میں رخشی کے ساتھ مریض دیکھ رہا تھا چوہدری جبار کا ملازم فیقا بھاگا ہوا آیا۔ اس نے رخشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میڈم جی! شہناز کے باپ کا خط آیا ہے۔ ساتھ میں شہناز کی تصویر بھی ہے۔ وہ اب ٹھیک ہے۔ شہناز کی دادی بہت خوش ہے۔"

"کب آیا ہے خط......؟"

"ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے۔ میں نے شہناز کی دادی کو خود پڑھ کر سنایا ہے۔"

میں جبار کو لے کر اختر کے گھر پہنچا۔ شہناز کی دادی بچوں میں چنے اور میٹھی پھلیاں تقسیم کر رہی تھی۔ فارغ ہو کر اس نے ہمیں بھی خط دکھایا۔ میں نے سب سے پہلے لفافے کے بارے میں پوچھا۔ میں اس پر ڈاک خانے کی مہر دیکھنا چاہتا تھا۔ شہناز کی دادی نے لفافہ ڈھونڈنا شروع کیا لیکن وہ اسے نہیں ملا۔ وہ پریشانی سے بولی۔ "ابھی میں نے ادھر ہی رکھا تھا چارپائی پر۔"

لفافہ غائب ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ پچھلے پندرہ بیس منٹ میں گاؤں کے کئی افراد یہاں آئے اور گئے ہیں۔ میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ لفافے کے غائب ہونے سے میرے اندرونی شبے کو تقویت ملی تھی۔ ہم نے خط دیکھا۔ وہ یقیناً اختر کا ہی لکھا ہوا تھا، میں اس سے پہلے اختر کی تحریر دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی ماں یعنی شہناز کی دادی کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "بے بے جی! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ شہناز اب پہلے سے کافی ٹھیک ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم اسے اسپتال سے لے آئے، ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ کچھ مجبوری ہے جس کی وجہ سے ابھی گاؤں نہیں آ سکتا اور نہ اپنا پتا بتا سکتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو دو تین ہفتے تک ہم آپ کے پاس ہوں گے۔ شہناز کے لیے دعا کرنا آپ کے لیے شہناز کی نئی

تصویر بھی بھیج رہا ہوں۔"

ساتھ میں ایک پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھی تھی۔ شہناز ہاتھ میں گڑیا پکڑے بیٹھی تھی۔ سامنے کچھ مزید کھلونے اور بسکٹ وغیرہ پڑے تھے۔ بیک گراؤنڈ سے کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ تصویر شہر کی ہے یا گاؤں کی۔ بہرحال یہ بات درست تھی کہ تصویر تازہ ہی اتاری گئی تھی۔

اس خط اور تصویر کے موصول ہونے کے صرف بیس روز بعد ایک دن دوپہر کے وقت ننھی شہناز کی لاش گاؤں پہنچ گئی۔ اس کی ماں کے بینوں سے کلیجا دہل رہا تھا۔ اس کا جاہل باپ بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ شہناز کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی موت کی وجہ دماغ کی رسولی ہے۔ رسولی پھٹ گئی تھی اور اس کا زہریلا مواد دماغ میں بہہ گیا تھا۔ شہناز کا مردہ چہرہ دیکھ کر میں اپنے آنسوؤں پر ضبط نہ رکھ سکا۔ وہ چڑیا گھر اور مینار پاکستان کی سیر کیے بغیر ان دیکھے سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔ اس کی جلیبیاں اور پکوڑے میری طرف ادھار رہ گئے تھے اور وہ ساری کہانیاں بھی جو اس نے میری گود میں بیٹھ کر سننی تھیں۔ میں اس کی لاش دیکھ رہا تھا اور میرے کانوں میں اس کی گمبھیر آواز گونج رہی تھی۔ "ڈاکٹر چاچا! آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ میں آپ کو بہت ڈھونڈتی رہی۔ آپ کیوں مجھ سے ناراض ہو گئے تھے۔ میں نے تو ساری کڑوی دوائیاں آپ کے لیے کھا لی تھیں۔ میں نے تو آپ کی ساری باتیں مان لی تھیں۔"

میں نے آگے بڑھ کر بچی کی گردن دیکھی۔ اس کے بازوؤں سے کپڑا ہٹایا اور بری طرح کانپ گیا۔ بچی کے نازک جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اسے کئی جگہوں پر گرم لوہے سے داغا گیا تھا۔ جب بچی اسپتال میں تھی اس کے ماموں نے بتایا تھا کہ کبھی کبھی وڈے سائیں کا طریقہ علاج بہت بہیمانہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے ان مریضوں کے لیے جن پر جلال سائیں کے "سایہ" وغیرہ ہوتا ہے۔ ایسے مریضوں کو سائیں کے حکم پر سائیں کے چیلے بری طرح مارتے پیٹتے ہیں اور بعض اوقات ان کی ہڈیاں تک توڑ دی جاتی ہیں۔ مریض چلاتا ہے تو اس کی چیخوں کو اس "جن" کی چیخیں قرار دیا جاتا ہے جو سائیں کے جلال مریض کو چمٹا ہوتا ہے۔ مریض کو جو نقصان پہنچتا ہے اسے "جن" کا نقصان قرار دیا جاتا ہے۔ آج بچی کے جسم پر داغے جانے کے نشان دیکھ کر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس معصوم کے اندر سے "جن" نکالتے نکالتے اس کی "جان" نکال دی گئی ہے۔

میرا خون کھول اٹھا تھا۔ بچی کی تجہیز و تکفین کے مناظر میں نے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھے۔ اردگرد سے جو آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں وہ دل کو اور بھی لہو لہان کر رہی تھیں کوئی کہہ رہا تھا۔ بس جی! ہمارا تو یقین ہے جو کچھ ہوتا ہے اوپر والے کی طرف سے ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ...... بس وہ اوپر سے لکھوا کر ہی اتنی لائی تھی۔ کسی کا خیال تھا کہ بچی کو اسپتال لے جا کر غلطی کی گئی تھی۔ ہوائی چیزوں نے برہم ہو کر بچی کی جان لی ہے۔ جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ یہ ساری وہی باتیں تھیں جو لوگوں کی صحت اور زندگی سے کھیلنے والے عطائیوں اور شعبدہ بازوں کو تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ اظہار خیال کرنے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو بچی کی موت کی وجہ جاننے کی کوشش کرتا اور اس "موت" کی ذمے داری کا تعین کرتا۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو بچی کے جاہل اور ہٹ دھرم باپ کا گریبان پکڑتا۔ وہ باپ ...... جو اس سے پہلے بھی اسی انداز میں اپنی بچی کی جان لے چکا تھا۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کا دھیان وڈے سائیں کی لن ترانیوں اور شعبدہ بازیوں کی طرف جاتا۔ بس سارے یہ کہہ کر اپنی ذمے داریوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہونی ہو کر رہتی ہے ......اور قدرت کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں ہے۔

کچھ بھی تھا میرے لیے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ میرے اندر ایک لاوا کھول رہا تھا۔ میں نے آج تک کبھی نہیں ماری تھی، کسی کا گریبان نہیں پکڑا تھا۔ لیکن آج میرے اندر کی کیفیت کچھ اور طرح کی تھی۔ شہناز کی تجہیز و تکفین کے بعد میں کچھ دیر تو راجوالی کی گلیوں میں بے قرار پھرتا رہا، پھر میرا رخ خود بخود وڈے سائیں کے ڈیرے کی طرف ہو گیا۔ وہ ایک ابر آلود رات تھی، تیز ہوا چل رہی تھی، گاہے گاہے بوندیں بھی پڑنے لگتی تھیں، جیسے ایک ادھ کھلے غنچے کے بکھر جانے پر آسمان بھی اشک بار ہو۔ جب دل رو رہا ہو تو ہر شے روتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

وڈا سائیں جو دو تین سال پہلے تک لاہور میں ریت ڈھوتا تھا اب دو کنال کی ایک پکی حویلی کا مالک تھا۔ نذرانوں میں وصول ہونے والے کئی مویشی اس کی حویلی کے احاطے میں بندھے تھے اور اس کے اصطبل میں قیمتی گھوڑیاں تھیں۔ حویلی کے بڑے دروازے پر مجھے وڈے سائیں کے دو کارندوں نے روکنا چاہا میں انہیں دھکیلتا ہوا احاطے میں چلا گیا۔

"حرام زادے باہر نکل ...... نوسر باز سائیں باہر نکل ...... تو قاتل ہے ...... تو جانور ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میرے منہ میں جو آ رہا تھا میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

سائیں تو باہر نہیں نکلا۔ اس کے کئی چیلے چانٹے نکل آئے۔ ان میں سے دو تین کے ہاتھوں میں لاٹھیاں بھی تھیں ایک نے چھوٹے دستے کی کلہاڑی پکڑ رکھی تھی۔ کلہاڑی والے نے پہلے تو مجھے دھکے دیئے۔ جب میں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا تو ایک دم بہت سے افراد مجھ پر پل پڑے میں نے تبھی حتی الامکان جواب دیا لیکن کہاں تک؟ میری قمیض پھٹ گئی۔ پاؤں سے جوتی بھی نکل گئی۔ اس وقت میری نگاہ وڈے سائیں پر پڑی۔ وہ حویلی کے محرابی دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور بڑے غصیلے انداز میں اپنے کارندوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ یقیناً یہی کہہ رہا ہو گا کہ وہ میری ہڈی پسلی ایک کر ڈالیں اور دوسرے بھی ہڈی پسلی ایک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کیچڑ کی وجہ سے میں پھسل گیا تھا، اور وہ مجھے زمین پر گرا کر مار رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک ہی کھٹکا تھا، لگتا تھا کہ ابھی کلہاڑی والے کا ہاتھ بلند ہو گا اور میرا سر لوہے کے بلیڈ کی بے انتہا سختی کو محسوس کرے گا۔ بہر طور ان لمحات میں میرے سینے میں اتنا شدید غم و غصہ تھا کہ شدید زخمی ہونے یا مرنے کا خوف اس منظر میں چلا گیا۔

اچانک میرے ڈوبتے ذہن نے ایک نسوانی آواز سنی۔ ایک نسوانی چیخ تھی جو تیزی سے قریب آ رہی تھی۔

❀❀❀

مجھے اپنے قریب بہت قریب ایک جگمگاہٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ شاید یہ کسی کلہاڑی کی چمک تھی یا کسی کنگن سے منعکس ہونے والی کرنوں کا عکس، میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ نسوانی چیخ میرے قریب آ گئی تھی اور پھر میرے ڈوبتے ذہن نے محسوس کیا کہ مجھے مارنے والوں کو پیچھے ہٹانے کے بعد کوئی میرے اوپر آن گرا ہے۔ ذہن میں جھماکا سا ہوا، وہ کوئی اور نہیں تھا رخشی تھی۔ اس کا نرم و گداز جسم کسی ڈھال کی طرح میرے سامنے آ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جو لاٹھیاں پہلے مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ اب وہ رخشی کے جسم پر پڑ رہی ہیں۔ نیم جان ہونے کے باوجود میرے سینے میں شعلے لپک گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا یا کرنے کا سوچتا مجھے مارنے والے پیچھے ہٹ گئے۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، رخشی مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے نرم ریشمی بالوں کا لمس میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ گھٹنے سے نیچے میری ٹانگ بالکل سن ہے اور میرے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلتا چلا جا رہا ہے پھر میں نے محسوس کیا کہ وڈے سائیں کے کارندے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر وحشیانہ انداز میں حویلی کے اندرونی حصے کی طرف گھسیٹنا چاہ رہے ہیں جبکہ رخشی انہیں اس عمل سے روک رہی ہے۔ غلیظ گالیوں کی آوازیں جیسے میرے کانوں میں کہیں بہت دور سے آ رہی تھیں۔ میں کیچڑ پر گھسٹ رہا تھا اور سخت سنگریزے میری پشت پر چبھ رہے تھے۔

میں نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا، ایک رائفل کی نال بھی گاہے گاہے میری طرف اٹھ جاتی تھی، جسے رخشی ہر بار مجھ سے دور ہٹا دیتی تھی۔ پھر میں نے رخشی کو وڈے سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑتے دیکھا۔ وہ وڈے سائیں کی منت سماجت کر رہی تھی۔ میری جان بخشی کی التجائیں اس کے لبوں پر تھیں۔ وڈا سائیں فاتحانہ تکبر کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ سخت ترین وقت ٹل گیا ہے۔ مجھے کھینچنے اور گھسیٹنے والے پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رخشی شاید رو رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔ وہ اسی دوپٹے کے ساتھ

گاہے گاہے میرے سر کو چھو رہی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ میرے سر پر شدید چوٹ آئی ہے اور ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ چوٹیں آئی ہوں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ مجھے اٹھا کر ایک بھیگی ہوئی چارپائی پر ڈالا جا رہا تھا۔ اس کے بعد کے مناظر ایک گہری تاریکی میں اوجھل ہو گئے تھے۔

مجھے ہوش آیا تو میں لاہور کے شیخ زید اسپتال میں تھا۔ میرے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ایک ٹانگ بھی پلاستر میں جکڑی ہوئی تھی۔ عزیز و اقارب ارد گرد موجود تھے۔ رخشی بھی تھی۔ اس کی پیشانی پر پٹی چپکی ہوئی تھی۔ کلائی پر بھی پٹی بندھی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”تم بالکل ٹھیک ہو۔“

والدہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ والد صاحب نے کندھا تھپتھپایا۔ سب کی آنکھوں میں فکر کے آنسو تھے۔ اگلے 48 گھنٹے میں میری طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی۔ مجھے اپنی ٹوٹ پھوٹ کے بارے میں مکمل تفصیل معلوم ہو چکی تھی۔ سر پر لاٹھیوں کی وجہ سے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ان چوٹوں کے سبب کم و بیش تیس ٹانکے لگے تھے۔ میری بائیں پنڈلی میں ایک باریک فریکچر ہوا تھا۔ اس فریکچر کے سبب میں آرتھو پیڈک وارڈ میں تھا۔ ڈاکٹر صاحبان نے ٹانگ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ بس پلاستر کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں پانچ چھ ہفتے آرام کر لوں گا تو فریکچر ٹھیک ہو جائے گا۔

راجوالی میں جو کچھ ہوا وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ وڈے سائیں کے کارندوں نے میرے انکار کے جواب میں بڑا شدید رد عمل ظاہر کیا تھا۔ انہوں نے مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ شاید اگر رخشی میرے پیچھے بھاگتے ہوئے بروقت موقع پر نہ پہنچتی اور میرے لیے خود کو ڈھال نہ بناتی تو میری اور کئی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتیں۔ اس نے غضب ناک وڈے سائیں سے اور وڈے سائیں کے بپھرے ہوئے کارندوں سے منت سماجت کر کے بمشکل میری گلو خلاصی کرائی تھی۔

بعد ازاں چودھری جبار کو پتا چلا تھا۔ جس وقت مجھ پر تشدد کا واقعہ ہوا چودھری جبار اتفاقاً لاہور آیا ہوا تھا۔ اسے اطلاع ملی تو وہ شدید طیش میں آ گیا۔ وہ وڈے سائیں اور [illegible] وغیرہ سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا مگر رخشی کی کوشش سے وہ رک گیا۔ رخشی کی بات ٹالنا جبار کے لیے کبھی بھی ممکن نہیں ہوتا تھا۔ چودھری جبار بھی اب رخشی کے ساتھ لاہور میں ہی تھا۔ وہ میری چوٹوں کے حوالے سے ابھی تک پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ جبار کو

اس امر کا شکوہ بھی تھا کہ اگر میں نے وڈے سائیں کی طرف جانا ہی تھا تو کم از کم اس کا انتظار ہی کر لیتا۔

میں اسے کیا بتاتا کہ ننھی شہناز کی لاش دیکھ کر مجھ پر کیا گزری تھی۔ اس بدنصیب کا چہرہ ابھی تک میری نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ اسے منوں مٹی کے نیچے گئے اب تقریباً تین دن ہو گئے تھے لیکن وہ ابھی تک میرے ارد گرد گھوم رہی تھی۔ مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا ہر ہر انداز میرے ذہن میں نقش تھا۔

❁❁❁

میں قریباً چار ہفتے اسپتال میں رہا۔ اس دوران رخشی کا ایک اور روپ میرے سامنے آیا۔ وہ بے حد ہمدرد اور غمگسار تھی۔ کسی وقت تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ یہ میری نہیں اس کی تکلیف ہے۔ وہ قریباً ہر روز اسپتال آتی تھی اور اس وقت جاتی تھی جب میں ہاتھ جوڑ کر جانے کے لیے کہتا تھا۔ مجھے اس کی مصروفیات کا علم تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس رہے گی تو اس کے کتنے کام بگڑیں گے اور اس حوالے سے لوگوں کے کتنے کام بگڑیں گے۔

میرے والد اور بھائی ان لوگوں کے خلاف کیس کی پیروی کرنا چاہتے تھے جنہوں نے مجھے لہولہان کر کے اسپتال پہنچایا تھا۔ چوہدری جبار بھی اس سلسلے میں پرجوش تھا لیکن ڈاکٹر رخشی اور ڈاکٹر حمزہ وغیرہ کی رائے مختلف تھی۔ (میرے اور ڈاکٹر حمزہ کے اکثر خیالات ملتے تھے۔ وہ ایک ہمدرد اور دانا دوست تھا۔ درحقیقت اکمل سے دور ہونے کے بعد میں حمزہ کے نزدیک آیا تھا۔ ہم ایک دوسرے پر غیر معمولی اعتماد کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تھائی لینڈ اور سون کے حوالے سے بھی میں نے کچھ باتیں حمزہ کو بتائی تھیں) رخشی کو یقین تھا کہ اس کیس کی بھرپور پیروی کرنے کے نتیجے میں سوائے مقدمے بازی اور عداوت کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس عداوت سے کسی اور کو نقصان ہوتا یا نہ ہوتا لیکن ان لوگوں کو نقصان ضرور ہونا تھا جو اب علاقے میں دو کلینک کھلنے کی وجہ سے علاج معالجے کی سہولتیں حاصل کر رہے تھے۔

میں جتنے دن اسپتال میں رہا رخشی مجھے مسلسل صبر وتحمل کی تلقین کرتی رہی تھی۔ جس طرح مسلسل برسنے والی مدھم بارش زمین کے اندر دور تک جذب ہو جاتی ہے، رخشی کی باتیں بھی میرے اندر خوب گہرائی میں جذب ہو رہی تھیں۔ میں بزدل نہیں تھا، اپنی طرف

[illegible] جانے والے شخص کا پنجہ پوری طاقت سے مروڑ سکتا تھا مگر میرے اس طرح پنجہ [illegible] والے کے نتائج رخشی کے مقاصد پر اثر انداز ہوتے تھے۔ میں بتدریج کوشش کر رہا تھا کہ ان واقعات کو بھول جاؤں مگر بھولنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ خاص طور سے رخشی کی [illegible] کے مناظر ذہن سے چپک گئے تھے۔

اس نے کیچڑ آلود زمین پر گھٹنے ٹیک کر وڈے سائیں کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ اس وقت اس کا دوپٹا زمین پر گرا ہوا تھا۔ وڈے سائیں کی رعونت، اس کا فاتحانہ انداز سب کچھ مجھے یاد تھا۔

اسپتال میں قیام کے دوران کئی بار مجھے اس واقعے کی یاد بھی آئی جب ایک ابر آلود [illegible] ہماری جیپ کھڈے میں پھنس گئی تھی اور چوہدری جبار کو ٹریکٹر لانے کے لیے [illegible] کرنا پڑی تھی۔ اس رات جیپ کے اندر بیٹھے بیٹھے میرے اور رخشی کے درمیان [illegible] ہوئی تھیں وہ بڑی واشگاف اور اہم تھیں۔ میں نے کہا تھا۔ ”دل کو دل سے راہ [illegible] رخشی! اگر تم میرے متعلق اچھی سوچ رکھتی ہو تو میں بھی رکھتا ہوں۔ خاص طور سے [illegible] ساتھ گاؤں میں آنے کے بعد میں نے اکثر تمہارے بارے میں سوچا ہے۔ [illegible] کام کی اہمیت مجھ پر واضح ہوئی ہے۔“ جواب میں رخشی نے ذرا شوخی سے پوچھا [illegible] کام کی اہمیت؟ مجھے جواب دینا پڑا تھا کہ نہیں تمہاری بھی۔ اس نے بڑی [illegible] سر میرے شانے سے لگا دیا تھا۔

اس [illegible] کے بعد جب بھی رخشی سے میری آنکھیں ملی تھیں مجھے ان میں ایک خاص [illegible] تھا۔ جیسے وہ ہر بار مجھے وہی واقعہ یاد دلاتی ہو۔ اسی واقعے کے حوالے سے مزید [illegible] جاتی ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جو بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا [illegible] کے جسم کا ہر عضو کسی دوسرے انداز سے کہنے لگتا ہے۔ خاموشیوں میں تکلم اتر [illegible] یہ تکلم اتنا واضح ہوتا ہے کہ آنکھیں اور کان بند کر لینے سے بھی سنائی اور دکھائی [illegible]

[illegible] اسپتال کے پرائیویٹ روم میں تھا۔ اکثر بھائی یا والدہ میرے پاس ہوتے تھے۔ [illegible] کوئی نہیں تھا۔ بھائی جمعے کی نماز پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ رخشی آ گئی۔ وہ [illegible] ایک دیہاتی دورے پر جا رہی تھی لہٰذا میرے پاس زیادہ دیر بیٹھنے کا ارادہ [illegible] اس کی موجودگی میں ہی مجھے باتھ روم کی حاجت محسوس ہوئی۔ کسی کے سہارے

کے بغیر چلنا ابھی میرے لیے مشکل تھا۔ مجبوراً مجھے رخشی کا سہارا لینا پڑا۔ لچکیلی شاخ سا جسم میرے کندھے کے نیچے تھا۔ اس کے ملائم بال میرے چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ باتھ روم سے واپسی پر رخشی نے مجھے تھام لیا۔ جب میں اس کا سہارا لیتے ہوئے آرام کے ساتھ بستر پر دراز ہوا تو رخشی کے بال میری قمیض کے بٹنوں سے کہیں الجھ گئے۔ وہ میرے اوپر جھکی کی جھکی رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے سسکاری سی نکل گئی تھی۔

وہ میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے بال چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ ذرا شوخ نظروں سے مجھے دیکھتی بھی جا رہی تھی۔ ”بھئی جلدی کرو۔“ میں نے کہا۔

”کیا بات ہے یہ اتفاقیہ قربت بھی تمہیں اچھی نہیں لگی؟“ وہ انگلش میں بولی۔

”یہ بات نہیں۔ ابھی کوئی آ گیا تو پتا نہیں کیا سمجھ بیٹھے۔“

”بہت ڈرتے ہو......“

”ڈرنا ہی پڑتا ہے۔“

”اس وقت تو نہیں ڈرے تھے، جب سلطان راہی بن کر وڈے سائیں کی طرف چلے گئے تھے۔“

”سچ کہتا ہوں رخشی! اس وقت میرا دماغ ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔ سائیں سامنے آ جاتا تو پتا نہیں میں کیا کر گزرتا۔“

”مجھے تمہارا چہرہ دیکھ کر بہت کچھ پتا چل جاتا ہے۔ جب تم نکلے تھے مجھے اسی وقت شبہ ہو گیا تھا کہ تم وڈے سائیں کی طرف جاؤ گے۔ میں جب وہاں پہنچی پانچ چھ بندے تم سے چمٹے ہوئے تھے۔ تم ان کے درمیان نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔“

”مجھے بہت دکھ ہے کہ میری وجہ سے تمہیں بھی لاٹھیاں کھانا پڑیں۔“

”ان لاٹھیوں کی مجھے بالکل بھی تکلیف نہیں ہوئی۔“ وہ عجیب انداز میں بولی اور کسی اندرونی جذبے کی لو سے اس کا چہرہ شفق رنگ ہو گیا۔

اکثر اس قسم کے مکالمے ہمارے درمیان ہو جاتے تھے۔ میں اب رخشی کے جذبات کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وہ جس رخ پر سوچ رہی تھی میں اس رخ کو بڑی وضاحت سے جان گیا تھا مگر پتا نہیں کیا بات تھی۔ رخشی کے لیے میرے دل میں اب بھی وہ لطیف ترین جذبات پیدا نہیں ہو سکے تھے جنہیں محبت کا نام دیا جا سکتا۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔

مجھے اس کی شخصیت اور اس کے خیالات سے لگاؤ محسوس ہوتا تھا۔ اس سے دور رہ کر مجھے ادھورے پن کا احساس ہونے لگتا تھا، لیکن اس کے باوجود کہیں پر کوئی کمی تھی، کوئی خلا سا تھا۔

میں اس خلا کے بارے میں سوچتا اور دیر تک سوچتا رہتا۔ مجھے لگتا تھا کہ میں رخشی کا نہیں ہوں۔ کسی اور کا ہوں۔ کوئی دور سے...... بہت دور سے مجھے پکارتا ہے۔ کوئی الوہی صدا ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ کون تھا؟ یہ کس کی صدا تھی؟ یہ کہاں سے آئی تھی؟ پھر کسی وقت بیٹھے بیٹھے میری نگاہوں میں ایک منظر گھوم جاتا۔ میرے سامنے دو ہونٹ آ جاتے...... بہت نرم...... بہت خوبصورت، زندگی کی حرارت اور رعنائی سے بھرپور، میں ان ہونٹوں کی طرف بڑھتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ میرے اور ان ہونٹوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے مگر اچانک وہ ہونٹ میرے سامنے سے ہٹ جاتے۔ میں دل مسوس کر رہ جاتا اور ایک سندری نظم میٹھی سی لے میں میرے کانوں میں گونجنے لگتی۔ ہاں یہ وہی نظم تھی جس میں وسیع و عریض سمندر کا ذکر تھا۔ اور اس حیران بلبل کا ذکر تھا جو پام کے ایک بلند درخت پر بیٹھ کر دور تک دیکھتا ہے اور سوچتا ہے۔ یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ہوا کہاں سے چلتی ہے؟ یہ سورج کی سرخ گیند کہاں اوجھل ہوتی ہے؟ وہ اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جس طرح رات کو تھم جانے والی ہوا صبح کے وقت پھر چلنے لگتی ہے۔ جس طرح گم ہونے والا سورج دوبارہ آسمان پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا ساتھی جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا پھر آ جائے گا۔

مجھے لگتا کہ میں بنکاک کو یاد کر رہا ہوں اور اس لڑکی کو یاد کر رہا ہوں جس کا نام سون تھا اور جس نے بنکاک کی جگمگاتی روشنیوں کے درمیان میری طرف ڈبڈبائی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تھا۔ ”ٹورسٹ! جہاں بہت سی باتیں ان کہی رہ گئی ہیں، اس ”بات“ کو بھی ان کہا رہنے دو۔ میں تمہارے اس بوسے کو یاد رکھوں گی جو تمہارے ہونٹوں سے کبھی میرے ہونٹوں تک نہ پہنچ سکا۔“

وہ بنکاک میں گھومنے والی ایک عام سی لڑکی تھی، لیکن وہ میرے لیے عام نہیں رہی تھی۔ لیکن اس نے وقت رخصت میرے اندر ایک ایسی کسک چھوڑی تھی جو غیر محسوس طور پر میرے وجود کے نہاں خانوں میں سرایت کر گئی تھی۔ یقیناً یہی وہ خلا تھا جو اکثر مجھے اپنی ادھورگی کا احساس دلاتا تھا۔ جو میرے اندر بسیرا کیے ہوئے تھا۔

جو کچھ بھی تھا، میں ایک حقیقت پسند شخص تھا۔ موہوم خوابوں کے پیچھے بھاگنا مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ ہمارے والد نے ہماری تربیت میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا تھا وہ کردار کی پختگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر قسم کے ماحول میں رہنے کے باوجود خرافات سے کافی فاصلے پر رہا تھا۔ میں اپنے اکثر ایسے دوستوں کو تنقیدی نظروں سے دیکھتا تھا جو رومانی معاملات کو اپنی زندگی پر حاوی کر لیتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے ٹھنڈی آہیں بھرتے تھے اور جاگتی آنکھوں سے جھلک خواب بننا شروع کر دیتے تھے پچھلے کچھ عرصہ سے میں اکمل سے بھی بہت دور ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ بنکاک میں میرے سامنے اس کا ایک مختلف روپ آیا تھا۔ وہ بڑے عامیانہ انداز میں آناً فاناً بنکاک کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور میں ایک دوست کی حیثیت سے حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اب بھی کبھار اکمل سے ملاقات ہوتی تھی لیکن تعلقات میں وہ پہلے سی گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ اکمل آج کل بزنس میں والد کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

رخشی والے معاملے میں بھی کبھی کبھی میں بے حد سنجیدگی سے سوچتا تھا۔ اس بارے میں چوہدری جبار سے بھی ایک دو بار میری بات ہوئی تھی۔ چوہدری جبار اب مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ مجھے ڈاکٹر باؤ کہہ کر مخاطب کرتا تھا جبکہ میں اسے جبار بھائی کہتا تھا۔ وہ پنجابی ''گنے'' کی طرح تھا۔ اوپر سے سخت لیکن اندر سے نرم اور رس بھرا۔ گنے ہی کی طرح وہ اونچا لمبا اور مضبوط بھی تھا۔ اس کی باتوں میں ایک خاص قسم کی دیہاتی دانائی بھی اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ جس دن میں اسپتال سے گھر واپس آیا، والدہ نے گڑ والے چاول پکائے اور بچوں میں تقسیم کیے۔ یہ والدہ کا ''خوش ہونے کا'' اپنا انداز تھا۔ وہ بڑے اہتمام سے گڑ والے چاول پکواتی تھیں۔ بادام، ناریل، کشمش، سونف اور نہ جانے کیا کچھ شامل ہوتا تھا۔ میں اور جبار بھائی کمرے میں بیٹھے تھے۔ بڑے شوق سے چاولوں کا نوالہ لینے کے بعد جبار بھائی نے اپنا دھیان پلیٹ ہی کی طرف رکھا اور کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر باؤ! تم رخشی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔'' وہ ایسے ہی اچانک بات کر دیا کرتا تھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتایا بھی تھا جبار بھائی! اس سلسلے میں وہی کروں گا جو بڑوں کی مرضی ہو گی۔''

''یعنی تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں؟''

''مرضی والی بات بھی میں نے تمہیں بتائی ہی تھی۔ مجھے رخشی سے زیادہ اس کے کام سے لگاؤ ہے۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے جبار بھائی وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے میں رخشی کو خبطی سمجھتا تھا لیکن اب اپنی سوچ پر افسوس ہوتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ آپ لوگوں نے میرے خیالات کو حیران کن حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ خاص طور سے رخشی کی لگن اور محنت تو دل کے اندر اتر جانے والی چیز ہے۔''

جبار نے کہا۔ ''میں بھی تو یہی کہتا ہوں ڈاکٹر باؤ! رخشی جو کام کر رہی ہے اس کو جاری رہنا چاہیے۔ اس میں بہت سوں کا بھلا ہے۔ پتا نہیں شہناز جیسی کتنی بچیاں بے موت نہیں مریں گی...... ڈاکٹر باؤ! میں سچ کہہ رہا ہوں اگر تم رخشی کا سہارا بن جاؤ تو وہ بڑی مضبوط ہو جائے گی۔ اس کے پاؤں زمین پر بڑے پکے جم جائیں گے۔ میں کئی بار یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہوں کہ اگر رخشی کو کوئی الٹے دماغ کا خاوند مل گیا تو کیا ہو گا پھر تو سب کچھ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ پتا نہیں کیسی کیسی پابندیاں لگ جائیں بے چاری پر۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے جبار بھائی لیکن......''

''یار! تم پڑھے لکھے لوگ اس ''لیکن'' کے بعد جو بات کرتے ہو وہ بڑی اوکھی ہوتی ہے۔ ''لیکن'' کو چھوڑ کر ذرا آرام سے اس معاملے پر غور کرو۔ شاید تمہیں پتا نہ ہو راجوالی میں تمہارے آنے کے بعد ایک اور بات بھی نکلی تھی۔ حاجی شمشاد کے ایک رشتے دار نے کہا تھا کہ رخشی اور ڈاکٹر شاد میں کیا رشتہ تھا؟ ایسے لوگ بات کا بتنگڑ بنانے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کرتے۔ اگر رخشی کو تمہارا آسرا مل جائے گا تو وہ آزادی سے ہر جگہ آ جا سکے گی۔ حاجی شمشاد جیسے لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں گے۔ تم دونوں ایک اور ایک دو نہیں ہو گے ایک اور ایک گیارہ بنو گے۔''

جبار کی باتیں میرے دل کو لگتی تھیں کیونکہ میرے اپنے ذہن میں بھی اس سے ملتی جلتی سوچ موجود تھی۔ خاندانی اعتبار سے بھی یہ رشتہ میرے لیے موزوں تھا۔ میں جانتا تھا کہ ''ابا جی'' زبان سے نہیں کہتے مگر ان کی دلی خواہش ہے کہ رخشی ہمارے گھر آ جائے۔ امی کے ذہن میں ہمیشہ سے تیز طرار بہو کے حوالے سے ایک خوف رہا تھا۔ بھابی نے یہ خوف اس طریقے سے دور کیا تھا کہ امی دن رات بھابی کے قصیدے پڑھتی تھیں۔ امی کو بھی لاڈلی ہوتی اگر بھابی کی بہن ان کی دوسری بہو بن جاتی۔

''[illegible] تک میں سہارے کے بغیر آسانی سے چلنے لگا۔ ایم بی بی ایس کا رزلٹ آ چکا تھا۔ میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ رخشی کا مشورہ تھا کہ میں آر سی ٹی ایم کروں لیکن

میری دلچسپی کسی حد تک سرجری میں تھی۔ اس کے علاوہ میرے بڑے ماموں کی بھی یہی
خواہش تھی۔ وہ خود بھی ڈاکٹر تھے اور انہوں نے ''ایڈنبرا'' سے ایف آر سی ایس کی ڈگری لی
ہوئی تھی۔
میرا ارادہ یہی تھا کہ پہلی فرصت میں ایف آر سی ایس کروں گا۔ فی الحال میں کچھ عرصہ
سروس کرنے کے ساتھ ساتھ رخشی کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔
ایک بار راجوالی سے آنے کے بعد میں دوبارہ وہاں نہیں گیا، لیکن وڈے سائیں کی
صورت اور اس کا کردار میرے ذہن میں بدستور موجود رہا۔ میں وڈے سائیں کو نہیں بھول
سکا، کیونکہ میں اپنی چوٹوں کو نہیں بھولا تھا، اور شہناز کی موت کو نہیں بھولا تھا، اور اس
شرمناک تسلط کو نہیں بھولا تھا جو وڈے سائیں اور حاجی شمشاد جیسے لوگوں نے دور افتادہ
علاقوں میں قائم کر رکھا تھا۔ چند سال پہلے تک ٹرکوں میں ریت لادنے والا شخص ایک
''عالی مرتبت بزرگ'' بنا بیٹھا تھا اور ان گنت طریقوں سے سادہ لوح لوگوں کا استحصال کر
رہا تھا۔
وڈے سائیں اور حاجی شمشاد کے بارے میں مجھے اور کئی باتیں بھی معلوم ہوئی تھیں۔
درحقیقت یہ دونوں ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ یہ دونوں مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کو
فائدہ پہنچاتے تھے۔ ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھتے تھے لیکن بظاہر ان میں کوئی
خاص تعلق موجود نہیں تھا۔
حاجی شمشاد نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ اس کی تیسری شادی وڈے سائیں کی ایک
خوبصورت مریدنی سے ہوئی تھی۔ دوسری طرف وڈے سائیں نے حاجی شمشاد کی اعانت
سے اپنی حویلی سے ملحقہ کئی ایکڑ زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ
علاقے کا ایک بااثر سیاست دان جو کوراان پڑھ ہونے کے باوجود وزارت کے منصب پر
فائز ہو چکا تھا وڈے سائیں کا ''اندھا عقیدت مند'' تھا۔ اس شخص کے بل بوتے پر وڈے
سائیں کو اپنے اردگرد کے لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ ننھی شہناز کی
موت سے دو چار دن قبل ہی رخشی کو یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ وڈے سائیں کی پہنچ اوپر
تک ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے وڈے سائیں کے ساتھ محاذ آرائی سے روک رہی تھی۔
میرے زخمی ہو کر لاہور آ جانے کے بعد رخشی نے بڑے تحمل اور دانش مندی سے اس
سارے معاملے کو سنبھالا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وڈے سائیں سے ہماری چپقلش کی وجہ

سے علاقے کے غریب و بے وسیلہ لوگوں کا نقصان ہو۔ یہ رخشی کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا
کہ بعد میں حاجی شمشاد نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا تھا۔ حاجی شمشاد ایک روز
اسپتال میں میری مزاج پرسی کے لیے بھی آیا تھا۔ اس کے ساتھ وڈے سائیں کے دو
کارندے بھی تھے جنہوں نے مجھ سے مار پیٹ کرنے کے حوالے سے رسمی سی معذرت کی
تھی۔

میں دوبارہ راجوالی تو نہیں گیا لیکن راجوالی جانے سے میری آنکھوں کے سامنے سے
جو پردہ اٹھا تھا اس نے مجھے بہت دور تک اور بہت گہرائی تک دیکھنے کی طاقت بخشی تھی۔
مجھے پتا چلا کہ پاکستان میں کم سن بچوں کی شرح اموات حیران کن حد تک زیادہ کیوں
ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ملک عزیز میں ہر چند منٹ بعد ایک ماں زچگی کے دوران کیوں مر
جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے دیہی علاقے میں زکام، بخار اور پیچش جیسی معمولی
بیماریاں بھی مریض کو قبر تک کس طرح پہنچاتی ہیں۔ میں جوں جوں جان رہا تھا توں توں
بے قرار ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کیا ہم واقعی اکیسویں صدی کے کنارے پر
کھڑے ہیں۔ میں تن من دھن سے رخشی کے ساتھ مصروف کار ہو گیا تھا۔ میرے دو ڈاکٹر
دوست کامران اور عمر بھی اس کار خیر میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگے تھے۔ ہمیں ایک لیڈی ڈاکٹر
کی ضرورت بھی تھی مگر فی الحال لیڈی ڈاکٹر دستیاب نہیں ہو رہی تھی۔ دور دراز علاقوں میں
لیڈی ڈاکٹر کا پہنچنا اور وہاں قیام کرنا واقعی ایک کار دشوار تھا۔ اس کے لیے رخشی جیسا آہنی
عزم اور حوصلہ درکار تھا۔ ایک دو لیڈی ڈاکٹرز نے ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا ارادہ
ظاہر کیا لیکن سفر اور رہائش کی نہایت ناکافی سہولتوں کے سبب وہ چند روز میں ہی ہمت ہار
گئیں۔

میں اور میرے ساتھی ڈاکٹر حمزہ اور کامران نے لاہور اور شیخوپورہ کے درمیانی علاقے
میں کام کا آغاز کر دیا تھا۔ یہاں ہم نے مقامی مخیر حضرات کے تعاون سے چار ہیلتھ سینٹر
قائم کیے۔ اپنی مصروفیات میں سے باری باری وقت نکال کر ہم ہفتے میں کم از کم چار دن
ان سینٹرز میں ضرور پہنچتے تھے گاہے گاہے رخشی بھی وزٹ کرتی تھی۔
امی مجھ سے بہت خوش تھی۔ مہینے میں ایک آدھ بار ہم کسی نہ کسی طرح تھوڑا سا وقت
اپنے لیے بھی نکال لیتے تھے شاہراہ قائد اعظم اور نہر کا کنارہ ہماری پسندیدہ جگہ تھی۔ ہم
گاڑی میں نہر کے کنارے ہلکی رفتار سے ڈرائیو کرتے، میوزک سنتے، پھر کسی ہوٹل میں کھانا

کھاتے اور گھر آ جاتے۔ ہماری منگنی کی بات چل رہی تھی۔ ایک دن میں چھت پر کھڑا تھا۔ والدہ یوں چپکے سے آئیں کہ مجھے پتا نہیں چلا۔ کہنے لگیں۔ ''شاد! تیرے ابو نے کہا تھا کہ ایک بار شاد سے اچھی طرح پوچھ لو۔''

''کیا مطلب؟''

''کسی اور کو پسند تو نہیں کرتا تو۔''

ایک لحظے کے لیے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ دو خوبصورت ہونٹ ایک ساعت کے لیے نگاہوں کے عین سامنے آئے اور پھر اوجھل ہو گئے۔ میں نے سر جھٹک کر والدہ کی طرف دیکھا۔ ان کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ آنکھوں میں امید و بیم کی کیفیت تھی۔ میں نے چند لمحوں کے لیے خود کو خلا میں معلق پایا۔ نہ زمین مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی، نہ آسمان۔ یکسر بے وزنی تھی۔ یکسر بے ستی۔ میں یونہی بے مقصد چھت کے فرش کو گھورتا رہا پھر میں نے کہا۔ ''میری کوئی مرضی نہیں ہے امی! جو آپ سب کی خوشی ہے وہی میری ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے کہ میں بہن رضیہ سے بات کر لوں۔'' والدہ کی آواز میں خوشی کی ہلکی سی لرزش تھی۔

''جیسے آپ چاہیں۔'' میں نے کہا۔

والدہ میرے سر پر ہاتھ پھیر کر نیچے چلی گئیں۔ میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا، میں اس خوشی کے موقعے پر بھی اداس سا کیوں ہوں۔ مجھے کسی کا انتظار نہیں...... نہ کسی کو میرا انتظار ہے۔ میں نے کسی سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ نہ کسی نے مجھ سے کوئی وعدہ کیا ہے۔ میں کسی منزل کا راہی نہیں ہوں، میں کسی خواب کی تعبیر نہیں ڈھونڈ رہا...... پھر ایسا کیوں ہے۔ روح کے اندر ایک خلا سا کیوں محسوس ہوتا ہے۔''

چند روز بعد ایک سادہ سی گھریلو تقریب میں میری اور رخشی کی منگنی ہو گئی۔ ایک انگوٹھی میری انگلی میں آ گئی اور ایک رخشی کی انگلی میں دمک اٹھی۔ اس دن رخشی بہت خوش تھی۔ رخشی کے علاوہ میں نے جس شخص کو سب سے زیادہ خوش دیکھا وہ چوہدری جبار تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ میں شیخ زید اسپتال میں سروس کر رہا تھا پڑھائی بھی جاری تھی۔ پڑھائی کا خاصا بوجھ تھا پھر دیگر مصروفیات کے علاوہ دیہی کلینکس کے لیے بھی باقاعدگی سے وقت نکالنا پڑتا تھا۔ ایسے دوروں پر اکثر رخشی میرے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ جب ہم اکٹھے ہوتے تھے وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ چوہدری جبار، ڈاکٹر حمزہ،

ڈاکٹر کامران یہ سب محنتی اور خوش مزاج لوگ تھے۔ ہم سب کی ایک ٹیم سی بن گئی تھی۔ کٹھن سے کٹھن کام کو بھی ہم انجوائے کرتے تھے۔ مشکلات کا مل کر مقابلہ کرنا ہماری عادت ثانیہ بن گیا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ میرے علاوہ رخشی سے بھی بہت بے تکلف تھا۔ وہ مجھے اور رخشی کو چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ کو اگلے سال کے شروع میں ''ایم ڈی'' کرنے کے لیے امریکا جانا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اگلے سال مارچ سے پہلے پہلے ہماری شادی ہو جائے لیکن اس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ مجھے ابھی ڈگری کے حصول کے لیے کم از کم دو سال درکار تھے اور ڈگری سے پہلے میں کسی طور شادی کرنا نہیں چاہتا تھا، دوسری طرف رخشی کے خیالات بھی مجھ سے ملتے جلتے تھے۔

رخشی مجھے چاہتی تھی۔ دل و جان سے اپنانا چاہتی تھی لیکن وہ کچھ بھی مجھ پر ٹھونسنا نہیں چاہتی تھی۔ تنہائی میں اس نے ایک دو بار مجھ سے ایک عجیب بات کہی تھی۔ ''شاد! اگر کبھی کسی وجہ سے تم اپنا راستہ بدلنا چاہو تو دل پر کوئی بوجھ لیے بغیر بدل لینا۔ بس مجھے اتنا کہہ دینا، گڈ بائی رخشی! میں جا رہا ہوں اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو تو مجھے ایک فون کر دینا یا چند سطریں ہی لکھ دینا۔ فنش!'' کبھی کبھی وہ ایسی ہی ''درویشانہ'' باتیں کیا کرتی تھی۔

اسی طرح دو سال مزید گزر گئے۔ دیہات میں ہمارا ہیلتھ ویلفیئر کا کام بہت اچھا جا رہا تھا کئی "میل" اور "فی میل" ڈاکٹرز اب اس کام میں شریک ہو چکے تھے۔ ہمیں گاہے گاہے اسپیشلسٹس کی خدمات بھی حاصل ہو جاتی تھیں۔ اپنی اس آرگنائزیشن کا نام ہم نے آر، ایچ، ڈبلیو رکھا تھا۔ یہ "رورل ہیلتھ ویلفیئر" کا مخفف تھا۔

اب ہماری آرگنائزیشن کو حکومتی سطح پر بھی شناخت کیا جانے لگا تھا۔ یہ 1998ء کی بات ہے جب وزارت صحت کی طرف سے ایک مطالعاتی دورے کا اہتمام کیا گیا۔ اس دورے میں ہماری آرگنائزیشن کے چند ممبران کو بھی شامل کیا گیا۔ ان ممبران میں آرگنائزیشن کی بنیادی رکن رخشی کے علاوہ میں اور ڈاکٹر حمزہ بھی شامل تھے۔ بعد میں ایک چھوٹی سی بدمزگی کے بعد ڈاکٹر کامران بھی شامل ہو گئے۔ اس مطالعاتی دورے میں ہمیں ملائشیا، سنگاپور اور تھائی لینڈ وغیرہ جانا تھا۔ ہمارا فوکس رورل ایریاز (دیہاتی علاقوں) پر تھا۔ ہمیں یہ مشاہدہ کرنا تھا کہ ان علاقوں میں صحت کے حوالے سے وہیں مسائل کیا ہیں اور وہاں کے لوگ ان مسائل پر کس طرح قابو پا رہے ہیں۔ یاد رہے کہ روایتی اعتبار سے اس خطے کے لوگ بھی مشرقی ہیں اور یہاں بھی کمزور عقائد اور توہمات کے رجحانات ہماری طرح ہی موجود ہیں۔

ہمارے دورے میں تھائی لینڈ بھی شامل تھا۔ تھائی لینڈ کا تصور ذہن میں آتے ہی فوراً بنکاک کا خیال بھی ذہن میں آ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بھولی بسری صورت نگاہوں میں گھومنے لگتی تھی۔ وہی لڑکی جس کی جلد سورج کی پہلی کرن کی طرح شفاف تھی، جس کی کلائی میں ایک کنگن چمکتا تھا اور جس نے جگمگاتی رات میں ایک رکشا پر سفر کرتے ہوئے مجھے سمندر اور بلبل والی نظم سنائی تھی۔ ایک نہایت بدنام پیشے سے منسلک ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر معصومیت کے رنگ نظر آتے تھے۔

اس لڑکی کو آخری بار میں نے قریباً چار سال پہلے دیکھا تھا۔ اس کے بعد مجھے اس کی

کوئی خبر نہیں تھی اور یقیناً اسے بھی میری کوئی خبر نہیں تھی۔ زندگی کے سمندر میں واقعات کی لہروں پر بہتی ہوئی وہ نجانے کہاں پہنچ چکی تھی؟ کس حال میں تھی؟ تھائی لینڈ میں تھی یا کہیں اور جا چکی تھی؟ تھائی لینڈ کا تصور ذہن میں آتے ہی دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے تہ دل سے سوچا کہ ہمارے ٹور میں تھائی لینڈ نہ ہی شامل ہوتا تو اچھا تھا۔

ہمارا دورہ اگست کے وسط میں شروع ہوا، ہم پہلے سنگاپور پہنچے۔ سنگاپور بس ایک جزیرے کا نام ہے جس میں ساری کی ساری آبادی شہری ہے۔ یہاں ہمارا قیام مختصر رہا، یعنی بس پانچ دن کا۔ اس میں سے بھی دو دن ہم نے سیر و سیاحت میں گزارے سنگاپوری ڈالر ان دنوں سولہ روپے کے لگ بھگ تھا۔ ہر چیز بے حد مہنگی محسوس ہوئی۔ سنگاپور ایک نہایت خوبصورت بلند و بالا اور صاف ستھرا شہر ہے۔ سڑکوں اور ٹریفک کا نظام مثالی ہے۔ ٹیکسیوں کے بجائے ہم نے زیادہ ٹیوب ٹرینوں اور ڈبل ڈیکر بسوں میں سفر کیا اور ٹیکسی کار سے زیادہ سہولت پائی۔ سنگاپور میں دیکھنے کو بہت سی جگہیں تھیں لیکن ہم بس چند ہی دیکھ پائے۔ مثلاً آرچرڈ روڈ ...... چڑیا گھر ...... برڈ پارک ...... سینٹھوسا آئی لینڈ ...... چائنیز گارڈن وغیرہ......

سنگاپور سے ہم ملائیشیا پہنچے۔ ملائیشیا کا دورہ ہمارے نقطہ نظر سے کافی سود مند رہا۔ ہم کوالالمپور سے قریباً 200 کلومیٹر شمال مشرق کی طرف Kuantan کے علاقے میں نکل گئے۔ ہم نے یہاں کے دور دراز دیہات میں وزٹ کیا۔ ان علاقوں میں صحت عامہ کے مراکز اور دیگر طبی سہولتوں کو اسٹڈی کیا۔ ہم نے متعلقہ لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور بہت سے انٹرویز لیے۔ کچھ جگہوں پر تو ہمیں بالکل یہی لگا کہ ہم پاکستان میں گھوم پھر رہے ہیں۔ یہاں بھی بہت سے وڈے سائیں اور حاجی شمشاد موجود تھے۔ یہاں بھی جواں سال زرینہ اور معصوم شہناز کی زندگی خطرے میں تھی۔ یہاں بھی شعبدہ باز عطائی لوگوں سے زندگی لے کر موت بانٹتے دکھائی دیتے تھے۔ بس انداز مختلف تھا۔ یعنی شکاری وہی تھے لیکن شکاریوں کے جال دوسری طرح کے تھے۔

ملائیشیا میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہ دیکھ کر عجیب لگا اور دکھ بھی محسوس ہوا کہ یہاں بھی زیادہ تر مسلمان ہی عطائیوں اور نیم حکیموں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جادو ٹونے کے کاموں میں لوگ بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ہمیں ایک جواں سال عورت ناصرہ ملی۔ وہ اپنے بریسٹ کینسر کا علاج دم کی ہوائی راکھ سے کروا رہی تھی اور آخری اسٹیج پر پہنچ چکی

تھی۔ ایک ماں ملی جس کا بچہ سوکھے کا شکار تھا اور عطائی کی ہدایت پر وہ ایک زندہ الو کی تلاش میں تھی جس کے خون سے اس کے بچے کا سوکھا دور ہو سکے۔ غرض ایسے ان گنت واقعات تھے جنہیں دیکھ کر دل چھلنی ہوتا تھا۔ بہر حال یہ بات بھی ہم نوٹ کر رہے تھے کہ یہاں اس جہالت سے نمٹنے کے لیے جو کوششیں ہو رہی ہیں، وہ ہمارے ہاں ہونے والی کوششوں سے کہیں بہتر اور موثر ہیں۔

ہم نے ملائیشیا میں پورے دس دن قیام کیا اور کافی کچھ حاصل کرنے کے بعد تھائی لینڈ پہنچ گئے۔ تھائی لینڈ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی دل کی کیفیت کچھ اور طرح کی ہو گئی۔ مجھے چار سال پہلے کے کئی واقعات یاد آئے۔ ایک دھواں سا سینے میں بھر گیا۔ بہر حال مجھے تسلی اس بات کی تھی کہ ہمیں بنکاک وغیرہ نہیں جانا تھا۔ ہماری منزل بنکاک سے چھ سات سو میل دور نانگ خائی کے اردگرد کا مضافاتی علاقہ تھا۔

ہمارے وفد میں کل چودہ افراد شامل تھے۔ وفد کے لیڈر ماہر امراض دل ڈاکٹر احتشام الدین صاحب تھے۔ وہ بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ اس ٹور کے دوران ہم نے احتشام صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ نانگ کے علاقے میں حالات قریباً ویسے ہی تھے جیسے ملائیشیا میں ملے تھے۔ دور دراز علاقوں میں طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یہاں غریب طبقے کی عام بیماریوں کے علاوہ ہیپاٹائٹس اور ایڈز جیسی تکالیف بھی موجود تھیں۔ اپنی صحت کی طرف سے مایوس لوگ عطائیوں اور طبی شعبدہ بازوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ تھائی لینڈ میں اکثریت بدھ مت کے ماننے والوں کی ہے۔ بدھ مت کے حوالے سے یہ لوگ روحانی علاج بھی کراتے تھے۔ اکثر معالج اپنے عقیدت مندوں کو دھوکا دیتے تھے اور انہیں عجیب و غریب شعبدوں میں الجھائے رکھتے تھے۔ بدھا کے پجاریوں کو بھکشو (Monks) کہا جاتا تھا۔ ہم نے ایک گاؤں میں ایسے ہی ایک ادھیڑ عمر Monk کو دیکھا۔ کچھ لوگ اسے اوتار کا درجہ دیتے تھے لیکن کچھ اسے دبے لفظوں میں شیطان بھی کہتے تھے ایک شخص نے اس Monk کے بارے میں ایک واقعہ سنایا۔ ایک جواں سال لڑکی یہ مسئلہ لے کر اس بھکشو کے پاس آئی کہ اس کا مرد اس کے بجائے کسی دوسری عورت میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ بھکشو کچھ عرصہ لڑکی کا علاج معالجہ کرتا رہا پھر اس نے لڑکی کو بتایا کہ اسے ایک خاص عمل سے گزرنا ہوگا۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔ اس نے لڑکی کو ایک صابن دیا اور اسے کہا کہ وہ باتھ روم میں چلی جائے۔ دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا لے اور اس

صابن کی ٹکیہ سے وہ ایک مرتبہ یوں نہائے کہ صابن جسم کے ہر حصے سے چھو جائے۔ لڑکی نے چاروناچار بھکشو کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی اور ویسا ہی کیا جیسا بھکشو نے کہا تھا۔ چند دن بعد بھکشو نے لڑکی کو اس کی بالکل برہنہ تصویریں دکھائیں اور اسے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل پر مجبور کر دیا۔ لڑکی دو تین بار بھکشو کے پاس جا کر ذلیل ہوئی پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے سب کچھ اپنے وارثوں کو بتا دیا۔ وارثوں نے بھکشو سے پوچھ تاچھ کی تو وہ صاف مکر گیا۔ اس نے کہا کہ لڑکی کے ذہن پر اثر ہے۔ اس لیے وہ الٹی سیدھی ہانک رہی ہے۔

بتانے والے نے بتایا کہ لڑکی کی گواہی اور دہائی کے باوجود بھکشو اب بھی اسی گاؤں میں ہے اور چاہنے والے اب بھی اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ایسے عاملوں کا لوگوں کے ذہنوں پر اتنا اثر ہے کہ وہ جسے چاہیں دیوانہ قرار دے سکتے ہیں اور جسے چاہیں فرزانہ ثابت کر سکتے ہیں۔ بہر حال اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں بھکشوؤں میں بھی ہیں۔

یہ تو فقط ایک مثال تھی۔ ملائیشیا کی طرح تھائی لینڈ کے دیہی علاقوں میں بھی ہمیں توہم پرستی اور جاہلیت کے ان گنت مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ ہم نے قریباً دو ہفتے تھائی لینڈ میں گزارے۔ وفد میں شامل کچھ افراد بنکاک دیکھنا چاہتے تھے تاہم کچھ واپس پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں بھی دوسرے گروہ کا ہم خیال تھا۔ بنکاک کے نام سے ایک عجیب سی الجھن میرے دل و دماغ کو گھیر لیتی تھی۔ ڈیلی گیشن لیڈر احتشام صاحب کی بھی یہی رائے تھی کہ کام ختم ہونے کے فوراً بعد واپسی کا سفر اختیار کیا جائے۔

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا، مگر پھر یوں ہوا کہ ہمارا ٹور ختم ہونے سے چھ سات دن پہلے علاقے میں شدید بارشیں شروع ہو گئیں۔ ہمارے لیے نقل و حرکت ناممکن ہو کر رہ گئی۔ دور دراز علاقوں تک جانے کے لیے رستے بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ ندی نالوں میں طغیانی آ گئی تھی۔ اسی دوران محکمہ موسمیات کی پیش گوئی بھی آ گئی۔ پیش گوئی یہ تھی کہ آئندہ دو چار دن تک اس علاقے کا موسم ٹھیک ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ہم نے دو دن تو کمروں میں بند رہ کر شدید بوریت کے عالم میں گزارے پھر یوں ہوا کہ ہم نے پانچ روز پہلے ہی واپسی کا پروگرام بنایا۔ اب اس میں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا کچھ ارکان کو واپسی کی نشستیں نہیں مل سکیں۔ احتشام صاحب نے اپنے طور پر کافی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی جن ارکان کو سیٹیں

نہیں ملی تھیں ان میں میرے علاوہ رخشی، کامران، حمزہ اور مزید دو افراد شامل تھے۔ ان میں گائنا کالوجسٹ ڈاکٹر نادیہ حیات بھی تھیں۔ سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ جن ارکان کو نشستیں مل گئی ہیں، وہ چلے جائیں باقی ارکان پانچ روز بعد آ جائیں۔ یہ ان کی مرضی ہے کہ یہاں رہیں یا بنکاک چلے جائیں۔

احتشام صاحب باقی سات ممبران کے ہمراہ بنکاک چلے گئے اور وہاں سے لاہور پرواز کر گئے۔ اب ہمیں باقی پانچ دن وہیں دیہی علاقے میں گزارنے تھے اور یہ ایک مشکل کام محسوس ہو رہا تھا۔ احتشام صاحب کے جانے کے 24 گھنٹے بعد ہی رخشی، کامران اور حمزہ نے بارش زدہ علاقے کو چھوڑ کر بنکاک جانے کا پروگرام بنا لیا۔ باقی تین افراد اس پروگرام کی مخالفت کر رہے تھے اور میں بھی ان تین افراد میں شامل ہو گیا تھا۔ ساری رات اس معاملے پر کھینچا تانی ہوتی رہی۔ رخشی اور کامران بنکاک جانے کے سلسلے میں سب سے زیادہ پرجوش تھے۔ ان کا پرزور اصرار تھا کہ بنکاک کے پاس آ کر اسے دیکھے بغیر گزر جانا سخت "بدذوقی" ہے۔ خاص طور سے اس صورتحال میں کہ ہم بور ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہے۔ جب بحث وتمحیص انتہا کو پہنچی تو رخشی روہانسا ہو گئی۔ وہ میرا کالر کھینچتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے شاد! تم ہماری اتنی سی بات بھی نہیں مان رہے۔ ٹھیک ہے اگر تم نے نہیں جانا تو نہ جاؤ۔ ہم اکیلے چلے جائیں گے تم آ جانا منگل کے روز ائرپورٹ پر۔"

کامران نے مجھے چڑاتے ہوئے کہا۔ "شاد صاحب! خدا کی قسم اگر میری ہونے والی بیوی اتنے اصرار سے مجھے کہتی تو میں ننگے پاؤں قطب شمالی تک بھی چلا جاتا۔ آپ پتا نہیں کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔"

حمزہ ایسے موقعوں پر ضرور لقمہ دیتا تھا لیکن اس نے نہیں دیا۔ اس نے بحث میں بھی زیادہ جوش وخروش نہیں دکھایا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں بنکاک جانے کے پروگرام کی مخالفت کیوں کر رہا ہوں۔ میں اور حمزہ رازداری کی باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ آج سے ڈھائی تین سال پہلے میں نے حمزہ کو بنکاک والے واقعات کے متعلق جزوی طور پر بتایا تھا۔ ان دنوں میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ مجھے دوبارہ بنکاک جانا پڑے گا۔

رخشی کا اصرار جب ناراضی اور بدمزگی کی حدوں کو چھونے لگا تو مجھے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ دل میں عجیب سی گومگو کی کیفیت لیے میں نے ساتھیوں کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اگلے روز صبح سویرے ہم کرائے کی دو کاروں کے ذریعے بنکاک کی طرف روانہ ہو گئے۔

بنکاک...... وینس آف دی ایسٹ، سٹی آف دی اینجلز۔

❁❁❁

یہ وہی بنکاک تھا جہاں چار سال پہلے مجھے ایک عجیب لڑکی ملی تھی۔ اس لڑکی سے ملنا عجیب تھا اور جدا ہونا اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ میں نے اس کا پتا ٹھکانا نہیں پوچھا تھا۔ اس نے بھی میرا اپنا ٹھکانا پوچھنے کے لیے اصرار نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ دیا ہو جاؤ...... چلے جاؤ۔ اپنا نام ونشان بتائے بغیر پرواز کر جاؤ...... کہ جب ملنا نہیں تو پھر نام پتا کیا پوچھنا لیکن جاتے جاتے وہ ایک نشانی بھی مجھے دے گئی تھی۔ ایک کسک...... ایک الجھن...... جس میں توہین کا ہلکا سا عنصر بھی شامل تھا۔ اس کے وہ ہونٹ، جو میرے بالکل قریب تھے لیکن اچانک مجھ سے دور چلے گئے تھے۔

میں نے بنکاک کو دیکھا۔ اس کی عمارتوں کو، سڑکوں کی روانی کو اور ساحل سمندر کو دیکھا اور ایک دم ماضی کسی بلند وبالا سمندری لہر کی طرح اپنے دامن میں یادوں کی ہزار ہا سیپیاں لیے ذہن کے افق پر نمودار ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور اتنی شدت سے ہوا کہ میں ہکا بکا رہ گیا۔ میرے سینے میں ایک عجیب سی اتھل پتھل مچ گئی۔ میں رخشی سے نگاہیں چرانے لگا کہ مبادا وہ میری آنکھوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر میرے دل کا حال جان لے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کیوں ہو رہا تھا؟ عقل سلیم یہ بات کسی طور بھی ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس لڑکی نے مجھے یاد رکھا ہو گا۔ وہ ایک کال گرل تھی۔ اب تک نجانے کتنے مرد اس کی زندگی میں آ کر جا چکے تھے۔ پتا نہیں وہ کتنے بستر بدل چکی تھی۔ وہ رنگوں اور خوشبوؤں کے سمندر میں غوطہ زن ایک ایسی جل پری تھی جس کے دل ودماغ پر کوئی نقش ابھر ہی نہیں سکتا تھا، اور شاید وہ خود بھی یاد رکھے جانے کے لائق نہیں تھی۔ اگر اس [illegible] وقت رخصت، میں اسے چوم لیتا تو شاید دو چار گھنٹے بعد ہی وہ میرے ذہن سے اتر جاتی لیکن ہوشیار طوائفوں کے انداز میں اس نے قریب آ کر دور جانے کی ادا دکھائی۔ اور اپنی قیمت اور اہمیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

میں سوچنے لگا۔ ایسی ہی ادا اس سے پہلے وہ نجانے کتنے مردوں کو دکھا چکی تھی۔ کچھ [illegible] شاید اس ادا کا نوٹس بھی نہیں لیا ہو گا۔ کچھ نے تھوڑا بہت اثر لیا ہو گا، کچھ نے زیادہ لیا ہو گا اور شاید دو چار ایسے بھی ہوں جنہوں نے بہت زیادہ اثر لیا ہو۔ میں بھی ان چار میں سے ایک تھا پھر ذہن میں آیا کہ شاید یہ ادا اس نے صرف مجھے ہی دکھائی ہو، کسی

اور کو دکھائی ہی نہ ہو۔

ہمارا قیام جنوبی شہر میں فلوریڈا نامی ہوٹل میں تھا۔ یہ کشادہ سڑکوں والا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ یہاں سے سوئی وانگ کا ہوٹل نیوٹرو کیڈرو قریباً آٹھ کلومیٹر دوری پر تھا۔ وہی نیوٹرو کیڈرو جس کا قرب و جوار میرے دل و دماغ پر نقش ہو چکا تھا۔ رواں دواں سڑک، کشادہ فٹ پاتھ جن پر لوہے کے خوبصورت بینچ رکھے گئے تھے۔ عصمت ہوٹل، سری لنکن ہوٹل اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ بنکاک آنے کے فوراً بعد میرا دل مچلنے لگا کہ میں سوئی وانگ روڈ جاؤں اور پرانی یادیں تازہ کروں۔ یادیں تازہ کرنے کا سوچتا تو سینے میں ایک میٹھی میٹھی کسک بھی جاگتی تھی۔ میں سوچتا تھا شاید وہاں سون بھی نظر آئے۔ وہ ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کے اندر یا آس پاس کہیں موجود ہو۔ وہ مجھے دیکھے اور دیکھتی رہ جائے پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کے آثار ابھریں اور وہ خواب ناک انداز میں میری طرف بڑھتی چلی آئے۔

پھر میں سوچنے لگا کہ اگر واقعی ایسا ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ اس سے کیا کہوں گا؟ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر بھی نہ پہچانے...... یا پھر پہچان کر بھی نہ پہچانے...... یا پھر وہ سرے سے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ ان گنت امکانات تھے اور ہر امکان پر غور کرتے ہوئے میں خود کو خبطی سا محسوس کرنے لگا تھا۔

ایک رات اور نصف دن تک تو ہم سب نے ہوٹل میں ہی رہ کر مکمل آرام کیا۔ اگلے دن سہ پہر کو رخشی اپنی ساتھی ڈاکٹر نادیہ حیات اور ڈاکٹر کامران کے ساتھ پیدل ہی سیر سپاٹے کے لیے نکل گئی۔ میں ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکنے لگا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر حمزہ وہاں پہنچ گیا۔ بنکاک میں مطلع صاف ہونے کی وجہ سے وہ بہت خوش تھا۔ میرے کندھے پر دھپ مار کر بولا۔ ”چل یار اٹھ...... چلیں۔“

”کہاں؟“

”ارے میاں! اسی کوچہ جاناں کی سیر کریں جو تمہارے تصور میں بسا ہوا ہے اور تم نے میرے تصور میں بھی بسا دیا ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں وہ کون سا فٹ پاتھ تھا جس پر تم اور سون چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ وہ کون سا کمرا تھا جہاں تم بیمار پڑے تھے اور اس سون نامی لڑکی نے تمہاری تیمار داری کی تھی...... اور وہ ڈسکو کلب جہاں زبردست میوزیکل ہنگامے کے دوران...... سون سے تمہاری اولین ملاقات ہوئی تھی۔ آج تو ویسے بھی ہفتے کی

[illegible] ہے، اس کلب میں خوب رونق ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں تمہاری کہانی کے سائیڈ [illegible] کسی ڈرائیور چنکی صاحب سے بھی ملاقات ہو جائے۔ مجھے تو بالکل ایسے لگ رہا ہے [illegible] کہ میں نے کوئی یادگار کلاسیکل ناول پڑھ رکھا ہے اور اب اس ناول کی اصل لوکیشنز [illegible] دیکھنے کا آرزومند ہوں۔“

”یار چھوڑو۔“ میں نے گہری سانس لی۔

”[illegible] مت بنو، میرے مچھر! میں جانتا ہوں اندر سے تم بھی وہ ساری جگہیں دیکھنے [illegible] آرزومند ہو اور امید ہے کہ تم وہاں جاؤ گے بھی...... اکیلے جانے سے بہتر ہے کہ مجھے [illegible] لے کر جاؤ۔ کیا پتہ وہاں تمہیں...... وہ اب بھی بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہو۔“

[illegible] کے آخری فقرے نے ایک دم سینے میں دھماکا سا کر دیا۔ مجھے سون کی بات یاد [illegible]۔

چار سال پہلے بنکاک میں میری اس آخری شام کو سون نے ہوٹل ”نیوٹرو کیڈرو“ کا ذکر [illegible] اور کہا تھا۔ ”ٹورسٹ! میں تقریباً روزانہ ہی ”نیوٹرو کیڈرو“ میں آتی ہوں۔ ہفتے میں [illegible] چار، پانچ مرتبہ تو ضرور آتی ہوں۔ تم جب بھی نیوٹرو کیڈرو میں آؤ گے، مجھے فوراً پتہ [illegible]۔“

[illegible] سوچنے لگا، کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ ابھی میں اور حمزہ ہوٹل کے ڈسکو کلب میں [illegible] وہاں ایک اسٹول پر مجھے سون بیٹھی نظر آ جائے۔ درمیان میں چار سال کا طویل [illegible] ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ سون کو دیکھنے کی...... ایک بار دیکھنے کی خواہش [illegible] دل میں ابھری کہ میں نیوٹرو کیڈرو جانے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ نہا دھو [illegible] میں مجھے پندرہ بیس منٹ ہی لگے۔ بذریعہ ٹیکسی کار ہم سوئی وانگ روڈ [illegible]۔

[illegible] کی مخصوص شام تھی۔ اجلی اجلی، نیم گرم...... دھیرے دھیرے روشنیاں جل [illegible] شفق کی سرخی ایک ریشمی تاریکی میں مدغم ہو رہی تھی۔ جوں جوں ہم منزل کے [illegible] رہے تھے میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے [illegible] سارے نغمے کے سر خوابیدہ پڑے تھے۔ خاموش تاروں پر انگلی کی ہلکی سی [illegible] ان سروں کو اچانک جگا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سارے کا سارا نغمہ خود کار طور پر [illegible] گیا تھا۔ نغمے کا ایک ایک بول یاد آ رہا تھا۔ سر اور لے کا ہر ہر اتار چڑھاؤ ذہن

میں ابھر رہا تھا۔ ٹیکسی کار "نیوٹرونسویلا" ہوٹل کے سامنے سے گزری اور نیوٹرو کیڈرو کے سامنے جا رکی۔

"عصمت ہوٹل" جوں کا توں اپنی جگہ موجود تھا۔ نیوٹرو کیڈرو بھی چھوٹی موٹی آرائشی تبدیلیوں کے سوا ویسے کا ویسا ہی تھا۔ وہی فٹ پاتھ تھا وہی تیزی سے گزرتی ہوئی ٹریفک۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کھمبے کے نیچے وہ گنجا دلال موجود نہیں تھا۔ وہاں ایک فروٹ والا اپنی اسٹائلش ریڑھی کے ساتھ کھڑا تھا۔

ہم ہوٹل میں داخل ہوئے۔ وہی در و بام تھے، وہی در و بام کی خوشبو تھی۔ استقبالیہ کاؤنٹر کے عقب میں درجن بھر وال کلاک تھے۔ جن پر دنیا کے مختلف ملکوں کا وقت بتایا گیا تھا۔ حمزہ کو وہ کمرہ دیکھنے کا اشتیاق تھا جہاں چار سال پہلے میں اور اکمل قیام پذیر رہے تھے۔ اتفاقاً کمرا خالی تھا۔ میں نے عملے کے ایک رکن سے درخواست کی اور اس نے خوش دلی سے ہمیں کمرا دکھا دیا۔ کمرا...... فرنیچر کی ایک دو معمولی تبدیلیوں کے سوا ویسے کا ویسا ہی تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر وقت ایک دم میرے لیے چار سال پیچھے چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا سر سفید نرم تکیے پر رکھا ہے۔ سون اپنے نرم ملائم ہاتھ سے میری پیشانی دبا رہی ہے۔ کھڑکی سے داخل ہونے والی روشنی میں اس کی حسین جلد کندن کی طرح دمک رہی ہے، میری نگاہ میں جذب ہو رہی ہے۔ سون کی آواز نے چار سال کے عرصے کو ایک جست سے پار کیا اور میرے تصور میں گونجی۔ "تم کل کا دن مکمل آرام کرو۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ ہم بنکاک میں گھوم پھر سکیں۔ ویسے میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گی۔ یہ میرا فون نمبر بھی ہے۔ اگر تمہیں کسی طرح کی ضرورت ہو تو کال کر سکتے ہو۔"

"کن خیالوں میں کھو گئے ہو پیارے!" حمزہ نے مجھے ٹہوکا دیا۔

"بہت کچھ یاد آ گیا ہے۔" میں نے لمبی سانس لی۔

"بہت کچھ یاد کر لو...... لیکن کچھ بھی بھولنا نہیں ہے۔" اس نے میری انگلی کو چھوتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ یہ وہی انگلی تھی جس میں منگنی کی انگوٹھی تھی۔

ہم نے ہوٹل کا ایک راؤنڈ لگایا۔ عملے میں سے بہت سے چہرے بدل چکے تھے، تاہم کچھ پرانے چہرے بھی نظر آئے۔ ڈسکو کلب میں "ویک اینڈ ہنگامے" کی تیاری ہو رہی تھی۔ مینا و ساغر سجائے جا رہے تھے اور سازندے اپنے سازوں کو جھاڑ پونچھ رہے تھے۔

ایک ماؤتھ آرگن والا "نوجوان سازندہ" ایک گوشے میں کھڑا کوئی دھن موزوں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ کولہے بھی مٹکا رہا تھا۔ آثار سے لگتا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں مہمانان گرامی اور عاشقان راگ و رنگ قدم رنجہ فرمانے لگیں گے۔

"چلو...... پہلے تمہارا عصمت ہوٹل دیکھیں۔" حمزہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے...... بلکہ اگر تم پسند کرو تو کھانا بھی کھا لیتے ہیں کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

ہم سڑک کراس کر کے عصمت ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل کا مالک نوید موجود نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ڈیڑھ دو ماہ کے لیے ملائیشیا گیا ہوا ہے۔ نوید کے چھوٹے بھائی اختر سے ملاقات ہوئی۔ وہ پہلے سے تھوڑا موٹا ہو گیا تھا۔ اس کی پیشانی پر چوٹ کا ایک نشان بھی نمودار ہو گیا تھا، جو اس کی جھگڑالو طبیعت کا غماز تھا۔ بہرحال ہم سے مل کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ہم نے کچھ پرانی یادیں تازہ کیں...... پھر ملک کے موجودہ حالات کی باتیں ہونے لگیں۔ پچھلی مرتبہ جب ہم یہاں آئے تھے تو تھائی کرنسی بھات کی قیمت پاکستانی روپے کے تقریباً برابر تھی لیکن اب یہ قیمت تھوڑی زیادہ ہو چکی تھی۔ روز افزوں مہنگائی اور بے روزگاری جیسی معاشی بیماریاں یہاں بھی پھل پھول رہی تھیں۔ تھائی لینڈ کی معیشت کو بہت حد تک سیاحت کی صنعت نے سہارا دے رکھا تھا ورنہ یہاں کی صورتحال کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ تھائی لینڈ میں ایڈز کے پھیلتے ہوئے مرض کی بازگشت بھی اختر کی باتوں میں سنائی دی۔

کھانا کھانے کے بعد ہم کچھ دیر چہل قدمی کرتے رہے۔ ایک پی سی او سے ہم نے سون کو فون کیا اور رخشی وغیرہ کو اطلاع دے دی کہ ہم آج رات ذرا گھومنے پھرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رخشی نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم نے پرفیوم وغیرہ بھی تو نہیں لگا رکھا۔ یہاں چڑیلیں سڑکوں پر گھومتی ہیں اور چمٹ جاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرے ساتھ حمزہ نام کا ایک جن موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں چڑیلیں کوئی رسک نہیں لیں گی۔"

ہم واپس نیوٹرو کیڈرو پہنچے تو تیز موسیقی کی آوازیں سڑک پر سے ہی سنائی دینے لگیں۔ "ویک اینڈ ہنگامے" کا آغاز ہو چکا تھا۔ کشادہ سڑک کے کنارے پر پارک ہونے والی گاڑیوں کی قطار طویل ہوتی جا رہی تھی۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ پتا نہیں

کیوں مجھے قریباً اسی فیصد یقین تھا کہ آج نیوٹروکیڈرو میں کہیں نہ کہیں سون سے ملاقات ہو جائے گی۔

میں سوچ رہا تھا، کیا مجھے اس کے سامنے آنا چاہئے؟ بہتر صورتحال تو یہ تھی کہ میں اسے دیکھ لوں، لیکن وہ مجھے نہ دیکھ پائے۔ اگر آمنے سامنے ملاقات ہوئی تو پھر یہ ایک طویل ملاقات ہوتی تھی۔ بلکہ یہ ملاقاتوں کا سلسلہ ہونا تھا۔ عین ممکن تھا کہ سون ایک بار پھر اسی وابستگی اور جوش وخروش کا مظاہرہ کرنے لگتی جو اس نے چار سال پہلے کیا تھا۔ یہ جوش و خروش مصنوعی بھی ہوسکتا تھا اور حقیقی بھی۔ دونوں صورتوں میں ہی یہ میرے لیے نقصان دہ تھا۔ رخشی میرے ساتھ موجود تھی اور اس کی موجودگی میں، میں کسی طرح کے مشکوک میل جول کا متحمل ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔

ایک بار تو جی میں آئی کہ اس معاملے کو بس یہیں چھوڑ کر ہوٹل فلوریڈا واپس چلا جاؤں اور آرام سے چادر اوڑھ کر سو جاؤں...... لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اب تجسس اتنی شدت سے ابھر چکا تھا کہ اسے دبانا ممکن نہیں رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ کوئی کشش اپنے نادیدہ ہاتھ سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم جاتے ساتھ ہی ڈسکو کلب میں داخل نہیں ہوں گے۔ پہلے میں باہر ہی سے کوشش کروں گا کہ اندر جھانک کر سون کو شناخت کر سکوں۔ اگر سون کو دیکھنے کے "تجسس" سے اس طرح نمٹا جاسکتا تو یہ زیادہ موزوں تھا مگر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ سون کو دیکھنے کے بعد میرا دل اس سے بات کرنے کو نہیں مچلے گا...... اور میں ماضی کے دریچے میں جھانکے بغیر یہاں سے واپس چلا جاؤں گا۔

اپنے پروگرام کے مطابق پہلے میں نے ڈسکو کلب کی تیز روشنیوں میں داخل ہوئے بغیر ڈانسنگ ہال اور اردگرد کی گیلریوں کا جائزہ لیا...... مگر مجھے سون کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد میں اور حمزہ اندر داخل ہوگئے اور گیلری کی ایک میز پر جا بیٹھے۔ یہاں سے چاروں طرف نگاہ ڈالی جاسکتی تھی۔ میری بے تاب نگاہ تیزی سے سون کی تلاش میں بھٹک رہی تھی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ دھیرے دھیرے اسے دیکھنے کی خواہش زور پکڑتی گئی۔ میں اٹھ کر گیلریوں میں ٹہلنے لگا۔ دھواں دھواں فضا میں اور تمتمائے ہوئے چہروں میں سون کو تلاش کرنے لگا۔ یہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں تھی اگر سون موجود ہوتی تو نظر آجاتی۔ محفل ہولے ہولے رنگ پر آرہی تھی۔ موسیقی کی کان پھاڑ دینے والی آواز تیز ہوگئی تھی۔ مچلتے ہوئے بے باک جسموں کی حرکات واشگاف ہونے لگی تھیں۔ یہ اعلیٰ سوسائٹی کے

مرد وزن تھے۔ ان میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی شرح زیادہ تھی۔ وہ پی رہے تھے، کھا رہے تھے اور جھوم رہے تھے۔ نوجوانوں کی دو ٹولیوں میں رقص کا مقابلہ ہوگیا تھا۔ وہ رقص کے ساتھ ساتھ ایک دوجے پر فقرے چست کررہے تھے اور قہقہے بکھیر رہے تھے۔ مقابلہ جیتنے کی خواہش میں پتلون قمیض والی ایک لڑکی نے اپنی قمیض اتار پھینکی تھی اور اب نہایت مختصر لباس میں اپنے جسم کو یوں موڑ توڑ رہی تھی کہ عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ لڑکی کا ایک ادھیڑ عمر عزیز جو یقیناً اس کا باپ چچا یا بھائی وغیرہ ہوگا، تالیاں بجا کر داد دینے والوں میں شامل تھا۔

اچانک ایک چہرہ دیکھ کر میں چونک گیا یہ چانگ تھی۔ وہی لڑکی جس پر اکمل، بنکاک میں داخل ہوتے ہی "دھڑام" سے عاشق ہوا تھا اور وہ بھی "دھڑام" سے اکمل پر فدا ہوگئی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا لیکن اس نے پہچاننے میں کافی دیر لگائی۔ دیر تک مجھے گھورتی رہی...... پھر میں نے "ہیلو" کہا تو اچانک اس کے چہرے پر شناسائی کی جھلک نمودار ہوئی اور اس کی آنکھیں وا ہوگئیں۔ اس نے مجھ سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور کھینچ کر ایک میز پر لے آئی۔ "تمہارا نام مسٹر شاد ہے نا؟" وہ انگلی اٹھا کر بولی۔

"ہاں...... چار ساڑھے چار سال پہلے اسی کلب میں تم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"بالکل مجھے یاد آ گیا ہے۔ تمہارے ساتھ ایک دوست بھی تھا۔ کیا نام تھا اس کا...... کیا نام تھا...... مجھے یاد نہیں آرہا۔" وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔

میں نے سوچا، یاد آئے گا بھی کیسے۔ سینکڑوں نام کوئی کیسے یاد رکھ سکتا ہے۔ وہ مجھے ٹہوکا دے کر بولی۔ "کیا نام تھا اس کا؟"

"اکمل۔" میں نے کہا۔

"یس...... آک...... مال......" وہ مخصوص لہجے میں بولی۔ "وہ تمہارے ساتھ نہیں آیا شاید...... وہ اچھا جولی لڑکا تھا۔"

"ہاں کچھ زیادہ ہی جولی تھا۔ بنکاک سے واپس جانے کے بعد اس سے میرا دوستانہ ختم ہوگیا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے ابھار سے پیدا ہوگئے تھے۔ یقیناً یہ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے تھے۔ وہ پہلے سے کچھ بھدی بھی ہوگئی تھی۔ ہونٹ بہت موٹے نظر آرہے تھے۔ نہایت شوخ لپ اسٹک کی وجہ سے یوں لگتا تھا کہ اس نے منہ میں کوئی سرخ پھول

دبا رکھا ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا، چار ساڑھے چار سال کا وقفہ کافی طویل ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ سون میں بھی کچھ ایسی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہوں جو اس کی دلکشی میں کمی کا سبب بنی ہوں۔

اب ایک اہم سوال میری زبان پر آنے والا تھا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی اور کہا۔ ''چانگ! یہاں ایک لڑکی سون بھی آتی تھی۔''

''سون!'' چانگ نے زیر لب دہرایا۔ پھر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولی۔ ''اچھا سون چنگ......تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

''پچھلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو اس نے میرے لیے گائیڈ کے فرائض انجام دیئے تھے۔''

چانگ نے پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے موٹے ہونٹوں میں دبایا اور طلائی لائٹر سے سلگا کر بولی۔ ''سون چنگ کو تو دیکھے ایک مدت گزر گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تین ساڑھے تین سال تو ہو گئے ہیں۔''

میرے سینے میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بنکاک میں نہیں ہے۔''

''اگر بنکاک میں ہوتی تو پچھلے تین برسوں میں مجھے ضرور نظر آتی۔''

میں نے اپنی گہری مایوسی کو چھپاتے ہوئے حمزہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، یہ فلم یا ڈرامہ نہیں ہے پیارے...... حقیقی لائف ہے۔ یہاں کوئی جولیٹ اپنے رومیو کے لیے عرصہ دراز تک لیٹر بکس کے چکر نہیں لگاتی۔

میں نے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے چانگ سے پوچھا۔ ''آخری بار تم نے کب دیکھا تھا اسے۔''

وہ پرسوچ انداز میں بولی۔ ''اسی کلب میں دیکھا تھا...... غالباً 94ء کا کرسس گزرے ایک دو ہفتے ہی ہوئے تھے۔''

اس نے بات کرتے کرتے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا تم صرف سون چنگ کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں آئے ہو۔''

''نہیں ایسی بات نہیں......'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہم یہاں آفیشل دورے پر ہیں

ہوٹل فلوریڈا میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یونہی سوچا کہ ذرا پرانی یادیں تازہ کی جائیں...... کافی یادیں تازہ ہو گئی ہیں، کچھ رہ گئی ہیں جن میں سون بھی شامل ہے۔''

ویٹر نے ہمارے سامنے سافٹ ڈرنکس رکھ دیئے تھے۔ چانگ کا جام پہلے ہی لبالب بھرا ہوا تھا۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور سگریٹ کے دو طویل کش لے کر بولی۔ ''سون بڑی موڈی لڑکی تھی وہ اکثر بہت خوش رہتی تھی لیکن جب اداس ہوتی تھی تو بہت ہی اداس ہوتی تھی۔ ان دنوں بھی اس پر اداسی کا دورہ پڑا ہوا تھا اور غالباً یہ کافی طویل دورہ تھا۔ مجھے یاد ہے، کرسس سے پہلے جب ہر طرف زبردست گہما گہمی تھی وہ بہت گم صم پھرا کرتی تھی...... پھر وہ کچھ دن کے لیے کہیں چلی گئی تھی۔ اس کی واپسی کرسس سے ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہوئی تھی۔ اس کا موڈ جوں کا توں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ اس سامنے والی کھڑکی کے قریب چار نمبر میز پر بیٹھی رہتی تھی۔ شاید وہ کچھ بیمار بھی تھی۔ اس کا چہرہ اترا اترا نظر آتا تھا۔ وہ کوئی گاہک بھی اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اپنے شوہر سے اس کا جھگڑا بھی رہتا تھا۔''

ایک بار پھر میرے سینے میں سرد لہر دوڑی۔ ''تو کیا اس نے شادی کر لی تھی؟''

''شادی تو اس کی بہت پہلے ہوئی تھی۔ بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے جب وہ پہلی بار بنکاک آئی تھی اس وقت بھی شادی شدہ تھی۔ بہر حال اس کے شوہر کو شوہر کہنا بھی اس لفظ کی توہین ہے۔ وہ حرامی تو بس ایک دلال تھا۔''

''کون تھا وہ؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''ٹیکسی چلاتا تھا...... بہت ہتھ چھٹ اور جھگڑالو مشہور تھا۔ سائے کی طرح سون کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اب تو عرصہ ہوا اسے بھی نہیں دیکھا۔''

''کیا نام تھا اس کا؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''چنکی...... لیکن لوگ اسے نفرت سے چانگو بھی کہتے ہیں۔ قبائلی زبان میں چانگو کا مطلب بھیڑیا ہوتا ہے۔''

میرا حیران ہونا قدرتی عمل تھا۔ آج اتنے عرصے بعد مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ کرائے پر کار چلانے والا لحیم شحیم چنکی نازک گڑیا سی سون کا شوہر تھا۔

حمزہ نے کہا۔ ''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سون نائٹ لائف سے کنارہ کش ہو گئی تھی۔''

"مجھے ٹھیک سے پتا تو نہیں...... لیکن بظاہر یہی لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چنکی سے بھی اس کا جھگڑا رہتا تھا۔ چنکی کا کہنا تھا کہ وہ بہت تنگ دستی کی حالت میں ہے۔ اس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے......" بات کرتے کرتے چانگ ایک دم چونکی اور بولی۔ "ہاں مجھے یاد آیا...... بعد میں سون نے "سیکس لیبر" چھوڑ کر صرف لیبر شروع کر دی تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے کال گرل کا کام چھوڑ دیا تھا اور ایک گھر میں ملازم ہو گئی تھی۔ گھر کے مالک کا نام ہوچی وانگ ہے اور وہ جم اسٹون کا کام کرتا ہے۔ ہاں مجھے یاد آ گیا۔ ہوچی کی ماں بیمار تھی۔ وہ کئی ماہ سے بستر سے لگی ہوئی تھی۔ ہوچی کو والدہ کی نگہداشت کے لیے ایک ایسی ملازمہ کی ضرورت تھی جو نرسنگ بھی جانتی ہو۔ میرا خیال ہے کہ بھلے وقتوں میں سون نے نرسنگ کا کورس بھی کیا ہوا تھا۔ بس اسی وجہ سے یہ ملازمت اسے مل گئی تھی۔ میرے گھر کا راستہ وان پارک کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ ہوچی کا کوٹھی نما گھر وان پارک کے علاقے میں ہی ہے۔ ان دنوں میں نے ایک دو بار سون کو سائیکل پر بازار سے سودا سلف لاتے دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ بہت بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک دن میرے ساتھ میری دوست کن ٹی بھی تھی۔ ہم دونوں نے سون سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بس ادھوری سی بات کر کے آگے بڑھ گئی تھی۔ کچھ دن بعد مسٹر ہوچی اپنا گھر فروخت کر کے Laksi کے علاقے میں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد کے حالات کا کچھ پتا نہیں۔"

میں اور حمزہ محویت سے چانگ کی باتیں سن رہے تھے۔ ہماری محویت دیکھ کر چانگ بولی۔ "اگر تم سون سے ملنا چاہو تو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔ کل اتوار ہے سہ پہر کے بعد میں فارغ ہوں گی۔ اگر تم...... Laksi جانا چاہو تو یہیں پر آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گی۔"

چانگ کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں ہونے والی گفتگو سے اس کے اندر بھی سون کے متعلق تھوڑا سا تجسس جاگ اٹھا ہے۔

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے چانگ...... سون ہمیں وہاں مل سکے گی۔"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" اس نے جام کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔ "پچھلے تین سال سے میں نے اس کے بارے میں کچھ سنا ہے، نہ اسے دیکھا ہے۔ شاید میں نے ایک دو بار اس کے بارے میں سوچا ہو لیکن یہاں زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ

پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملتی۔ ویسے ایک بات کا مجھے یقین ہے۔ سون اگر ہوچی وانگ کے ہاں نہ بھی ہوئی تو وہاں سے اس کے بارے میں معلوم ضرور ہو جائے گا...... اور اگر......"

چانگ کی بات ادھوری رہ گئی۔ درمیانی عمر کا ایک بھدا سا تھائی ہمارے عین سامنے سے نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ وہسکی کی حدت سے تمتما رہا تھا۔ اس نے چانگ کے سراپے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اسے پہچان کر چانگ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ دونوں نے وہیں ایک دوسرے کو چومنا شروع کر دیا۔ بھدے تھائی نے چانگ کی چربیلی کمر میں ہاتھ ڈالا اور ہمیں "سوری ٹو ڈسٹرب یو" کہہ کر چانگ کے ساتھ چل دیا۔ اس کا رخ ان چھوٹے چھوٹے کمروں کی طرف تھا جو مساج اور دیگر عیاشیوں کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

چانگ نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ شاید وہ ایک سیکنڈ رکنا چاہتی تھی لیکن بھدا تھائی اسے اپنی مستی کی روانی میں بہائے چلا جا رہا تھا۔ چانگ نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "ٹھیک ہے کل سہ پہر یہاں ملاقات ہو گی۔"

"او کے!" میں نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

کان پھاڑ دینے والی موسیقی سے در و دیوار لرز رہے تھے۔ شراب ہر ذی نفس کو اپنے اندر ڈبوتی چلی جا رہی تھی۔ مے نوش، میخانہ، جام، ساقی، سب کچھ نشے میں تھا۔ کھڑکیوں سے باہر رات بھیگ رہی تھی۔ لمبی لمبی کاریں سڑک کے کنارے پہنچ کر رکتی تھیں۔ قہقہے بکھیرتے جوڑے اترتے تھے اور ڈسکو کلب کے مچلتے تھرکتے ہنگامے کا حصہ بن جاتے تھے۔ بنکاک...... سٹی آف انجلز...... لیکن انجلز کہاں تھے۔ اس وقت تو بنکاک سٹی آف ڈانسرز نظر آ رہا تھا۔ سڑکوں پر بدمست موٹر سائیکل سواروں کی ٹولیاں تھیں۔ فٹ پاتھوں پر خالی بوتلیں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ ہفتے کی رات تھی۔

❁❁❁

اگلے روز پروگرام کے مطابق میں اور حمزہ ہوٹل نیو ٹروکیڈرو پہنچ گئے۔ چانگ وہاں پہلے سے موجود تھی۔ آج وہ میک اپ کے بغیر تھی اس کی آنکھیں کچھ سوجی نظر آتی تھیں۔ کلب کا ڈانسنگ ہال بالکل سنسان پڑا تھا۔ دو تین ادھیڑ عمر تھائی اونچے اسٹولوں پر بیٹھے بیئر کی چسکیاں لے رہے تھے۔ چانگ بھی ایک اسٹول پر بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کر رہی

تھی۔ ہم نے سافٹ ڈرنکس لیے اور باتیں کرتے رہے۔ جلد ہی میں اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے چانگ سے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم خود ہی مسٹر ہوچی تک پہنچ کر سون کا اتا پتا پوچھ لو۔ میرا مطلب ہے کہ اگر ہمارے جائے بغیر ہی کام بن سکے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔''

وہ بولی۔ ''نہیں بھئی! جانا تو آپ لوگوں کو خود ہی پڑے گا۔ میں تو آپ لوگوں کو بس ٹھکانے تک پہنچا دوں گی۔''

''کیا مطلب تم ہمارے ساتھ مسٹر ہوچی سے نہیں ملو گی؟''

''نہیں...... یہ کسی طور مناسب نہیں ہے۔ تمہیں بتایا ہے ناں کہ مسٹر ہوچی کا شمار شرفا میں ہوتا ہے، وہاں مجھ جیسی بدنام لڑکی جائے گی تو وہ سخت برا منائیں گے۔ بلکہ ان کے ملازم ہمیں ان تک پہنچنے ہی نہیں دیں گے۔''

''مگر تم نے بتایا ہے کہ سون ان کے پاس ملازمت کرتی رہی ہے بلکہ شاید اب بھی کر رہی ہو۔'' حمزہ نے نقطہ اٹھایا۔

وہ مسکرائی۔ ''میں نے تمہیں یہ بھی تو بتایا ہے کہ سون بالکل بدل چکی تھی۔ ویسے بھی تم نے غور کیا ہوگا کہ وہ شکل و صورت سے بالکل اور طرح کی لگتی تھی۔ ایک عورت کے لیے دوسری عورت کی شکل و صورت کی تعریف کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے، پھر بھی میں کہوں گی کہ اس کی صورت میں کچھ ایسی بات تھی جو ہمارے پیشے کی لڑکیوں میں بالکل نہیں ہوتی۔ ایک خاص قسم کا نکھار اور اجالا تھا اس کے چہرے پر۔''

کچھ دیر تک ہم اس بارے میں بات کرتے رہے۔ آخر نتیجہ وہی نکلا جو چانگ چاہتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ ہم تینوں ٹیکسی کار میں جائیں گے۔ چانگ ہمیں مسٹر ہوچی کی کوٹھی ڈھونڈنے میں مدد کرے گی۔ بعد ازاں وہ واپس آ جائے گی۔ ہم پاکستانی ڈاکٹرز کی حیثیت سے مسٹر ہوچی سے ملاقات کریں گے اور سون کے بارے میں پوچھیں گے۔ چانگ نے بتایا کہ اس کی معلومات کے مطابق مسٹر ہوچی پڑھے لکھے لوگوں کو پسند کرتے ہیں اور ان سے بات چیت کر کے خوش ہوتے ہیں۔ چانگ کی باتوں سے یہ بھی پتا چلا تھا کہ مسٹر ہوچی شستہ انگلش بول لیتے ہیں۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم مسٹر ہوچی وانگ کے گھر کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ بنگلا نما گھر ایک صاف ستھرے علاقے میں تھا۔ یہاں سبزے کی بھرمار تھی۔ دیواروں کو خوشنما بیلوں

نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ بنگلا روایتی اور جدید طرزِ تعمیر کا امتزاج تھا۔ در و دیوار کو مختلف رنگوں سے سجایا گیا تھا۔ مین گیٹ کے دونوں ستونوں پر قریباً دو فٹ اونچے ہاتھی کا مجسمہ تھا۔ اس مجسمے پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ امید تھی کہ یہ تھائی جوہری گھر میں ہی ہوگا۔

ہم نے ایک باوردی ملازم کے ذریعے اپنا وزیٹنگ کارڈ اندر پہنچایا۔ تھری پیس سوٹ والا ایک ملائی نوجوان باہر نکلا۔ اس نے ہم سے چند سوالات کیے اور پھر ہمیں نشست گاہ میں لے گیا۔ اس نے مودب انداز میں ہمیں بتایا کہ مسٹر ہوچی اپنی بیٹی سے ٹیلی فون پر گفتگو کر رہے ہیں، چند منٹ میں تشریف لاتے ہیں۔ نشست گاہ شاندار تھی اور اس کی سجاوٹ میں بھی تھائی روایات اور جدت کا خوبصورت امتزاج تھا۔ ہم دونوں کے لیے یہ پہلا اتفاق تھا کہ ہم کسی تھائی کا گھر اندر سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مسٹر ہوچی دبیز قالین پر ننگے پاؤں چلتے اندر تشریف لے آئے۔ ہمیں بھی اپنے جوتے گھر کی بیرونی دہلیز پر ہی اتارنا پڑے تھے۔ وہاں جوتوں کی قطاریں دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ اہل خانہ گھر میں ننگے پاؤں ہی گھومتے پھرتے ہیں۔

مسٹر ہوچی نے ایک لمبا گاؤن پہن رکھا تھا۔ ان کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ ان کی فرنچ کٹ داڑھی اور سر کے ایک تہائی بال سفید تھے۔ جسمانی اعتبار سے وہ مضبوط اور صحت مند نظر آتے تھے۔ ہم نے مقامی انداز میں اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد ہم آمنے سامنے نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مسٹر ہوچی نے ہم سے شائستہ انداز میں اجازت لے کر سگریٹ سلگایا۔ ان کی انگلیوں میں ہیرے کی دو تین انگشتریاں دمک اٹھیں۔ ہولڈر میں سگریٹ سلگا کر پیتے ہوئے وہ بڑے اسٹائلش لگ رہے تھے۔

میں اپنا تعارف تو پہلے ہی کرا چکا تھا۔ مزید تفصیل بتاتے ہوئے میں نے کہا۔ ''سر! ہم یہاں ایک مطالعاتی دورے پر آئے ہوئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ شہروں سے دور مضافاتی علاقوں میں صحت عامہ اور طبی سہولتوں کا جائزہ لیا جائے۔ ہم کافی دور دراز دیہات میں گئے ہیں۔ مختلف لوگوں سے انٹرویوز وغیرہ بھی کیے ہیں۔ ان انٹرویز کے حوالے سے ہمارا دھیان ایک لڑکی سون چنگ کی طرف گیا تھا۔ میں پچھلی مرتبہ یہاں آیا تھا تو سون سے ملا تھا۔ سون کا تعلق مضافات سے ہے۔ اس کے علاوہ وہ نرس بھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں اس کا انٹرویو بھی کرنا چاہیے۔''

سون کے نام پر مسٹر ہوچی کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وہ قدرے خشک لہجے میں بولے۔ ”آپ یہاں مجھ سے اس لڑکی کے متعلق پوچھنے آئے ہیں؟“

”جی ہاں جناب! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ”نائٹ لائف“ سے علیحدہ ہونے کے بعد سون آپ کے ہاں ملازم ہو گئی تھی۔ غالباً آپ کی بیمار والدہ کی نرسنگ اور دیکھ بھال کے لیے۔“

مسٹر ہوچی چند لمحے تک ہم دونوں کو گھورتے رہے پھر بڑے تلخ لہجے میں بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ دونوں کو اس لڑکی کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ آپ نے اس کا ذکر کر کے میری طبیعت سخت مکدر کر دی ہے۔ اگر آپ مہمان نہ ہوتے تو میں آپ کو یہ گفتگو یہیں پر ختم کرنے کا کہہ دیتا۔“ غیظ و غضب کے سبب مسٹر ہوچی کی آواز میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی۔

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر ہماری کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے تو ہم معافی چاہتے ہیں۔ شاید اس لڑکی کے متعلق ہماری معلومات واقعی محدود ہیں۔“

مسٹر ہوچی کا چہرہ ابھی تک تمتما رہا تھا۔ اسی دوران میں ایک درمیانی عمر کی عورت جس نے گود میں پیاری سی بلی اٹھا رکھی تھی، دروازے میں نظر آئی۔ اس نے مسٹر ہوچی کو اشارہ کیا۔ مسٹر ہوچی ہم سے ایکسکیوز کرتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ایک چھوٹا سا بچہ جو روایتی تھائی لباس میں تھا دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور شرماتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔ اس کی بغل میں فٹ بال دبا ہوا تھا۔

مسٹر ہوچی چار پانچ منٹ بعد واپس آئے۔ چند منٹ کے لیے ان کا باہر چلے جانا ہمارے لیے بہتر ہی ثابت ہوا تھا، کیونکہ وہ واپس آئے تو موڈ قدرے نارمل نظر آ رہا تھا انہوں نے نشست پر بیٹھ کر سگریٹ کے چند طویل کش لیے اور بولے۔ ”دانا سچ ہی کہتے ہیں انسان کی عادتوں کا بدلنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ بدبخت لڑکی بھی بظاہر بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اسی لیے ہم نے ترس کھا کر اسے ملازمت دے دی۔ ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر میرے تعاون سے ایک انسان بھی سدھر جائے تو یہ بہت بڑی بات ہو گی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا خاوند مقروض ہے اگر وہ قرضہ نہ اتار سکا تو اسے جان کا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ میں نے اسے اس کی خدمات کے معاوضے سے دگنا معاوضہ دیا۔ لیکن وہ پھر

کمینگی سے باز نہیں آئی۔“

چند لمحے توقف کر کے مسٹر ہوچی نے نیا سگریٹ سلگایا اور بولے۔ ”وہ تین چار ماہ تو سیدھی سیدھی چلتی رہی پھر اس نے پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ اچھی شکل و صورت اس کے پاس ایک تباہ کن ہتھیار کی طرح تھی۔ اس نے اس ہتھیار کو چمکانا دمکانا شروع کر دیا۔ اس کے طور اطوار بھی بدلے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک رات جب میری اہلیہ گھر میں نہیں تھی وہ بہانے سے میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے زیادہ بیگ لگا رکھے ہیں اور میرے حواس مختل ہیں۔ اس نے مجھے بہکانے کی کوشش کی۔ غالباً وہ مجھ سے بہت زیادہ رقم اینٹھنے کی خواہش مند تھی۔ جب اسے یکسر ناکامی ہوئی تو اس نے بڑی دیدہ دلیری سے پینترہ بدلا۔ وہ جانتی تھی کہ مجھ جیسے لوگوں کو نیک نامی جان سے عزیز ہوتی ہے۔ اس نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے اور دھمکی دی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ شور مچائے گی۔ اس سے پہلے کہ میں اس صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کچھ کرتا وہ چیختی چلاتی ہوئی کوریڈور میں آ گئی۔ نوکر حیران رہ گئے۔ میرے گھر کی انیکسی میں چند مہمان بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ بھی گھبرا کر نکل آئے۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ متعلقہ پولیس آفیسر مجھے بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے اس سارے معاملے کو بڑی محنت اور دیانت داری سے ہینڈل کیا۔ اس نے دو تین دن میں ہی دو ایسے واقعات کا کھوج لگا لیا جن میں اس لڑکی نے اسی طرح شرفاء کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کی تھی۔ بعد ازاں اس بدبخت حرافہ نے حوالات میں خود بھی سب کچھ اگل دیا۔ اسے چھ ماہ کی قید ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ لگتا ہے کہ وہ پولیس کے خوف سے بنکاک ہی چھوڑ گئی ہو گی۔ یہاں کی پولیس ایسی جرائم پیشہ عورتوں کو بلیک لسٹ کرتی ہے اور انہیں وقتاً فوقتاً پولیس کو رپورٹ بھی کرنا ہوتی ہے۔“

میں سناٹے کے عالم میں یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس بیان میں سچ کتنا ہے اور جھوٹ کتنا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹہ مسٹر ہوچی کے پاس بیٹھے۔ اس دوران ہم نے پورے لوازمات کے ساتھ قہوہ پیا اور کٹی ہوئی اناناس کھائی۔ مسٹر ہوچی نے ہمیں ناصحانہ انداز میں سمجھایا کہ ہم سون جیسی آوارہ لڑکیوں کے انٹرویوز کر کے اپنے کام کی کوالٹی خراب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کریں گے۔ ہمیں اس کام کے لیے بہتر اور موزوں لوگوں کو تلاش کرنا چاہئے۔

مسٹر ہوچی کا بہت بہت شکریہ ادا کر کے اور ان سے پھر ملنے کا ''ناقابل عمل'' وعدہ کر کے ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔ چانگ ہمیں چھوڑ کر واپس نوٹرو کیڈرو جا چکی تھی۔ اب ہمیں خود ہی ٹیکسی لے کر ہوٹل پہنچنا تھا۔ حمزہ کے پاؤں میں کل سیڑھیاں اترتے ہوئے موچ آ گئی تھی۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ مسٹر ہوچی سے جو باتیں ہوئی تھیں، ان پر طویل تبصرہ درکار تھا۔

ابھی ہم اس تبصرے کے لیے پر ہی تول رہے تھے کہ ایک لمبی شیورلیٹ گاڑی ہمارے قریب رکی۔ گاڑی کی اندرونی لائٹ آن تھی۔ اس لیے ہم نے تاریکی کے باوجود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی فربہ عورت کو دیکھ لیا۔ یہ وہی خاتون تھی جو ہماری گفتگو کے دوران چند سیکنڈ کے لیے نشست گاہ کے دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔ اس کی خوبصورت سیامی بلی بڑی تمکنت کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھی۔

عورت نے کھڑکی کھول کر انگریزی میں پوچھا۔ ''پیدل کہاں جا رہے ہو۔ دو تین کلو میٹر سے پہلے سواری نہیں ملے گی۔ آؤ میں تمہیں چھوڑ دوں۔''

''نہیں آپ کو تکلیف ہوگی۔''

''تکلف کی ضرورت نہیں آ جاؤ۔'' اس نے کہا اور بلی کو پیار سے پکڑ کر پچھلی نشست پر اچھال دیا۔

میں شکریہ ادا کر کے خاتون کے ساتھ بیٹھ گیا۔ حمزہ پچھلی نشست پر بلی کا ہم نشین ہو گیا۔ میں نے عورت کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر پچاس پچپن کے قریب لگتی تھی۔ وہ کافی فربہ اندام اور سرخ و سپید تھی۔ عام فربہ اندام لوگوں کی طرح وہ کچھ خوش مزاج اور بے پروا بھی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ مسٹر ہوچی کی بیوی ہے۔ تاہم عورت نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ وہ ہوچی کی خالہ ہے۔ خالہ اور بھتیجے کی عمروں میں تھوڑا ہی فرق محسوس ہوتا تھا۔ وہ بولی۔ ''ہوچی نے مجھے بتایا ہے کہ تم سون چنگ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں آئے ہو۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور وہی مقصد بتایا جو اس سے پہلے مسٹر ہوچی کو بتایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ سون سے انٹرویو کرنا ہمارے لیے کچھ زیادہ اہم نہیں تھا اور اب مسٹر ہوچی کی باتیں سننے کے بعد تو بالکل بھی نہیں رہا۔

فربہ اندام عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''میرا نام منگ ہو ہے۔ میں

پچیس سال پہلے میں نے ایک حماقت کی تھی۔ اس حماقت کے نتیجے میں مجھے ایک شوہر ملا تھا بالکل نکھٹو وہ عمارتوں کی کھڑکیاں صاف کرتا تھا میری وجہ سے اس نے عمارتیں بنائیں اور لکھ پتی ہو گیا پھر اس کے دماغ میں تکبر کا کیڑا رینگنے لگا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر لات مار کر اسے چلتا کیا، تب سے میں تنہا زندگی گزار رہی ہوں اور تم دونوں کے نام کیا ہیں؟''

ہم دونوں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بولی۔ ''چلو تمہیں بنکاک کی بہترین چائے پلواتے ہیں۔''

وہ ہمیں ایک ریسٹوران میں لے آئی۔ یہاں صرف چائے سرو کی جاتی تھی۔ کئی طرح کی چائے اور لوازمات تھے۔ سروس ساری کی ساری تھائی لڑکیوں کے سپرد تھی۔ چائے کے برتنوں میں عجیب و غریب کیڑے مکوڑے اور سانپ بنے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حمزہ کی طبیعت مالش کرنے لگی۔ بہر حال میں اس کا پہلے سے عادی تھا۔ اس عورت کو یہاں بہت احترام سے دیکھا جا رہا تھا اور عملے کے علاوہ گاہک بھی جھک جھک کر سلام کر رہے تھے۔ رات کے نو بج چکے تھے اور اس وقت کی مناسبت سے ہی آرکسٹرا مدھم دھنیں بکھیر رہا تھا۔

''منگ ہو'' نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''ہوچی کی والدہ میری بڑی بہن تھی۔ وہ کافی عرصہ بیمار رہی۔ بالکل بستر سے لگ گئی تھی۔ دو سال پہلے ہی فوت ہوئی ہے۔ ہوچی میرا بھتیجا ہے۔ کہنے کو تو وہ ایک بڑا کاروبار چلا رہا ہے اور بہت معزز شہری بن گیا ہے لیکن میں اس کی خالہ ہوں، میں جانتی ہوں کہ اس میں کئی کمزوریاں بھی ہیں۔ وہ تھوڑا سا حسن پرست بھی ہے اور یہ حسن پرستی اسے نقصان پہنچا دیتی ہے۔ یہ بنکاک ایسے عیاروں سے بھرا ہوا ہے جو حسن پرستی کو کسی صورت معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔''

منگ ہو نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولی۔ ''میں تمہیں ہوچی اور سون کے متعلق جو کچھ بتانے جا رہی ہوں، امید ہے کہ تم وہ اپنے تک محدود رکھو گے لیکن اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو بھی ہوچی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ شاید تم اپنا ہی نقصان کرو گے۔''

''اگر آپ ہم پر اعتماد کر رہی ہیں تو ہم آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔ ہم کبھی نہیں چاہیں گے کہ آپ کو اس گفتگو کی وجہ سے کوئی پریشانی اٹھانا پڑے۔''

''میری فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں جنٹلمین! تم بس اپنا بھلا سوچو۔ یقیناً تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہو گا کہ میں تمہیں اس بارے میں کیوں بتا رہی ہوں۔

اس کی وجہ شاید میں خود بھی نہیں جانتی۔ غالباً میں اس لڑکی کے لیے دل میں ہمدردی رکھتی ہوں۔ تم اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہو اور خود کو اس کا دوست بتا رہے ہو۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تم واقعی اسے تلاش کرو، اور پھر مجھے بھی بتاؤ کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔"

حمزہ بولا۔ "محترم خاتون! ہمارے پاس یہاں زیادہ وقت تو نہیں ہے لیکن اگر آپ کوئی "کلیو" دیں گی تو ہم اپنی سی کوشش ضرور کریں گے۔"

منگ ہو نے کہا۔ "سون کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں ہوچی سے زیادہ سون کے نام نہاد شوہر کا دخل تھا۔ وہ بڑا غصیلا اور کمینہ شخص تھا۔ شاید تمہیں پتا ہی ہو وہ آج سے تین چار سال پہلے بنکاک میں ٹیکسی چلاتا تھا۔"

"جی ہاں! میں اس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

منگ ہو بولی۔ "مسٹر شاد! سون نے خود کو واقعی بدل لیا تھا۔ وہ موج مستی کی دنیا سے کنارہ کش ہونا چاہتی تھی میں یقین سے کہتی ہوں، اسے کسی سے پیار ہو چکا تھا، وہ بتاتی تو کچھ نہیں تھی لیکن اس کی آنکھیں اور اس کے جسم کا ہر حصہ گواہی دیتا تھا کہ وہ کسی سے پیار کرتی ہے۔ جن دنوں وہ "نائٹ لائف" کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہوئی، اس کی قدر و قیمت ایک سوسائٹی گرل کی حیثیت سے بہت اونچی تھی۔ وہ ایک ڈیڑھ سال میں دولت کا ڈھیر لگا سکتی تھی، مگر اس کا دل تو ایک دم ہی ان رنگ رلیوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ایک دن میں نے اس پر بڑا زور دیا تھا۔ آخر وہ مان گئی تھی کہ وہ کسی سے پیار کرتی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کون ہے۔ وہ بولی تھی، ہے ایک بچپن کا ساتھی گاؤں میں میرے ساتھ رہتا تھا۔"

میرے سینے میں مایوسی کی ایک تیز لہر پھیل گئی۔ پتا نہیں کیوں میں چونک کر منگ ہو کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی دھن میں اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی۔ "وہ بڑی مختلف لڑکی تھی مسٹر شاد! جس طرح کنول کا پھول کیچڑ میں رہ کر بھی اپنی آب و تاب برقرار رکھتا ہے۔ وہ بھی ایک غلیظ پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود صاف ستھری نظر آتی تھی۔ یہاں ہوچی کے گھر میں پانچ چھ ماہ تک اس نے سخت محنت کی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس کی بے آرامی دیکھ کر ترس آنے لگتا تھا۔ وہ رات رات بھر کھڑے ہو کر میری بہن کی تیمارداری کرتی تھی، صبح صرف تین گھنٹے سونے کے بعد وہ پھر کام میں جت جاتی تھی۔ اپنے کام سے بہت لگن تھی اس میں۔ سون کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس کا نام نہاد شوہر کینسر کی طرح اس سے چمٹا ہوا

تھا۔ مجھے ٹھیک سے پتا تو نہیں مگر لگتا ہے کہ اس کی عیاشیوں نے ہی اسے مقروض کر رکھا تھا۔ اب اپنے قرض کا سارا بوجھ وہ سون پر ڈال رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سون ایک مالدار گھرانے میں آ گئی ہے اور وہ چاہے تو یہاں سے بہت کچھ حاصل کر سکتی ہے مگر سون چونکہ اپنی لائن بدل چکی تھی اس لیے وہ کسی طور چنکی کی باتوں میں نہیں آئی۔ بعد ازاں چنکی نے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ہوچی کو شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔"

چند لمحے توقف کر کے منگ ہو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ ہوچی پچاس سے اوپر کا ہو گیا ہے لیکن اس میں سے بچپنا پوری طرح گیا نہیں۔ وہ حسن پرست بھی ہے۔ وہ اکثر دو خانوں میں بٹا رہتا ہے، ایک طرف اس کی حسن پرستی ہے، دوسری طرف نیک نامی ہے۔ میری ہدایت پر اس کی بیوی اس پر پوری نگرانی بھی رکھتی ہے۔ وہ ایک پولیس آفیسر کی بہن ہے اور تیز نگاہ رکھتی ہے...... تم اس سے ملے ہو؟"

"جی نہیں محترم خاتون! ہمیں ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو میں تمہیں چنکی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس نے ہوچی کو ورغلایا اور اسے بتایا کہ اگر گاہک بہت شریف اور بہت دولت مند ہو تو سون اب بھی گزرے وقت کو آواز دے لیتی ہے۔ اس نے ہوچی کے سامنے ایک ایسا نقشہ کھینچا کہ ایک رات جب ہوچی کی بیوی اپنے بھائی کے گھر گئی ہوئی تھی ہوچی نے سون کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم سب کے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔ ہوچی، سون کے ساتھ اپنے بیڈروم میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ سون کے انکار پر کھینچا تانی ہوئی جس سے اس کے کپڑے پھٹ گئے اور وہ مالکن کے نام کی دہائی دیتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ہوچی نشے میں تھا، وہ سون کے پیچھے برآمدے تک آیا۔ سون پھٹے ہوئے کپڑوں کے ساتھ بھاگ کر لان میں آ گئی۔ پاس کی کوٹھی والوں نے بھی یہ ساری صورتحال دیکھ لی تھی اس کے علاوہ انیکسی میں بھی چند مہمان موجود تھے۔ اس بگڑے ہوئے معاملے کو ہوچی کے برادر ان لا شی لن نے بڑی عقل کے ساتھ سنبھالا۔ پولیس والوں کے پاس ویسے بھی ایسے معاملوں کو ہینڈل کرنے کا گر ہوتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ سون پر جھوٹا کیس بنایا گیا تھا۔" حمزہ نے کہا۔

"اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہوچی کی عزت اور نیک نامی داؤ پر لگی

ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی پوری فیملی کی بھی......"

"مسٹر ہو چی بتا رہے تھے کہ سون کو چھ ماہ قید بھی ہوئی تھی۔"

"ہاں...... اور اس سے پہلے پولیس اسٹیشن میں بھی اس کے ساتھ کافی ناروا سلوک ہوا مار پیٹ بھی کی گئی۔ تھائی پولیس اور خاص طور سے بنکاک کی پولیس کافی سخت گیر ہے۔"

"یہ سب کچھ سن کر بہت افسوس ہوا۔" میں نے کہا۔

"بات ہی افسوس کی ہے۔ سون اچھی لڑکی تھی۔ وہ گناہ کی دلدل سے نکلنا چاہتی تھی، لیکن اس دلدل سے نکلنے کے لیے شکار جتنی جدوجہد کرتا ہے۔ دلدل اتنی ہی تیزی سے اسے نگلتی ہے۔ دیکھنے والے بھی اکثر اوقات بس دیکھ ہی سکتے ہیں۔ ہر انسان کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میری بھی مجبوریاں تھیں۔ سون سے بہت ہمدردی رکھنے کے باوجود میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔ اب ان واقعات کو تین برس سے زائد وقت گزر چکا ہے، پھر بھی کسی وقت سون کا خیال شدت سے آتا ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ اپنے بلیک میلر شوہر سے اس کی جان چھوٹی ہوگی یا نہیں۔ اور پھر وہ پیار جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ پتا نہیں کہ اس میں جھوٹ کتنا تھا اور سچ کتنا؟"

میں نے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے، اگر ہم اسے ڈھونڈنا چاہیں تو اس کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔"

وہ پرسوچ انداز میں بولی۔ "ایک مرتبہ اس نے اپنا ایڈریس دیا تو تھا۔ میں نے کہیں نوٹ بھی کیا تھا۔ اسے ڈھونڈنا پڑے گا۔ یہ ساڑھے تین سال پہلے کی بات ہے۔ اگر ایڈریس مل بھی گیا تو پتا نہیں اب وہ وہاں موجود ہوگی یا نہیں۔"

"کیا وہ اس کے آبائی علاقے کا ایڈریس ہے؟" حمزہ نے پوچھا۔

منگ ہو نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔ "پلیز میڈم! آپ وہ ایڈریس ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔"

اگلے روز اسی جگہ ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر صرف چائے پی تھی۔ اس چائے کا بل ایک ہزار بھات کے لگ بھگ بنا۔ منگ ہو نے یہ بل کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادا کیا۔ اس کے بعد منگ ہو اپنی شیور لیٹ میں واپس چلی گئی۔ ہم بذریعہ ٹیکسی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جب ہم ہوٹل پہنچے، رخشی کامران اور دیگر ساتھی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے

تھے۔ رخشی مجھے تنقیدی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "یہ تم دونوں اکیلے اکیلے کہاں گھومتے رہتے ہو؟ کیا چکر شکر چل رہا ہے۔"

"چکر شکر کوئی نہیں۔ وقت تھوڑا ہے اور مقابلہ سخت سوچتے ہیں کہ اچھی طرح گھوم پھر لیں۔" حمزہ نے میری طرف سے جواب دیا۔

رخشی بولی۔ "یا اللہ! یہ کیسی کایا پلٹ ہے۔ ایک طرف تو یہ عالم تھا کہ بنکاک کے نام سے چڑ تھی۔ دوسری طرف یہ صورتحال ہے کہ گھوم گھوم کر ہلکان ہو رہے ہیں۔"

"سوچا ہے کہ ہوٹل میں بیٹھ کر ہلکان ہونے سے بہتر ہے کہ گھوم پھر کر ہلکان ہوا جائے۔" میں نے مختصر جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" رخشی نے پوچھا۔ "ہم سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"اوہ ویری سوری رخشی! لیکن مجھے تو بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔"

"کہیں سے کھا آئے ہو؟" رخشی نے تفتیشی نظروں سے گھورا۔

"نہیں بھئی۔ گواہ میرے ساتھ ہے۔ پوچھ لو اس سے۔" میں نے حمزہ کی طرف اشارہ کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں سخت اپ سیٹ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لوں۔ تھکے ہوئے جسم اور ذہن کو سکون دینے کی کوشش کروں۔ یہاں آ کر مجھے جو کچھ سون کے بارے میں معلوم ہوا تھا اس نے میرے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ ذہن ہزار ہا خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ دل کے دروازے پر ایک خیال بار بار پر شور دستک دے رہا تھا۔ سون کی زندگی کا رخ کیسے بدلا...... کیوں بدلا؟ کہیں اس تبدیلی کے پیچھے کسی طور میری ذات تو موجود نہیں تھی؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں خود ہی اپنا یہ خیال رد کر دیتا۔ آج سے چار پانچ سال پہلے وہ ہر روز نجانے کتنے مردوں سے ملتی تھی۔ مجھ سے کہیں زیادہ اسمارٹ، کہیں زیادہ دولت مند اور بارسوخ، ایسے لوگ جو اس کے ہم وطن تھے اور ہم مزاج بھی...... مجھ میں ایسی کون سی بات تھی کہ میں اسے یاد رہ جاتا اور وہ بغیر کسی خاص سبب کے میری خاطر اپنی زندگی کا رخ ہی بدل لیتی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر مجھے میڈم منگ ہو کی بات یاد آتی اور ذہن مزید منتشر ہو جاتا۔ منگ ہو نے سون سے پوچھا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے تو اس کا جواب سون نے اثبات میں دیا تھا لیکن

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اس کا محبوب اس کے بچپن کا کوئی ساتھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ سون نے یہ آخری بات جھوٹ کہی ہے۔ چار سال پہلے ایک چمکیلی دوپہر میں پٹایا ساحل کی ریت پر ٹہلتے ٹہلتے اس حوالے سے سون کے ساتھ میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ سون نے بتایا تھا کہ وہ دیہاتی علاقے میں پروان چڑھی تھی۔ تیرہ چودہ سال تک اسے مرد وزن کے تعلق کا کچھ پتا نہیں تھا۔ پھر ایک روز وہ اپنے سے ذرا چھوٹی عمر کے بچوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل کر گھر آئی تھی تو اس کی بڑی بہن نے اسے پکڑ دھکڑ کر باتھ روم میں گھسا دیا تھا اور نہانے دھونے کے لیے کہا تھا۔ بعد میں اسے نئے کپڑے پہنائے گئے تھے اور مقامی طرز کا ہلکا پھلکا میک اپ کیا گیا تھا۔ وہ حیران تھی پھر بڑی بہن نے اسے بتایا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ کچھ لوگ اسے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔ شادی کے نام سے اس نے رونا شروع کر دیا تھا...... پھر دو چار ماہ بعد اس کی شادی ہوگئی تھی اور چار پانچ ماہ بعد ختم بھی ہوگئی تھی۔ بہر حال اس سلسلے میں سون نے مجھے تفصیل بتانے سے گریز کیا تھا۔ سون کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ بچپن یا لڑکپن اور نوجوانی کے رومانس کا دور اس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا۔ جس وقت اسے مرد وزن کے تعلقات کا پتا چلا اس وقت اس نے اپنے اردگرد بس ہوس کاروں کو ہی پایا۔

پٹایا بیچ کے کنارے ہونے والی وہ ساری گفتگو مجھے یاد آئی اور مجھے لگا کہ بچپن کی محبت کے حوالے سے سون نے منگ ہو سے یقیناً جھوٹ ہی بولا ہے۔

پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی بے قراری میرے رگ و پے میں سرایت کرتی چلی جارہی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہاں سے میرے جانے کے بعد سون کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے۔ اس کے کردار میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں واقعی میری ذات کا کوئی عمل دخل ہے۔ مجھے رہ رہ کر کال گرل چانگ کی باتیں بھی یاد آرہی تھیں۔ اس نے دو دن پہلے بتایا تھا کہ 94ء کے کرسمس سے پہلے سون بہت اداس تھی۔ وہ ڈسکو کلب میں آتی تھی لیکن وہاں چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے کسی کا انتظار کرتی ہو۔ کہیں وہ میرا انتظار تو نہیں کرتی تھی؟ یہ بات یقین کرنے والی تو نہیں تھی مگر نجانے کیوں میرا دل یقین کرنے کو چاہ رہا تھا اور جب میں یقینی انداز میں سوچتا تھا تو جسم میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگتا تھا۔ یہ درد میرے لیے ایک بالکل نئی چیز تھی۔ وہ ساری رات میں نے نیم خوابی کی کیفیت میں گزاری۔ سون کی آواز اور صورت میرے آس پاس منڈلاتی رہی۔

کمرے کی کھڑکی سے باہر بنکاک کی روشن روشن گلیوں میں سمندر کی ہوا کسی توبہ شکن حسینہ کی طرح لہرا لہرا کر چلتی رہی۔ پروازوں کے الٹ پھیر کی وجہ سے ہمیں بنکاک میں ایک دن مزید مل گیا تھا۔ یعنی ہمیں کل کے بجائے پرسوں شام بنکاک سے لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن یہ وقت بھی سون کو ڈھونڈنے کے لیے بہت کم تھا۔ ہمارے پاس کل چھتیس گھنٹے تھے۔ کیونکہ پرسوں دوپہر ہمیں ہوٹل سے ائرپورٹ جانے کی تیاری شروع کر دینی تھی۔ میں سوچ رہا تھا، کیا اگلے چھتیس گھنٹوں میں میں سون کو ڈھونڈنے اور اس سے ملنے میں کامیاب ہو جاؤں گا؟

اگلا سارا دن بھی گومگو کی کیفیت میں گزرا۔ پارٹی کے باقی ارکان آخری شاپنگ میں مصروف تھے۔ سینٹر اسٹور اور رابنسن اسٹور کے چکر لگ رہے تھے۔ کامران بوبے مارکیٹ گیا ہوا تھا۔ اسے بوبے مارکیٹ بہت پسند آئی تھی۔ اس کے اپنے بھتیجے بھتیجیوں کے لیے وہاں ریڈی میڈ گارمنٹس خریدے تھے۔ کسی سردار ہربچن سنگھ سے اس کی یاری ہوگئی تھی اور وہ اسے خصوصی ڈسکاؤنٹ پر کپڑے دے رہا تھا۔ کامران کی زبانی بوبے مارکیٹ کا تفصیلی ذکر سن کر مجھے بوبے مارکیٹ میں رونما ہونے والا ایک پرانا واقعہ یاد آگیا تھا۔ میں سون کے ساتھ مارکیٹ میں شاپنگ کر رہا تھا۔ سون نے بچوں کے کھلونے دیکھتے دیکھتے ایک تھائی گڑیا دیکھی تھی گڑیا دیکھ کر اس کا رنگ بدلا تھا اور حالت غیر ہونے لگی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور چنکی ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ وہ اچانک نمودار ہوا تھا اور اس نے سون کو ہوش میں لانے میں میری مدد کی تھی۔

اس وقت میں چنکی کی آمد کو ایک اتفاق سمجھا تھا...... لیکن اب تقریباً ساڑھے چار سال بعد معلوم ہوا تھا کہ چند دوسرے ”اتفاقات“ کی طرح وہ بھی اتفاق نہیں تھا۔ چنکی ہمہ وقت سائے کی طرح سون کے اردگرد موجود رہتا تھا۔ وہ سون کا قانونی شوہر تھا۔ وہ ننھی سی نازک سی جان کتنی کڑی نگرانی میں تھی۔ دکھوں نے کس طرح گھیر رکھا تھا اسے...... پھر بھی مجھے لگتا تھا کہ شاید وہ بنکاک کی سب سے چنچل اور مست حال لڑکی ہے۔ بنکاک آ کر اس کو دوبارہ دیکھنے اور اس کے حالات جاننے کی خواہش اتنی شدت سے میرے دل میں جاگی تھی کہ اس کی مزاحمت کرنا میرے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر میں جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اسی لیے بنکاک کے قریب پہنچ کر بھی بنکاک میں داخل ہونے

سے کترا رہا تھا۔ شام کے بعد حسب پروگرام اس ریسٹورنٹ میں منگ ہو سے ملاقات ہوئی جو صرف چائے پلاتا تھا۔ ریسٹورنٹ کا نام اتنا مشکل تھا کہ بار بار پڑھنے کے باوجود ہماری زبان پر نہیں چڑھ سکا۔ نتیجتاً حمزہ نے اس کا نام ہی مشکل ریسٹورنٹ رکھ دیا تھا۔

ہم ''مشکل'' ریسٹورنٹ میں پہنچے تو میڈم منگ ہو بھی عین اسی وقت دروازے سے داخل ہوئی۔ اس نے ثابت کیا کہ تھائی لینڈ میں بھی بہت سے لوگ وقت کی پابندی کو ''ملحوظ خاطر'' رکھتے ہیں۔ منگ ہو کی وجہ سے ہمیں بھی ''مشکل ریسٹورنٹ'' میں وی آئی پی کا درجہ دیا جا رہا تھا۔ نفیس وردیوں میں ملبوس حسین ملازمائیں تتلیوں کی طرح ہمارے ارد گرد منڈلا رہی تھیں۔ منگ ہو کے چہرے پر مجھے کامیابی کی چمک نظر آئی۔ ہم دونوں نے اندازہ لگایا کہ وہ سون کا پتا ڈھونڈنے میں کامیاب رہی ہے۔ یہ اندازہ درست نکلا۔ منگ ہو نے ایک کاغذ ہمارے سامنے رکھ دیا۔

کاغذ پر ایڈریس لکھا گیا تھا اور لائنوں کی مدد سے تھوڑا سا سمجھایا بھی گیا تھا۔ بنکاک سے قریباً پانچ چھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر Maha Sarakham کا ایک چھوٹا شہر تھا۔ یہاں پہنچنے کے لیے بنکاک سے شمال مشرق کی طرف بذریعہ سڑک سفر کرنا پڑتا تھا۔ Maha کے آس پاس کے علاقے بارانی جنگلات پر مشتمل تھے۔ Maha سے قریباً چالیس میل شمال مشرق کے رخ پر لکشون نام کا ایک گاؤں تھا۔ سون اور چنکی وہیں کے رہنے والے تھے۔

منگ ہو کے مطابق راستے دشوار گزار تھے Maha تک بھی سڑک بہت اچھی نہیں تھی اور وہاں سے آگے تو بالکل جنگل کا راستہ تھا۔ جیپ یا چھکڑے وغیرہ پر ہی سفر کیا جا سکتا تھا۔ Maha Sarakham کا نام میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہوا تھا۔ کافی لمبا نام تھا۔ منگ ہو آسانی کے لیے صرف Maha (یعنی ماہا) کہہ رہی تھی، ہم بھی ماہا ہی کہنے لگے۔

منگ ہو بولی۔ ''ویسے میں تم دونوں جنٹلمین کو ایک اور مشورہ دوں گی۔ گاؤں جانے سے پہلے تم یہاں بنکاک میں بھی تھوڑی سی ٹرائی کر لو۔ چنکی نے یہاں دو تین سال ٹیکسی چلائی ہے۔ اس کے کئی یار دوست بھی تھے۔ یہاں پیٹ پونگ روڈ پر ساتھ ساتھ دو ہوٹل ہیں۔ جو ٹیکسی اور رکشا ڈرائیوروں کی بیٹھک کے لیے مشہور ہیں۔ ایک ہوٹل کا نام نارتھ اسٹار اور دوسرے کا شوڈی ہے۔ یہاں تمہیں ڈی ہوپ نام کا ایک ٹیکسی ڈرائیور مل سکتا ہے۔ وہ تمہیں سون اور چنکی کے بارے میں تازہ ترین صورت حال بتا سکتا ہے۔ ڈی

ہوپ کے ساتھ چنکی کا گہرا دوستانہ تھا۔

''جن دنوں سون ہمارے ہاں کام کرتی تھی، چند مرتبہ چنکی کے ساتھ یہ دوسرا شخص بھی سون سے ملنے آیا تھا۔ بعد ازاں دونوں دوستوں میں چپقلش بھی ہو گئی تھی اور سر پھٹول تک نوبت آئی تھی...... میرا خیال ہے جنٹلمین! کہ تمہیں ان دونوں ہوٹلز کا ایک چکر ضرور لگانا چاہئے۔ بلکہ ہو سکے تو تم ابھی چلے جاؤ۔ تمہیں وہاں ڈی ہوپ نام کا بندہ نہ بھی ملا تو کوئی نہ کوئی ایسا ضرور مل جائے گا جو تمہیں چنکی کے Where Abouts کے متعلق بتا سکے گا۔ عین ممکن ہے کہ تمہیں چنکی کے گاؤں تک کا سفر کرنا ہی نہ پڑے۔ چنکی اور سون کہیں آس پاس ہی موجود ہوں۔''

اس معاملے پر ہمارے درمیان تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ ہمارے پاس وقت بہت کم تھا۔ ہم میڈم منگ ہو سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارا پروگرام پیٹ پونگ روڈ پر جانے کا تھا۔ وقت رخصت میڈم منگ ہو نے ایک بار پھر ہمیں تاکید کی کہ اگر ہمیں سون کے بارے میں کچھ پتا چلتا ہے تو ہم اسے ضرور اطلاع کریں۔ میڈم نے ہمیں اپنا ذاتی فون نمبر بھی دیا۔

ہم ''مشکل ریسٹورنٹ'' سے پیٹ پونگ روڈ کی طرف روانہ ہوئے تو نو بج چکے تھے۔ بنکاک کے مساج گھروں، نائٹ کلبوں اور لیڈی ہومز میں زندگی جاگ اٹھی تھی۔ ہم نے وہاں سے رکشا لیا اور پیٹ پونگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہی وہ فلیٹ بھی پڑتا تھا جہاں ایک بار میں سون کو چھوڑنے آیا تھا۔ ایک فیصد توقع بھی نہیں تھی کہ سون یہاں موجود ہو گی پھر بھی وہاں سے گزرتے ہوئے میں نے فلیٹ کو دیکھنا چاہا۔ فلیٹ نظر نہیں آئے۔ وہاں ایک چھوٹا سا شاپنگ پلازا کھڑا تھا۔ میں ایک سرد سانس لے کر رہ گیا۔ سون نے مجھے ایک نمبر بھی دیا تھا وہ فون نمبر بھی غالباً اسی جگہ کا تھا (لاہور پہنچتے ہی میں نے کہیں پھینک دیا تھا) یہ وہ علاقہ ہے جہاں سب سے زیادہ نائٹ کلب اور عشرت کدے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بنکاک کا ''ریڈ ایریا'' ہے۔ (حالانکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اور چند مقدس جگہوں کو چھوڑ کر پورے شہر کو ہی ریڈ ایریا کہا جا سکتا ہے) رکشا والے نے ہم سے ساٹھ بھات لیے اور ہمیں Silom are کے اندر اتار دیا۔ راستے میں اس نے حسب دستور ہمیں ایک البم بھی دکھائی جس میں مختلف عشرت کدوں اور ''سامان عشرت'' کی تصاویر موجود تھیں اور ورغلانے کے لیے دیگر تمام تفصیلات بھی درج کی گئی

تھیں۔ اگر لاہور میں گھومتے ہوئے کوئی شخص کسی شریف بندے کے ساتھ ایسی قبیح حرکت کرے تو باقاعدہ مار کٹائی ہو جائے لیکن بنکاک میں اس قسم کی دعوت گناہ روٹین کی بات تھی۔

پیٹ پونگ روڈ دراصل Silom are کا ہی ایک حصہ ہے۔ ہم پیدل چلے جا رہے تھے راستے میں ہم نے جو جو خرافات دیکھیں انہیں ضبطِ تحریر کرنا ممکن نہیں۔ ایک دو ''خرافات'' نے تو اتنا مختصر لباس پہن رکھا تھا کہ وہ جہاں سے شروع ہوتا تھا بس وہیں پر ختم بھی ہو جاتا تھا۔ شوڈی ہوٹل کے سامنے ایسی ہی چند ''خرافات'' نے ہمیں باقاعدہ گھیر کر اپنا ''ہم خیال'' بنانے کی کوشش کی۔

خدا خدا کر کے ہم شوڈی ہوٹل کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوئے۔ یہ تیسرے درجے کا ہوٹل تھا۔ دھوئیں اور اسپرٹ کی بو سے دماغ سنسنا اٹھا۔ خوب ہلا گلا ہو رہا تھا۔ ہم نے ڈی ہوپ کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کی۔ ڈی ہوپ کا نام بڑا معنی خیز محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں ہوپ یعنی امید کا لفظ موجود تھا اور ہم سون سے ملنے کی امید لے کر یہاں آئے تھے۔

جلد ہی ہمیں ایک دو افراد ایسے مل گئے جو ڈی ہوپ کو جانتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ڈی ہوپ اکثر یہاں آتا ہے بلکہ آج کل تو روزانہ ہی آ رہا ہے۔ تاہم اس کی آمد عموماً ایک بجے کے بعد ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کم از کم ایک بجے کے بعد ہی ہم ڈی ہوپ سے مل سکیں گے۔ میں نے حمزہ سے مشورہ کیا۔ فیصلہ ہوا کہ ہم یہیں بیٹھ کر ڈی ہوپ کا انتظار کریں گے۔

میرے کہنے پر حمزہ نے ہوٹل فلوریڈا میں رخشی وغیرہ کو فون کر دیا۔ اس نے بتایا کہ ایک پرانے دوست مل گئے ہیں، ان کے ساتھ ان کے گھر جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ رات کو دیر سے آئیں یا پھر صبح ہی واپسی ہو۔

فون بند کرنے کے بعد خاصا اطمینان ہو گیا۔ ہم نے شوڈی ہوٹل میں بیٹھ کر پزا کھایا اور چائے وغیرہ پی۔ لال لال ہونٹوں اور چوڑے چوڑے رخساروں والی تھائی لڑکیوں کی طرف سے دعوت گناہ بھی ملتی رہی۔ ڈی ہوپ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ پہلے پولیس میں تھا لیکن بعد میں معطل ہو کر ٹیکسی ڈرائیور بن گیا تھا۔ وہ باکسنگ وغیرہ بھی جانتا تھا۔ چنکی کا نام بھی بیشتر ڈرائیوروں کو معلوم تھا لیکن چنکی کے موجودہ حالات کے متعلق کسی کو

زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ بیشتر افراد نے اسے دو تین برس سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک دو بندے ایسے بھی ملے جنہوں نے بتایا کہ چنکی کے بارے میں ہمیں ڈی ہوپ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ ہم نے بھی عام ڈرائیوروں کو چنکی کے حوالے سے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اس سے کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔

ڈی ہوپ کا انتظار ہماری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا۔ وہ قریباً تین بجے کے قریب جھومتا اور ڈولتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکتی تھی۔ آنکھیں سوجی سوجی تھیں۔ وہ بہت شکستہ انگلش بولتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں چنکی کی تلاش میں ہوں۔

''کس لئے؟'' ڈی ہوپ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یونہی! اس سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''دراصل ہم یہاں ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ ہم دیہاتی علاقوں میں علاج معالجے کی سہولتوں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ چنکی اور اس کی گرل فرینڈ سون کا تعلق بھی دیہات سے تھا۔ وہ دونوں اس حوالے سے مجھے کافی کچھ بتایا کرتے تھے۔ ان کا آبائی علاقہ ایک آئیڈیل دیہاتی علاقہ تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ دو چار دن اس علاقے کا سروے بھی کیا جائے۔''

ڈی ہوپ نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ سون، چنکی کی گرل فرینڈ نہیں بیوی تھی۔ وہ اب پتا نہیں کہاں ہے اور کہاں نہیں۔ جہاں تک چنکی کی بات ہے اس سے شاید تمہاری ملاقات ہو جائے لیکن وہ اس قابل ہرگز نہیں کہ تم اس کی میزبانی سے لطف اندوز ہو سکو۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ نیم پاگل ہو چکا ہے۔ بلکہ شاید کچھ عرصے تک بالکل ہی بیکار ہو جائے۔''

میں نے تشویش ناک انداز میں ہونٹ سکوڑے۔ ''کیا تم اس بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے مسٹر ڈی ہوپ؟''

ڈی ہوپ کچھ دیر تک اپنے خیالات جمع کرنے کی کوشش کرتا رہا، پھر بولا۔ ''چنکی سے میری ''سیکنڈ لاسٹ'' ملاقات ڈھائی پونے تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھیں نشے سے انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک سہمی ہوئی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ دونوں بارش میں بھیگے ہوئے تھے۔ پہلے تو میں اس لڑکی کو پہچان ہی نہیں سکا، وہ

سون تھی۔ اس کے بال بھونڈے طریقے سے کاٹ دیئے گئے تھے۔ وہ ایک برساتی میں لپٹی ہوئی تھی۔ برساتی کی بوسیدہ ٹوپی سے قطرہ قطرہ پانی سون کے زرد چہرے پر گر رہا تھا۔ یہ رات کے گیارہ بجے کا عمل تھا۔ میں نے سون اور چنکی کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ مجھے معلوم ہوا کہ صرف ایک دن پہلے سون جیل سے چھ ماہ کی سزا کاٹ کر رہا ہوئی ہے اور چنکی اسے گاؤں واپس لے جا رہا ہے۔ میرے گھر آنے سے پہلے وہ ایک رات ہوٹل میں رہے تھے اور وہاں کسی بات پر سون اور چنکی میں خوب خوب تکرار ہوئی تھی۔"

ڈرائیور ڈی ہوپ نے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ناک میں تھوڑی سی ہیروئن چڑھائی اور بولا۔ "اس رات میں سون کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ وہ ایک تازہ کلی ہوا کرتی تھی لیکن اب خزاں رسیدہ پتے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ سون کے ساتھ چنکی کا تنازعہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ وہ سون کو اسی پیشے کی جانب کھینچنا چاہ رہا تھا جو اس نے ایک ڈیڑھ سال پہلے چھوڑا تھا۔ اس رات چنکی نے مجھ سے ایک عجیب بات کہی۔ اس نے مجھ سے "ربڑ" مانگا۔ ربڑ دراصل وہ آلہ ہے جو پولیس والے مار پیٹ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ خالص ربڑ یا موٹے ریگسین کا ٹکڑا ہوتا ہے جسے لکڑی کا دستہ لگایا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس سے "مار کھانے والے" کے جسم پر نشان نہیں پڑتا اور نہ جلد وغیرہ متاثر ہوتی ہے۔

چنکی دراصل سون سے مار پیٹ کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی شدید خواہش یہ بھی تھی کہ سون کی خوبصورت جلد کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچے۔ وہ جانتا تھا کہ سون کا شفاف اور بے داغ جسم ہی اس کے لیے کامیابی کی کنجی ہے۔ اس کا رویہ سون کے حوالے سے وہی تھا جو ایک تاجر کا اپنے "مال" کے حوالے سے ہوتا ہے۔ میں نے چنکی کو سمجھایا کہ سون بڑی حساس لڑکی ہے وہ اس کے ساتھ مار پیٹ کا راستہ اختیار نہ کرے۔ وہ سون کو غلیظ گالیاں دینے لگا اور چیخنے لگا کہ اس حرام زادی نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ بیٹھے بٹھائے اس کے دماغ میں نیکی اور پاک بازی کا خناس گھس گیا ہے جس کی وجہ سے حالات موت سے بدتر ہو گئے ہیں۔ وہ ایک بار پھر اپنے قرضے کا رونا رونے لگا۔ اس واقعے کے بعد میں نے قریباً دو برس تک چنکی یا سون کی شکل نہیں دیکھی۔ چنکی کے یار دوست اکثر اس کے بارے میں بات کرتے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ایک دن وہ اچانک غائب ہو گیا تھا اسی طرح اچانک آ بھی جائے گا لیکن ایسا

کچھ نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ وہ ہم سب کے ذہنوں سے نکل گیا۔ ایک دو بندوں کو اس کے گاؤں کے متعلق تھوڑا بہت معلوم تھا مگر اتنی دور کون جاتا اور اس کا کھوج لگاتا۔ مگر کوئی پانچ چھ مہینے پہلے اچانک ایک روز چنکی سے میری ملاقات پھر ہو گئی۔

ڈی ہوپ نے تھوڑا سا مزید پاؤڈر ناک میں چڑھایا اور بولا۔ "میں پیٹ پونگ کی ایک سڑک پر جا رہا تھا۔ ڈریم لینڈ کیسینو کے سامنے میں نے چند افراد کو جھگڑتے دیکھا۔ میں نے ٹیکسی روک کر وہاں کا جائزہ لیا۔ پانچ نوجوان بھکشو ایک شخص سے دست و گریباں تھے۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ مفلوک الحال شخص چنکی تھا۔ اس کا حال فقیروں جیسا ہو رہا تھا۔ وزن بھی بہت کم ہو چکا تھا۔ میں نے چنکی کو بھکشوؤں کے چنگل سے چھڑایا۔ پتا چلا کہ چنکی شراب کے نشے میں دھت تھا۔ اس نے ایک راہ چلتے شریف النفس بھکشو Monk کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اس پر جھگڑا ہو گیا اور بھکشو جو عام طور پر لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہیں چنکی کو مارنے پر مجبور ہو گئے۔ چنکی کی ذہنی حالت بھی ابتر نظر آئی تھی۔ میں نے اسے ٹیکسی میں بٹھایا اور یہیں شوڈی ہوٹل لے آیا۔ وہ راستے میں الٹی سیدھی ہانکتا رہا تھا، یہاں آ کر بھی اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ وہ کبھی سون کو صلواتیں سنانے لگتا تھا، کبھی کسی "ایلش" نام کے شخص کو گالیاں دینے لگتا تھا۔ میں نے اس سے سون کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے، تو بولا وہ بھاگ گئی ہے، لیکن میں نے اس کو چھوڑنا نہیں ہے۔ میں نے اسے گروایلش کے استرے کے ساتھ ہی ذبح نہ کیا تو میرا نام چنکی نہیں۔ میں نے اس سے گروایلش کے بارے میں بہت پوچھا کہ وہ کون ہے، لیکن وہ بس ادھر ادھر کی ہانکتا رہا۔ وہ بنکاک کے ساتھ بھی اپنی نفرت کا اظہار کر رہا تھا اور بنکاک والوں کو بڑی بڑی گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ وہ سون کو بنکاک میں لے کر آتا، نہ وہ اس کے ہاتھ سے نکلتی۔ اسے پختہ یقین تھا کہ تین چار سال پہلے سون نے یہاں کسی سے آنکھ لڑائی تھی۔ بلکہ اسے عشق کی بیماری لگ گئی تھی۔ اس اسی بیماری نے اس کا دماغ خراب کر دیا اور وہ کیا سے کیا ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ بنکاک میں کیا کر رہا ہے۔ کیا وہ یہاں سون کو تلاش کر رہا ہے۔ وہ بولا نہیں، میں بس برسات ختم ہونے کا انتظار کر رہا ہوں، اس کے بعد سون مرغی کی طرح میرے پاؤں کے نیچے دبی ہو گی اور میرا استرا اس کی شہ رگ پر ہو گا۔ اس کا نشہ اتر چکا تھا مگر وہ مسلسل الٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔ میں نے سوچا، چلو جیسا بھی ہے، وہ میرا دوست رہ چکا

ہے۔ اس کی مدد کرنی چاہئے۔ میں نے کہا۔ "چلو آؤ؟ میں تمہیں ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔" وہ مجھ پر پھٹ پڑا کیا تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔ کیا مجھے ایڈز ہو گئی ہے یا میں کوڑھی ہو گیا ہوں کہ تم مجھے ڈاکٹر کو دکھاؤ گے...... وہ مجھ سے لڑنا شروع ہو گیا۔ غصے میں آ کر وہ بہت جلد مکے بازی شروع کر دیتا تھا۔ اس نے مجھے یہاں ٹھوڑی کے نیچے مکا مارا۔ یہ دیکھو یہ تین ٹانکے لگے ہوئے ہیں۔ جس وقت میں قریبی کلینک میں ٹانکے لگوا رہا تھا۔ چنکی "شوڈی" ہوٹل سے کہیں غائب ہو گیا۔ مجھے اس پر تاؤ آیا ہوا تھا، میں نے بھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔"

"اس کے بعد وہ پھر نظر نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... نہ ہی کوئی اطلاع ملی۔ سون کا خیال کئی بار میرے دماغ میں بھی آیا ہے۔ وہ کمزور سی تو عمر لڑکی تھی، چنکی جیسے خرانٹ کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔ پتا نہیں اس پر کیا گزری ہو گی۔"

ایک طویل گفتگو کے بعد جس وقت ہم چنکی کے پاس سے اٹھے صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ میرے دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ صرف چند گھنٹے بعد ہمیں بنکاک سے روانہ ہو جانا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی، میرا دل بنکاک سے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی جو مجھے یہاں رکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ زیادہ نہیں تو چار پانچ دن یہاں مزید رہ لوں۔ میں ایک بار سون تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک دم ہی میرے لیے بہت اہم ہو گئی تھی۔ مجھے اس بات پر پورا بھروسہ نہیں تھا لیکن میں اسے سنے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ آواز کہہ رہی تھی کہ جس طرح میں سون کو نہیں بھولا، سون بھی مجھے بھولی نہیں...... گزرے ماہ و سال میں اس نے مجھے یاد رکھا ہے۔ اس کی زندگی میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں کسی نہ کسی درجے میں میرا ہاتھ بھی ہے۔ میں اس کی زندگی میں موجود رہا ہوں۔ کسی نہ کسی طور کسی نہ کسی حوالے سے۔

تقریباً چار سال پہلے، بنکاک میں گھومتے پھرتے میرے اور سون کے درمیان جو گفتگو ہوا کرتی تھی اس کے ٹکڑے بار بار میری سماعت میں گونج رہے تھے۔ یہ ایک ایسی بازگشت تھی جو مجھے بہت گہرائی تک متاثر کر رہی تھی۔ وہ اڑتے اڑتے سے فقرے تھے۔

"چھوڑو مذہب معاشرے کی باتیں، میں ان سے الرجک ہوں۔"

"یہ بھی تو انتہا پسندی ہے۔" میں نے کہا تھا۔

"جو کچھ بھی ہے مجھے پسند ہے۔ میں اپنی زندگی آپ جی رہی ہوں میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"لیکن ایک بات یاد رکھنا سون! جو لوگ انتہا پسند ہوتے ہیں، کبھی کبھی زبردست قسم کا یوٹرن بھی لیتے ہیں۔"

پھر ایک روز فلوٹنگ مارکیٹ کی سیر سے واپس آتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔ "کبھی کسی عبادت گاہ میں جانا بھی ہوا۔"

وہ بولی۔ "میں جس دنیا میں رہتی ہوں، وہ عبادت گاہوں سے بہت دور ہے۔ وہ ٹھوس حقیقتوں کی دنیا ہے مسٹر ٹورسٹ! چکن کی لذت سے لے کر اپنے پارٹنر کے بدن تک سب کچھ ٹھوس حقیقتوں میں سے ہے۔"

میں نے کہا تھا۔ "لیکن حقیقتیں بہت جلد اپنا ذائقہ بدل لیتی ہیں۔ خوشی کے سینڈوچ مسلسل کھاتے چلے جائیں تو بہت جلد ابکائی آنے لگتی ہے۔"

اور پھر ایک روز جب انکل سے دوبارہ رابطہ ہونے کے بعد میرے اور سون کے پروگرام مختصر ہو گئے تھے تو وہ بڑی اداسی سے بولی تھی۔ "یعنی آج ...... میرے اور تمہارے ساتھ کا آخری دن ہے؟"

"ہاں، کل سے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ جو چاہو پہن سکتی ہو، جو چاہو پی سکتی ہو۔" میں نے کہا تھا۔

کھڑکی سے باہر ساحل کی ہوا میں جھومتے ناریل کو دیکھ کر وہ عجیب سے لہجے میں بولی تھی۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ کل سے میں پابند ہو جاؤں گی۔"

سون کے بھولے بسرے فقرے مسلسل میری سماعت پر یورش کر رہے تھے پھر ان فقروں پر ڈی ہوپ کی آواز اوور لیپ ہونے لگی۔ "وہ کسی سے پیار کرنے لگی تھی۔ بلکہ شاید عشق کرنے لگی تھی......" پھر ڈی ہوپ کی آواز پر میڈم منگ ہو کی آواز حاوی ہو گئی تھی۔ "سون نے اعتراف کیا تھا کہ وہ پیار کرتی ہے۔ وہ کسی سے بہت پیار کرتی ہے۔"

"کہاں کھو گئے ہو شادا!" فٹ پاتھ پر چلتے چلتے حمزہ نے مجھے باقاعدہ ٹہوکا دیا۔

میں چلتے چلتے رک گیا۔ بدن میں گہری نقاہت اتر گئی تھی۔ شاید یہ رات بھر جاگنے کا اثر تھا...... یا پھر اس ہلچل کا نتیجہ تھا جو کئی گھنٹوں سے دل و دماغ کو تہ و بالا کر رہی تھی۔

سپیدہ سحر نمودار ہونے والا تھا۔ بیکری کی دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اخبار فروش بھی نظر آ رہے تھے۔ تھکے ماندے شرابی ''ریڈ ایریا'' سے نکل کر گھروں کا رخ کر رہے تھے۔ ہمارے سامنے ایک مدہوش انڈین سیاح کو رکشا والے نے باقاعدہ گود میں اٹھا کر رکشے پر لادا۔ میں نے گھڑی دیکھی پھر ایک طویل سانس لے کر حمزہ سے کہا۔ ''آؤ ذرا چند منٹ اس ریسٹورنٹ میں بیٹھیں۔''

حمزہ میرے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے آگاہ تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئے۔ بیشتر میزیں خالی تھیں۔ ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ پتہ نہیں کیوں میرے کانوں میں ایک بھولا بسرا پاکستان نغمہ گونجنے لگا تھا۔ ''میں تیرے اجنبی شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تجھے! مجھ کو آواز دے۔'' دو تین منٹ تک ہمارے درمیان گمبھیر خاموشی حائل رہی، پھر میں نے حمزہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''حمزہ! میں چار پانچ دن مزید یہاں رکنا چاہتا ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم لوگ آج چلے جاؤ میں ہفتے کے آخر تک آ جاؤں۔''

''سون کو دیکھنا چاہتے ہو۔''

''ہاں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''شاید اب تم یہ کہو گے کہ یہ مناسب نہیں ہے۔''

''ظاہر ہے کہ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا رخشی کیا سوچے گی؟''

''اس سے فی الحال یہ سب کچھ چھپانا ہو گا۔ بعد میں کسی مناسب وقت میں خود ہی اسے سب کچھ بتا دوں گا۔''

''اب کیا کہو گے؟''

''ایک معقول بہانہ خود بخود بن رہا ہے۔ رخشی وغیرہ کو یہ معلوم ہے کہ آج رات سرراہ مجھے کوئی دوست مل گیا تھا اور ہم نے رات اس کے گھر گزاری ہے۔ اسی بہانے کو تھوڑا سا آگے بڑھا لیتے ہیں کوئی ایسی وجہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ دوست اور اس کی فیملی کے شدید اصرار پر مجھے دو چار دن مزید یہاں رہنا پڑے۔ ہمارے وفد کا ایک ممبر اسی طرح چار پانچ دن ملائیشیا میں بھی تو رہ گیا تھا۔

حمزہ نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فی الحال تم ہمارے ساتھ ہی چلے چلو۔ بعد میں موقع محل دیکھ کر پھر آ جاؤ۔''

''نہیں یار!'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے کسی سے کچھ چھپانا نہیں ہے۔ رخشی سے

بھی وقتی طور پر صرف اس لیے چھپا رہا ہوں کہ اسے دھچکا نہ لگے۔''

''تم چاہتے کیا ہو۔ سون سے مل کر کیا کرو گے۔ ابھی تو تمہیں یہ بھی یقین نہیں ہے کہ سون نے تمہیں یاد رکھا ہوا ہے اور اس کے اندر جو تبدیلیاں آئی ہیں وہ تمہاری وجہ سے ہیں لیکن اگر ایسا ہے بھی تو اس سے حاصل کیا ہو گا۔ تم خود کہا کرتے ہو کہ خوابوں کے پیچھے بھاگ کر اوندھے منہ گرنا تمہیں کبھی پسند نہیں رہا۔''

''نہیں یار! میں خوابوں کے پیچھے نہیں بھاگ رہا۔ نہ ہی سون میرے لیے کوئی خواب ہے۔ بس میں صرف ایک بار اس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

حمزہ نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ چار سال پہلے اس نے واقعی تمہارا انتظار کیا ہو۔ تمہاری راہ دیکھی ہو...... لیکن اب آہستہ آہستہ اس کا دل ٹھکانے پر آ چکا ہو۔ وہ تمہاری دوری برداشت کر چکی ہو۔ اب تم اسے ڈھونڈ کر اور اس کے سامنے جا کر اس کے سارے پرانے زخم چھیل دو گے۔ ممکن ہے کہ تمہارے ملنے سے اس کی زندگی پہلے سے زیادہ تکلیف دہ ہو جائے۔''

حمزہ اپنے انداز سے مجھے سمجھاتا رہا۔ اس کی کچھ باتوں میں وزن بھی تھا لیکن بنکاک میں آنے کے بعد میرے اندر جو ایک شدید قسم کی تحریک شروع ہوئی تھی اسے نظر انداز کرنا اب میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں یہاں سے چلا بھی گیا تو چند دن کے اندر اندر مجھے پھر واپس آنا پڑے گا۔ میرے اندر کا مقناطیسی تجسس مجھے دیکھتے ہی دیکھتے پھر یہاں کھینچ لائے گا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر پا رہا تھا۔

حمزہ نے جب میرا پختہ ارادہ دیکھا تو بلیک کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے اگر تمہارا یہی فیصلہ ہے تو پھر میرا بھی ایک فیصلہ ہے۔ پانچ دن بعد ہم اکٹھے یہاں سے واپس جائیں گے۔ میرا مطلب ہم دونوں سے ہے۔ میں تمہیں یہاں اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''

''یار میں نے یہاں کوئی جنگ تو نہیں لڑنی، اگر......''

''جو کچھ بھی ہے، میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' حمزہ نے تیزی سے میری بات کاٹی۔

ہمارے درمیان کچھ بحث و تمحیص ہوئی پھر ہم ایک آخری فیصلے پر پہنچ گئے۔ سات بج چکے تھے۔ قریب ہی واقع ایک بنگلا دیسی اسٹال سے ہم نے ناشتہ کیا پھر ہوٹل فلوریڈا فون کرنے کے لیے ٹیلی فون بوتھ کی طرف بڑھ گئے۔ پروگرام کے مطابق میں نے رخشی سے

خود بات کی۔ میں نے سنجیدگی سے اسے بتایا کہ یہ ایک پرانا کلاس فیلو تھا جو یہاں ملا ہے۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہے۔ رات وہ اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس کے واسطے سے دو تین اور پرانے دوستوں سے ملاقات ہوگئی ہے۔

رخشی میری تمہید سے اکتا کر بولی۔ ''چلو ٹھیک ہے، لیکن آ کب رہے ہو۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ چار بجے تک ہمیں ہوٹل سے نکل جانا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ایک دو بجے تک یہاں سے فارغ ہو جائیں تم لوگ پیکنگ وغیرہ مکمل کرلو۔ میں ایک بجے کے لگ بھگ تمہیں پھر فون کروں گا اور تازہ صورت حال بتا دوں گا۔''

''تازہ صورتحال؟'' وہ فوراً چونک کر بولی۔ ''تم کھل کر بات نہیں کر رہے ہو۔''

''بس ایک ایمرجنسی کام بھی پڑ گیا ہے یہاں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ دو تین گھنٹے میں نمٹا لوں۔''

''شادا خیریت تو ہے ناں؟'' رخشی کے لہجے میں ان گنت اندیشے تھے۔

''اوہو ڈیئر! بالکل خیریت ہے۔ یقین نہیں تو گواہ حاضر کر دیتا ہوں۔ حمزہ میرے ساتھ ہی کھڑا ہے۔''

''لیکن کام کیا ہے؟''

''وہ تمہیں آ کر بتاؤں گا۔ ٹیلی فون پر مناسب نہیں ہے۔''

''شادا تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔''

میں نے دو تین منٹ تک ہلکی پھلکی گفتگو کر کے اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہا۔

رخشی سے بات ختم کرنے کے بعد میں اور حمزہ اپنے ہوائی ٹکٹ کی طرف متوجہ ہوئے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ٹکٹ اور پاسپورٹ وغیرہ ہمارے پاس ہی موجود تھے۔ ہمارے ٹکٹ زیادہ ڈیوریشن کے تھے۔ قریباً ایک سال کی مہلت تھی۔ ایسے ٹکٹ تھوڑے مہنگے تو ہوتے ہیں لیکن اگر ٹور کا دورانیہ اور وقت غیر یقینی ہو تو سہولت بھی ہوتی ہے۔ کسی کٹوتی کا ڈر نہیں ہوتا اور اس نوع کی دیگر مشکلات بھی نہیں ہوتیں۔ مقامی کرنسی بھی ہمارے پاس معقول مقدار میں موجود تھی۔ اس کے علاوہ امریکن ٹریولز چیک تھے۔ یہ سب کچھ ہم نے بڑی حفاظت کے ساتھ لباس کے اندر ہی رکھا ہوا تھا۔ اس مقصد کے لئے ہوٹل کے روم میں لا

کرز کی سہولت بھی موجود تھی۔ لیکن رخشی کے علاوہ اس سہولت سے کسی نے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ دو بجے کے لگ بھگ میں نے حمزہ کے ذریعے رخشی اور کامران کو دوبارہ فون کرایا یہ ''کافی لیٹ'' فون تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ حمزہ کے فون کرنے سے پہلے ہی رخشی اور کامران جان چکے ہوں گے کہ ہم ان کے ساتھ واپس نہیں جا رہے۔ یعنی وہ ہمارے بغیر پاکستان جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکے ہوں گے۔ حمزہ نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس نے رخشی اور کامران کو بتایا کہ ہم وقت پر فارغ نہیں ہو سکے۔ اس لیے وہ لوگ پاکستان فلائی کر جائیں ہم ایک دو دن بعد آ جائیں گے۔ تھوڑی سی بحث وتمحیص اور تھوڑے سے اظہار ناراضی کے بعد وہ لوگ واپس جانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ میں اور حمزہ پہلے ہی علیحدہ کمرے میں تھے۔ ہمارا ''پیک سامان'' اسی کمرے میں رکھا رہنے دیا گیا اور دروازہ مقفل کر کے چابیاں استقبالیہ پر دے دی گئیں۔

میں جانتا تھا کہ رخشی اور کامران کا دل برا ہوا ہوگا، خاص طور سے رخشی نے بہت محسوس کیا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے ذہن میں موہوم اندیشے بھی جاگے ہوں۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا میں مستقبل میں اپنی کوئی بات رخشی سے چھپانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ جب حمزہ فون کر چکا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ ائر پورٹ جا رہے ہیں تو مجھے دل پر بوجھ سا محسوس ہوا۔ شاید اس بوجھ کی وجہ یہ تھی کہ رخشی بھی بوجھل دل کے ساتھ جا رہی تھی......

لیکن جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کی شروعات میں مجھ سے زیادہ رخشی کا عمل دخل تھا۔ سب سے زیادہ اسی کا اصرار تھا کہ ہمیں بنکاک کے قریب آ کر بنکاک کو دیکھے بغیر واپس نہیں جانا چاہئے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا یہ اصرار میری اور اس کی زندگی میں کتنی ہلچل مچانے والا ہے۔

❀❀❀

ہم نے رات ہوٹل فلوریڈا میں ہی گزاری۔ صبح آٹھ بجے ناشتے کے فوراً بعد ہم نے ٹیلی فون ایکسچینج سے لاہور فون کیا۔ میں نے بھائی جان سے بات کی۔ انہیں اپنی خیریت کی اطلاع دی اور رخشی، کامران وغیرہ کی خیریت معلوم کی۔ وہ رات دس بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچ گئے تھے۔ اپنے بارے میں، میں نے بھائی جان کو بتایا کہ ایک دیرینہ دوست سے ملاقات کے بعد مجھے اور حمزہ کو پانچ چھ دن مزید بنکاک میں رکنا پڑ گیا ہے۔ میرے بعد حمزہ نے بھی گھر فون کیا اور اہل خانہ کو اپنی خیریت کے علاوہ اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کیا۔ اس کے بعد ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے، ہم بنکاک سے بذریعہ کوچ روانہ ہوئے۔ کوچ ائرکنڈیشنڈ تو تھی لیکن بہت اچھی حالت کی نہیں تھی، کرایہ بھی کچھ زیادہ محسوس ہوا۔ ہم پہلے جس شہر میں پہنچے اس کا نام تھائی لینڈ کے عام ناموں کی طرح کافی مشکل تھا یعنی Nakhon Ratciasima اس شہر کی حیثیت تھائی لینڈ کے دوسرے بڑے شہر کی ہے پھر بھی اپنی آبادی کے لحاظ سے یہ بنکاک کا دسواں حصہ ہے۔ یہاں پہنچ کر ہم نے کوچ بدلی اور نسبتاً ایک چھوٹی کوچ میں ماہا کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں نہریں، جھیلیں اور ہریالی کے یادگار مناظر دیکھنے کو ملے۔ ایک بڑے قصبے میں سے گزرتے ہوئے ہم تقریباً بارہ گھنٹے بعد سہ پہر ڈھائی بجے ماہا پہنچ گئے۔ یہاں ہم نے لنچ کیا اور پھر لکشون کی طرف رخ کیا۔ ماہا کے مضافات سے پندرہ بیس کلومیٹر تک ہم نے ایک جیپ نما گاڑی میں سفر کیا اور فی سواری تیس بھات ادا کیے۔ ایک چھوٹے سے قصبے سے ہم دو گھوڑوں والے مقامی طرز کے چھکڑے پر سوار ہوئے اور ہمارے سفر کا دشوار ترین مرحلہ شروع ہوا۔ یہ چوڑے پتوں والے درختوں سے گھرے ہوئے کچے راستے کا سفر تھا۔ چھکڑا بان کا نام کارینگ تھا۔ وہ ایک باتونی شخص تھا اور خوش قسمتی سے تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس کی کمپنی میں ہمارا سفر نسبتاً کم دشوار ہو گیا۔ ہم اس سے لکشون گاؤں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے۔ ہماری خواہش تھی کہ ہمیں کارینگ سے چنکی یا سون کے

بارے میں کوئی بات معلوم ہو جائے لیکن ہم براہ راست پوچھ کر اسے کسی شبہے میں بھی مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنی آمد کے متعلق ہم نے کارینگ کو مبہم انداز میں بتایا تھا کہ ہم ڈاکٹر ہیں اور سرکاری کام سے آئے ہیں۔

لکشون گاؤں کے مکانات دکھائی دیئے تو ذہن میں سب سے پہلا خیال چنکی کا آیا۔ عین ممکن تھا کہ اس گاؤں میں کرخت چہرہ چنکی سے ہماری ملاقات ہوتی۔ یہ ملاقات کئی خدشات اور امکانات کو وجود دے سکتی تھی۔

لکشون گاؤں چاروں طرف سے سبزے، درختوں اور کھیتوں سے گھرا ہوا تھا۔ گاؤں کے جنوب کی طرف ڈھلوانیں تھیں جن پر سبزے کی چادر بچھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ناریل، کیلے اور پام کے درخت کثرت سے نظر آتے تھے۔ مکانوں کی چھتیں نیچی تھیں۔ ان کی تعمیر میں ناریل اور بانس وغیرہ کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ کہیں کہیں گارے اور اینٹوں کی دیواریں بھی تھیں، تاہم بیش تر مکانات کی وضع قطع جھونپڑوں جیسی تھی۔ زیادہ تر مردوں کا لباس لنگی اور بنیان وغیرہ پر مشتمل تھا۔ عورتوں نے کرتے اور لنگیاں وغیرہ پہن رکھی تھیں۔ کچھ لنگیاں بالکل دھوتی کی طرز کی تھیں۔ اکثر عورتوں کے بالوں میں پھول نظر آتے تھے۔ تنکوں کے ہیٹ کا رواج بھی عام تھا۔

تھائی لینڈ کے اکثر دیہات میں ہمیں پگوڈا (بودھ مندر) نظر آئے تھے، یہاں لکشون گاؤں کے وسط میں بھی ایک پگوڈا موجود تھا۔ اس کی مخروطی چھت ناریل کے چھلکے، ناریل کی لکڑی اور بانس وغیرہ سے بنائی گئی تھی۔ درحقیقت ان علاقوں میں ناریل کے درخت کا اتنا عمل دخل تھا کہ وہ مختلف شکلوں میں ہر جگہ زیر استعمال دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لکڑی، چھال، ناریل کے خول، اس کا گودا، پانی، غرض ہر چیز مقامی لوگوں کے استعمال میں تھی۔

اپنے پروگرام کے مطابق ہم سیدھے گاؤں کے مکھیا کے پاس پہنچے۔ راستے میں کئی لڑکے اور گول مٹول بچے ہمارے ساتھ ہو لیے تھے۔ وہ ہمیں تعجب خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں مسکراتی ہوئی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ہمارے بیگ ہماری پشت پر بندھے ہوئے تھے جبکہ ایک ایک بریف کیس ہمارے ہاتھوں میں بھی تھا۔ میں نے اپنا اسٹیتھ سکوپ گلے میں لٹکا لیا تھا، مقصد یہی تھا کہ مقامی لوگ ہم سے کوئی سوال پوچھے بغیر ہمیں ڈاکٹر کی حیثیت سے شناخت کر سکیں۔ اس سے پہلے ہم جتنے بھی دیہات میں پہنچے تھے کوئی نہ کوئی مترجم ہمیں مل گیا تھا۔ امید تھی کہ لکشون میں بھی مل جائے گا۔ اگر نہ بھی ملا تو چھکڑا

بان کاریگ ہماری تھوڑی بہت مدد کر سکے گا۔ کاریگ کی راہنمائی میں ہم بستی کے مکھیا سے
ملے۔ مکھیا کا نام لان کون تھا۔ بھکشوؤں کی طرح اس کا سر صفاچٹ تھا۔ عمر کوئی پینتالیس
برس رہی ہوگی۔ وہ خاصا صحت مند تھا۔ اس نے رنگین لنگی کے اوپر ایک شلوکا سا پہن رکھا
تھا۔ اس شلوکے کے اگلے بٹن کھلے تھے جن میں سے لان کون کی تندرست چکیلی توند
جھانک رہی تھی۔ لان کون شکل سے سخت گیر لگتا تھا۔ لیکن جب وہ بولا اور تھوڑا سا مسکرایا تو
پتا چلا کہ اس کے رویے میں لچک اور نرمی موجود ہے۔ چکڑابان کاریگ نے مقامی زبان
میں ہمارا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ ہم ڈاکٹر ہیں اور دو تین دن گاؤں میں قیام کے لیے
آئے ہیں۔ لان کون نے ہمارے ساتھ خوش دلی سے ہاتھ ملایا اور ہمیں گھر کے اندر لے
گیا۔ جس کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا وہ یقیناً مہمان خانے کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہو
گا۔ یہاں فرش پر بید کی وسیع و عریض چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گدیاں رکھی تھیں جن
میں یقیناً ناریل کی چھال ہی بھری گئی تھی۔ بستی کے اکثر مکانات کی طرح لان کون کا مکان
بھی جھونپڑا نما تھا۔ تاہم یہ نسبتاً وسیع تھا اور زیادہ مضبوط بنا ہوا تھا۔ گارے مٹی کی دیواروں
میں بانس کی بنی ہوئی دو کھڑکیاں کھلی تھیں اور ان میں سے مکان کے پہلو کا منظر دکھائی
دے رہا تھا۔ کیلے کے درخت کے پاس کھڑی دو جواں سال تھائی عورتیں ہمیں دیکھ رہی
تھیں اور آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ان کے پاؤں کے پاس تین چار موٹی بطخیں ٹھمک
ٹھمک کر چل رہی تھیں۔ ایک صحت مند بچہ جس کا سر منڈا ہوا تھا۔ سائیکل کے ایک پرانے
ٹائر کو احاطے میں دائرے کی شکل میں چلا رہا تھا۔

مکھیا لان کون نے ہماری تواضع مقامی شربت سے کی۔ ہم نے احتیاطاً کاریگ سے
پوچھ لیا کہ اس میں نشہ وغیرہ تو نہیں۔ کاریگ نے بتایا کہ ایسا کچھ نہیں۔ دراصل ہم نے
دیہی علاقوں میں کئی طرح کے نشہ آور مشروب دیکھے تھے۔ ان میں سے ایک مشروب جو
ناریل کے پیڑ سے حاصل کیا جاتا تھا، شراب کے بہت قریب تھا۔ چند روز پہلے وانگ نامی
بستی میں ہمارے طبی وفد کے چند ارکان بشمول ڈاکٹر کامران اس مشکوک مشروب سے
متاثر ہو چکے تھے۔

مکھیا لان کون نے ہماری آمد کی غرض و غایت پوچھی۔ ہم نے وہی کچھ بتا دیا جو سوچ
رکھا تھا۔ یعنی کہ ہم ایک طبی وفد کے ساتھ یہاں آئے ہیں اور دیہی علاقوں کا دورہ کر رہے
ہیں۔ میں نے مکھیا کو بتایا کہ ہم قریبی علاقے Udon Thani میں بھی کام کرتے رہے

ہیں۔ چند روز پہلے بارشوں کے سبب ہمیں اپنا کام ادھورا چھوڑنا پڑا تھا۔ اب وفد کے کچھ
ارکان تو واپس جا چکے ہیں لیکن ہم ابھی یہیں ہیں موسم چونکہ بہتر ہو گیا ہے لہٰذا ہم دو چار
دن مزید لگا کر اپنا باقی کام نمٹانا چاہتے ہیں۔

ہماری وضاحتوں نے لان کون کو کافی حد تک مطمئن کر دیا۔ خوش قسمتی سے اسے یہ
بات معلوم تھی کہ کچھ روز پہلے تک Udon Thani کے علاقے میں ڈاکٹر لوگ موجود
رہے ہیں۔ اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کچھ کہا۔ ہمارے مترجم کاریگ نے
ترجمانی کرتے ہوئے بتایا۔ ”سردار کا کہنا ہے کہ پاس کے گاؤں میں اس کی چھوٹی بہن
اور بہنوئی رہتے ہیں۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے Udon Thani جا
کر ڈاکٹر لوگوں سے دوا لی ہے اور انہیں افاقہ ہوا ہے۔“

کاریگ کی انگریزی کافی ٹیڑھی میڑھی تھی۔ ہمیں ایک ایک بات کئی کئی بار پوچھنا پڑتی
تھی، پھر بھی کافی کچھ ادھورا رہ جاتا تھا۔ ہم سے بات کرتے ہوئے کاریگ کے ہاتھ
بہت تیزی سے چلتے تھے۔ وہ زبان کے ساتھ ساتھ اشاروں سے بھی سمجھانے کی کوشش کرتا
تھا۔ اس کی سانولی پیشانی پر ایک موٹی رگ ابھر آئی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ ”ترجمانی“
کرتے ہوئے اسے کافی ذہنی مشقت اٹھانا پڑ رہی ہے۔ ہماری گفتگو کے دوران میں ہی
دو مزید افراد وہاں آ بیٹھے۔ وہ مکھیا کے اہل خانہ میں سے ہی تھے۔ وہ بھی ہمیں عزت اور
احترام کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں مجھے یہ دھڑکا مسلسل لگا
رہا کہ چنگی سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ یوں میرا حلیہ بھی چار سال پہلے کے حلیے سے کافی
مختلف تھا۔ آج کل میرے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ بال پچھلی مرتبہ بالکل ہی
چھوٹے تھے لیکن اس مرتبہ لمبے تھے۔ اگر میں نظر وغیرہ کا چشمہ لگا لیتا تو شاید چنگی کے لیے
مجھے پہچاننا ہی دشوار ہو جاتا۔ بہر حال اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے تک خیریت ہی گزری۔ اس
دوران میں لان کون نے مہمان نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے گھر کے بالکل ساتھ ہی
دو کمروں کے ایک گھر میں ہماری رہائش کا انتظام کر دیا۔ یہ گھر بند پڑا تھا۔ اس کی صفائی
ستھرائی کرا کے ہمارا سامان حفاظت سے وہاں رکھ دیا گیا۔ مکھیا لان کون نے دانش مندی کا
ثبوت دیتے ہوئے ہماری خدمت کا کام کاریگ کو سونپ دیا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ وہ تھوڑی
بہت انگریزی جانتا تھا۔ بہر حال لان کون نے ہمیں کاریگ کے ذریعے بتایا کہ بستی میں
دو چار اور لوگ بھی ایسے ہیں جو ہم سے انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے

آپ میں سوچا کہ ان انگریزی دانوں میں سے ایک تو شاید چنکی ہی ہو۔ کاریگ اور لان کون وغیرہ سے اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے اپنا پورا نام شاداب اختر نہیں بتایا تھا بلکہ صرف "اختر" بتایا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر شاداب کے نام سے چنکی یا سون وغیرہ کو میرے بارے میں پیشگی علم ہو جائے۔

لکشون گاؤں میں پہلی رات تو خیریت سے ہی گزری۔ ہمارے پاس مچھر کو بھگانے والا تیل موجود تھا جو دیہی علاقوں میں ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو چکا تھا۔ لکشون میں بھی یہ بہت مفید ثابت ہوا ورنہ یہاں ایسے مچھر موجود تھے جو ہیلی کاپٹر جیسی آواز نکالتے ہوئے حملہ آور ہوتے تھے۔ مکان میں میزبانوں نے کوئی ہلکی سی خوشبو بھی سلگا دی تھی۔ بید کی چارپائیوں پر ہماری رات سکون سے ہی گزری۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سفر کی تھکاوٹ کے سبب ہمیں اپنی سدھ بدھ ہی نہیں رہی تھی۔ اگلے روز ہم نے بستی کے اکلوتے کلینک کا جائزہ لیا۔ یہاں ایک کمپاؤنڈر لوگوں کا علاج معالجہ کرتا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔ سوجی سوجی آنکھوں والا خوب گورا چٹا شخص تھا۔ اس کا نام تو طویل تھا لیکن اہل بستی اسے لی کہتے تھے۔ شروع میں تو لی ہمیں اچھا شخص لگا، تاہم اس کے پاس آدھ پون گھنٹہ بیٹھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ اپنے فرائض ٹھیک طور سے انجام نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایلو پیتھک دوائیں کم ہی استعمال کرتا تھا۔ ایلو پیتھک کے نام پر وہ دیسی دوائیں، جڑی بوٹیاں اور ہومیو پیتھک دوائیں بھی مریضوں کو استعمال کرا دیتا تھا۔ بعض اوقات وہ ان دواؤں کو مکس بھی کرتا تھا۔ ایلو پیتھی کے حوالے سے بھی اس کا نالج واجبی سا اور کافی پرانا تھا۔

وہ کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ اسے نارمل کرنے کے لیے ہم اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ وہ انگریزی بول سکتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "لی! تمہارے علاوہ یہاں اور کون کون انگریزی جانتا ہے۔"

وہ بولا۔ "چنگزا بان کاریگ...... وانگ کارشیاؤ کی بیوی پیاؤ اور وہ حرامی ٹیکسی ڈرائیور چنکی...... لیکن وہ تو کافی مہینوں سے گاؤں میں نہیں ہے۔"

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ہمیں چنکی سے "شرف ملاقات" حاصل ہونے کا ڈر تھا اور لی کہہ رہا تھا کہ چنکی بستی میں ہی نہیں ہے۔

میں نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ چنکی کون ہے محترم؟"

لی نے اپنے ہونٹوں کے لعاب دار گوشوں کو کاٹن کے رومال سے صاف کیا اور بولا۔ "ہر بستی میں کوئی نہ کوئی بدروح ہوتی ہے۔ چنکی یہاں کی بدروح ہے۔ عورت بازی، شراب نوشی اور لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے اس کا دماغ کھسک گیا ہے۔ بس مارا مارا پھر رہا ہے۔"

میں نے لی کو مزید کریدنے کے لیے کہا۔ "چنگزا بان کاریگ نے بھی اس بارے میں تھوڑی سی بات کی تھی۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کی بیوی بھی شاید بیمار تھی۔"

"بیمار نہیں تھی۔" لی نے زور سے سر ہلایا۔ "اسے اسی بدبخت نے بیمار کیا تھا۔ وہ اسی بستی کی سب سے ہنس مکھ اور چنچل کنواری تھی۔ وہ ہنستی تھی تو اس کے ساتھ ہر شے ہنس اٹھتی تھی۔ اتنی امنگ ترنگ اور شوخی میں نے زندگی میں کسی دوشیزہ کے اندر نہیں دیکھی۔ وہ ایسی تھی ڈاکٹر! کہ مردہ دل شخص بھی اسے دیکھتا تو کھل اٹھتا تھا۔ یہ اس بے چاری کی بدقسمتی کہ وہ چنکی جیسے خرانٹ کے پلے بندھ گئی۔ چنکی نے اس کے ساتھ بہت برا کیا...... بہت ہی برا کیا۔ وہ آدمی کے بھیس میں شیطان تھا۔ وہ اس گاؤں کے سب سے خوبصورت پھول کو ٹہنی سے نوچ کر شہر لے گیا اور اس کی پتی پتی بکھیر دی۔"

"لیکن محترم! یہ سب ہوا کیسے؟" حمزہ نے پوچھا۔

لی نے ایک گہری سانس لی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ہم کو اس بارے میں بتانے جا رہا ہے لیکن اس سے پہلے کہ اس کے سرخ سرخ لعاب زدہ ہونٹ حرکت میں آتے، ایک مریض اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر تھائی تھا جس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ معلوم ہوا کہ اسے ہیضے کی شکایت ہے۔ ان علاقوں میں ناقص پانی اور برساتی موسم کی وجہ سے ہیضے کی تکلیف اکثر دیکھنے میں آتی تھی۔ مریض میں ڈی ہائیڈریشن کے آثار نہیں تھے۔ میں نے اسے پین کلر کے علاوہ "فیوریسن سسپنشن" دی اور دیگر ہدایات دینے کے علاوہ پرہیز وغیرہ بتایا۔

اسی دوران میں ایک جواں سال عورت اندر داخل ہو گئی۔ وہ کافی خوبصورت تھی۔ اس کا لباس اور رنگ ڈھنگ مقامی عورتوں سے قدرے مختلف نظر آتا تھا۔ رنگین لنگی کی بجائے اس نے مقامی انداز کی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ جوڑے میں پھول تھے۔ ساڑھی کا زرد رنگ اس کی گندمی رنگت پر جچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ضعیف عورت تھی۔ جواں سال عورت اسے سہارا دے کر لا رہی تھی کمپاؤنڈر لی کے ذریعے معلوم ہوا کہ بوڑھی عورت

جواں سال عورت کی ساس ہے۔ وہ کافی دنوں سے بیمار ہے۔

لی نے ایک اور بات بھی بتائی۔ وہ جواں سال عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اتفاقاً ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ بستی میں یہ واحد عورت ہے جو تھوڑی بہت انگریزی سمجھ سکتی ہے۔ اس کا نام پیاؤ ہے۔ یہ اپنے گاؤں میں کسی استاد سے ستار بجانا سیکھتی رہی ہے۔ وہ استاد سری لنکن ہے مگر اس کی بیوی انگریز ہے، استاد کے بیوی بچے انگریزی بولتے تھے لہٰذا اسے بھی انگریزی کی شناخت ہو گئی۔

میں نے جواں سال عورت پیاؤ سے براہ راست بات کی اور اس کی عمر رسیدہ ساس کا احوال دریافت کیا۔

پیاؤ نے شکستہ انگلش میں جو کچھ بتایا اس سے معلوم ہوا کہ ضعیف عورت کو تین چار ہفتے ٹائیفائیڈ کی شکایت رہی ہے۔ یہ ٹائیفائیڈ غالباً خود ہی ٹھیک ہو گیا تھا لیکن کمپاؤنڈر لی اب بھی مریضہ کو نہایت کڑوی کسیلی دوائیں پلا رہا تھا۔ جس کے سبب مریضہ کا معدہ درہم برہم تھا اور وہ خاصی کمزور بھی ہو گئی تھی اس کے علاوہ وہ اسے خوامخواہ اسپرین بھی دیتا رہتا تھا۔ ہم نے شائستہ انداز میں لی سے ''درخواست'' کی اور مریضہ کی یہ دوائیں بند کرا دیں۔ ہم نے اسے کچھ وٹامنز وغیرہ دیئے اور بھوک بڑھانے کے لیے موسیگار نامی سیرپ بھی اپنے پاس سے دیا۔

جواں سال عورت بہت خوش نظر آتی تھی۔ وہ مقامی انداز میں بار بار جھک کر ہمارا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ اس کی ساس بہری تھی، اگر نہ بھی ہوتی تو اسے ہماری گفتگو کہاں سمجھ میں آنا تھی۔ تاہم اس کی گدلی آنکھوں میں بھی تشکر کے آثار واضح تھے۔

ساس اور بہو کے جانے کے بعد ہمیں تخلیہ ملا اور گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہونے کا امکان پیدا ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ مجھے اور حمزہ کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ لکشون گاؤں پہنچنے کے چند گھنٹے بعد ہی ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ سون کے بارے میں اہم نوعیت کی معلومات حاصل کر سکیں۔ لی نے اپنے ہونٹوں سے لعاب پونچھتے ہوئے کہا۔ ''سون کا تعلق غریب فیملی سے تھا۔ اس کی چار بہنیں تھیں، دو بیاہی ہوئی تھیں، دو ابھی تک بن بیاہی بیٹھی تھیں۔ سون سب سے چھوٹی تھی اور بہت شوخ بھی یہ لوگ ساتھ والے گاؤں روتھی میں رہتے تھے۔ سون کا باپ دمے کا مریض تھا۔ والدہ بید کی ٹوکریاں وغیرہ بنا کر کنبے کا پیٹ پالتی تھی۔ سون کی بڑی بہنیں بھی والدہ کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ سون سب سے لاڈلی تھی

اور سب سے خوش شکل بھی۔ وہ سارے گھر کی آنکھ کا تارا تھی۔ وہ سب اپنی اپنی ضروریات میں کٹوتی کر کے بھی سون کو اچھا کھلاتے اور اچھا پہناتے تھے۔ وہ پندرہ سولہ برس کی ہو چکی تھی لیکن بچوں کی طرح چھلانگیں لگاتی پھرتی تھی اور گڈے گڑیا کے کھیل کھیلتی تھی۔ انہی دنوں چنکی بنکاک سے یہاں گاؤں آیا تو اس کے والدین نے اس کی شادی کا سوچا۔ چنکی گاؤں کا پہلا شخص تھا جو شہر تک پہنچا تھا اور وہاں جا کر کما رہا تھا۔ گاؤں کے غریب مسکین لوگوں میں چنکی کو کافی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ چنکی کا والد مچھلی پکڑنے روتھی گاؤں میں آتا جاتا رہتا تھا۔ وہاں اس نے کئی بار سون کو دیکھا تھا۔ جب چنکی کے رشتے کی بات چلی تو چنکی کے باپ نے فوراً سون کا ذکر کر دیا۔ چنکی کا باپ اپنی بڑی بہو کو لے کر سون کو دیکھنے روتھی گاؤں گیا۔ ان دونوں کو سون بہت پسند آئی مگر سون کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ پہلے اپنی بڑی بیٹیوں کی شادی کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ بڑی بیٹیوں میں سے کوئی چنکی کے لیے پسند کر لیں...... مگر چنکی کے گھر والے اور خود چنکی بھی سون کے لیے اڑ گیا۔ حالانکہ چنکی عمر میں سون سے بارہ تیرہ سال بڑا تھا۔ سون سولہ سال کی تھی جبکہ چنکی تیس کے قریب پہنچ رہا تھا۔ بہر حال سون کے والدین اس لالچ میں آ گئے کہ ان کی لاڈلی بیٹی، پیٹ بھر کر کھائے گی اور اچھا پہنے گی۔ چنکی کی شکل میں انہیں ایک ایسا داماد مل جائے گا جو ان کی لاڈلی بیٹی کو جان سے لگا کر رکھے گا۔ سون کی شادی پر چٹ منگنی پٹ بیاہ والی مثال صادق آتی تھی۔ وہ بے چاری تو ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس ''کھیلتی کودتی'' کو پکڑ کر عروسی جوڑا پہنایا گیا تھا اور سہاگ کی سیج پر بٹھا دیا گیا تھا لیکن سہاگ کی سیج پر بیٹھنے کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اسے زندہ درگور کر دینے والا تھا۔''

روداد سناتے سناتے لی نے قہوے کی دو پیالیاں ہمارے ہاتھوں میں تھمائیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''سون سہاگن ہو کر بھی کنواری رہی۔ اس کا شوہر دو ہفتے تک اس کے لیے اجنبی رہا۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ بنکاک لے گیا جہاں وہ ٹیکسی چلاتا تھا۔ وہاں اس نے کرایے کا ایک اپارٹمنٹ بھی لے رکھا تھا۔ وہ بہت بدبخت شخص تھا۔ اس کی حیثیت بنکاک میں عورتوں کے دلال کی سی تھی۔ اس نے کسی امیر کبیر گاہک سے کم سن کنواری لڑکی کا سودا کر رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بات آپ لوگوں کی سمجھ میں آ ہی گئی ہو گی...... بنکاک پہنچ کر سون ایک بار پھر دلہن بنی اور اسے چند راتوں کے لیے فروخت کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ چنکی کے چنگل میں جکڑی ہوئی سون روز بکتی رہی، روز لٹتی رہی۔

ایک دو بار اس نے شہر سے بھاگ کر واپس آنے کی کوشش بھی کی لیکن عیار و سفاک چنکی نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ دھیرے دھیرے وہ اسی رنگ میں ڈھلنے لگی جس میں چنکی اسے ڈھالنا چاہتا تھا۔ وہ پنجرے میں قید پرندے کی طرح پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ چنکی اس پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔ اس دوران میں چنکی ایک دو بار اسے یہاں بستی میں بھی لے آیا، لیکن وہ ہر وقت سائے کی طرح سون کے ساتھ رہتا تھا اور بہت جلد ہی اسے بنکاک واپس لے جاتا تھا۔ اس نے نہ جانے سون کو کس کس طرح دھمکایا تھا کہ وہ اپنے والدین کے سامنے زبان نہیں کھولتی تھی۔ نہ ہی کسی سکھی سہیلی کو بتاتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ سون کی خوشی پر سنجیدگی کا گہرا سایہ دیکھ کر عام لوگ یہی سمجھتے تھے کہ پاؤں بھاری ہونے کی وجہ سے وہ بیمار ہے۔ یا اس قسم کی کوئی اور بات ہے۔

بتدریج سون کا گاؤں آنا ختم ہو گیا۔ اس دوران سون کا بیمار والد بھی راہی ملک عدم ہو گیا۔ اس واقعے کے بعد سون کا گاؤں سے تعلق اور بھی کم ہو گیا۔ لوگ چہ میگوئیاں کرتے تھے کہ سون چنکی کے ساتھ خوش نہیں ہے اور چنکی بنکاک میں سون کو گناہ پر مجبور کرتا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن اتنی ہمت اور طاقت کسی میں نہیں تھی کہ سون کے حالات کا کھوج لگاتا اور اس کی مدد کرتا...... چنکی کے شکنجے میں ہونے کے باوجود سون اپنے طور پر حالات سے لڑنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ میری معلومات کے مطابق اس نے بنکاک میں نرسنگ کا کورس بھی کیا۔ شاید اس کا خیال ہو گا کہ وہ کسی طور باعزت روزی کمانے کے قابل ہو سکے گی۔ مگر چنکی کو یہ سب کیسے قبول ہو سکتا تھا۔ اس نے سون کی واپسی کا ہر راستہ بزور بازو بند کر دیا تھا۔ وہ بہت ہتھ چھٹ اور غصیلا شخص تھا۔ اس کے دوست یار بھی اسی کی طرح چھٹے ہوئے بدمعاش تھے، ان میں ایک اکیلی لڑکی کی بھلا کیا حیثیت تھی۔ بے پناہ ذہنی اور جسمانی دباؤ کے سبب سون بیمار پڑ گئی۔ وہ قریباً ایک برس بیمار رہی۔ اس کا بخار بگڑ گیا تھا۔ اسی دوران چنکی نے اس کا ابارشن کرایا تھا جس کے سبب وہ مزید بیمار ہو گئی تھی۔ ایک سال کی تکلیف کاٹنے کے بعد سون صحت مند ہوئی تو وہ بدل چکی تھی۔ اس نے خود کو بنکاک کے رنگ میں ہی رنگنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ وہی کچھ بن گئی تھی جو چنکی چاہتا تھا۔ بلکہ اس سے بھی آگے نکل گئی۔ اس کے سارے طور اطوار ہی بدل گئے تھے۔ انہی دنوں ایک مرتبہ کاربنک (چنکڑا بان) سون کی ایک تصویر لے کر آیا جو بنکاک کے ایک رسالے میں چھپی تھی۔ وہ بہت تھوڑا لباس پہنے، رنگدار چھتری لیے ساحل پر کھڑی تھی۔ گاؤں والے اور

سون کے میکے والے یہ تصویر دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے۔ سون کی ماں اور بہنیں رو رو کر نیم دیوانی ہو گئی تھیں۔ وہ سب بلکہ پورا "روتھی گاؤں" ہی اس چنچل گڑیا کا دیوانہ ہوا کرتا تھا۔ اپنی پیاری سی گڑیا کی یہ تباہ حالی انہیں خون کے آنسو رلا گئی۔"

چند لمحے توقف کر کے لی نے کمرے کی کھڑکیاں وغیرہ بند کیں۔ تیز ہوا چلنے لگی تھی اور بادل گھر گھر کر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے پستہ قد، ہیلپر سے کہہ کر قہوہ منگوایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اسی طرح سال ڈیڑھ سال گزر گیا پھر ایک روز ہمیں یہ دل سوز خبر ملی کہ سون بنکاک میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے جم اسٹونز کے ایک بڑے تاجر کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی عزت لوٹنے کا الزام لگا کر اس نے تاجر سے رقم اینٹھنا چاہی تھی...... پتا نہیں کہ اس الزام میں حقیقت کتنی تھی اور فسانہ کتنا تھا۔ یہاں کے اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ سون چنکی کے چنگل میں ہے اور وہی اس سے سب کچھ کروا رہا ہے۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے خیال میں سون اب بالکل بدل چکی تھی اور عیاشیوں میں کھو گئی تھی۔ بہر حال جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں...... یہاں کے لوگ اب بھی سون کو یاد کرتے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں، چھوٹی چھوٹی یادیں ہر جگہ موجود تھیں...... اس کی خوبصورت شوخی، اس کی بھولی بسری شرارتیں لوگوں کی گفتگو کا موضوع بنتی تھیں۔ اس کی سہیلیاں جب اکٹھی بیٹھتی تھیں تو اس کا نام لے کر ٹھنڈی آہیں بھرتی تھیں...... کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا...... پھر ایک شام جب بارش کے بعد خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ پتا چلا کہ چنکی بستی میں آیا ہے...... اس کے ساتھ سون بھی ہے۔ چنکی نے قریباً ایک سال بعد گاؤں میں شکل دکھائی تھی۔ سون کو اس سے بھی زیادہ وقت ہو چکا تھا۔

چنکی کی آمد لوگوں کو جہاں حیرت میں مبتلا کر رہی تھی وہاں ایک طرح کا خوف بھی ان کے ذہنوں میں سوار تھا۔ چنکی کی سرکشی ایک اڑیل گھوڑے کی طرح تھی۔ اور تو اور گاؤں کا سردار لان کون بھی اس سے دبتا تھا۔ اور یقیناً اب بھی دبتا ہے۔ جن دنوں سون کی تصویر گاؤں میں آئی تھی۔ ان دنوں چنکی نے بھی ایک چکر گاؤں میں لگایا تھا۔ سردار کے بڑے بیٹے کامے نے ڈرتے ڈرتے چنکی سے اس تصویر کے بارے میں بات کی تھی۔ نتیجے میں چنکی اور کامے میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ چنکی نے مکا مار کر کامے کی ناک کی ہڈی توڑ دی تھی اور اس کے ایک دوست کو بھی مارا تھا۔ بعد میں سردار کو چنکی کو غیر مشروط طور پر معاف کرنا

پڑا تھا۔ چنکی جب بھی گاؤں آتا تھا کوئی نہ کوئی پھڈا ضرور کھڑا کر دیتا تھا۔ شاید اسی طرح وہ گاؤں والوں پر اپنی دہشت برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ شاید میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ چنکی لڑکپن سے باکسنگ کرتا رہا ہے اور اس نے پہلے پہل کئی مقابلوں میں بھی حصہ لیا تھا۔"

ایک لمحہ خاموش رہ کر لی نے اپنے خیالات مجتمع کیے اور بولا۔ "ہاں تو میں اس شام کی بات کر رہا تھا جب چنکی اور سون اچانک گاؤں میں نمودار ہوئے تھے۔ سون پہلے سے بہت دبلی ہو چکی تھی اس کے بال بڑے بھونڈے طریقے سے کٹے ہوئے تھے۔ جیل میں اس نے جو سختیاں جھیلی تھیں ان کے آثار اس کے چہرے اور جسم پر بہت واضح تھے...... وہ جیل سے رہا ہو چکی تھی مگر چنکی کی قید سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ چنکی کو اس پر پورا کنٹرول حاصل تھا۔ وہ دونوں اس سامنے والے مکان میں رہنے لگے۔" لی نے ادھ کھلے دروازے سے ایک جھونپڑے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی چھت سرخ تھی اور وہ گاؤں کے پگوڈا کے ساتھ ہی واقع تھا۔

لی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "گاؤں میں تو سون کے ساتھ چنکی کا سلوک اچھا ہی تھا۔ وہ دونوں اسی طرح رہ رہے تھے جس طرح عام میاں بیوی رہتے ہیں۔ لیکن سچائی دیر تک چھپی نہیں رہی۔ جلد ہی لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ چنکی، سون پر بہت ظلم و ستم کرتا رہا ہے۔ سون کوئی تین ماہ پہلے جیل سے رہا ہو گئی تھی، چنکی نے اسے ڈھائی تین ماہ تک Mae Ping کے ایک گاؤں میں اپنے دوست کے گھر رکھا تھا۔ وہاں وہ اس کے ساتھ بہت مار پیٹ کرتا رہا ہے اور اسے مجبور کرتا رہا ہے کہ وہ جسم فروشی کے پیشے کی طرف لوٹ آئے۔ وہ آس پاس کے علاقوں سے اس کے لیے لینڈ لارڈ گاہک بھی لاتا رہا ہے لیکن نئے سرے سے "پرانا کاروبار" شروع کرنے کی کوششیں ناکام ہوتی رہیں...... ایک واقف حال شخص سے معلوم ہوا کہ چنکی، سون کو کئی کئی دن بھوکا پیاسا رکھتا تھا، اسے اندھیرے کمرے میں سانپ وغیرہ کے ساتھ بند کر دیتا تھا۔ اسے ایک خاص قسم کے آلے سے مارتا تھا جسے عرف عام میں "ربڑ" کہا جاتا ہے۔ ربڑ کی مار سے جسم پر نشان نہیں پڑتا لیکن انتہا کی اذیت محسوس ہوتی ہے۔ جب ذہنی اور جسمانی تشدد سے سون کی حالت غیر ہو گئی اور بدبخت چنکی کو خطرہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں حواس ہی نہ کھو بیٹھے تو چنکی کو اپنا رویہ نرم کرنا پڑا اور وہ سون کی پرزور خواہش پر اسے یہاں لکشون گاؤں لے آیا۔

یہاں وہ لوگ بظاہر سکون سے ہی رہے۔ سون کی حالت کافی اچھی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی

جیٹھانی کے ساتھ مجھ سے دوا وغیرہ بھی لینے آتی تھی۔ ایک نرس کی حیثیت سے اسے خود بھی دواؤں کی سمجھ بوجھ تھی۔"

بات کرتے کرتے عمر رسیدہ لی اچانک چونک گیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "اوہ! میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جو عورت پیاؤ اپنی ساس کے ساتھ دوا لینے آئی تھی، وہی سون کی جیٹھانی ہے۔"

"یعنی اس کے ساتھ جو بوڑھی عورت تھی۔ وہ سون کی بھی ساس ہے۔" میں نے کہا۔

بوڑھے لی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اور یہی چنکی کی ماں ہے۔" وہ بولا پھر چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہنے لگا۔ "ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟"

حمزہ نے کہا۔ "آپ فرما رہے تھے کہ یہاں آنے کے چند ماہ بعد سون کافی بہتر ہو گئی تھی اور وہ اپنی جیٹھانی پیاؤ کے ہمراہ آپ سے دوا لینے آتی تھی۔"

"ہاں...... ہاں......" لی نے تائید کی اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "سون کو تھوڑا تھوڑا مذہب سے لگاؤ ہونے لگا تھا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو۔ وہ جس گھر میں رہتی تھی اس سے کچھ ہی فاصلے پر پگوڈا ہے۔ جب پگوڈا میں تقریر ہوتی تھی یا سوتر وغیرہ پڑھے جاتے تھے تو سون بڑے دھیان سے سنتی تھی۔ وہ کبھی کبھی دو راہباؤں کے ساتھ سنگھ کی مصروفیات دیکھنے بھی چلی جاتی تھی۔ (سنگھ...... بدھ مت میں راہبوں یا فقیروں کی جماعت کو کہا جاتا ہے) ہمارے گاؤں کے سنگھ کے گرو کا نام کشپال ہے...... وہ کبھی کبھی پردے کے پیچھے سے عورتوں...... کو وعظ کرتا ہے۔ سون یہ واعظ سننے کے لیے باقاعدگی سے جانے لگی تھی۔ اس کے مزاج میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ وہ اکثر گیروے کپڑے پہن لیتی تھی۔ میں نے ایک دو بار اسے ننگے پاؤں بھی دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے گہری سنجیدگی جھلکنے لگتی تھی۔ ایک ایسی سنجیدگی جو اس کے ماضی کی شوخیوں سے بالکل مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ وہ جب بھی کبھی میرے پاس آتی تھی، پیاؤ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ دونوں میں دیورانی جیٹھانی کا رشتہ تھا لیکن پھر بھی آپس میں ان کا سلوک تھا اور انہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک دوجے سے پرخلوص محبت رکھتی ہیں۔ سون جب بھی آتی تھی، میرے ساتھ بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔ وہ مجھے بڑے پیار سے انکل جی کہتی تھی...... یہ ڈیڑھ دو سال پرانی باتیں ہیں لیکن لگتا ہے جیسے وہ ابھی اس سامنے والی کرسی سے اٹھ کر گئی ہے اور اس کی دلکش آواز کی گونج ابھی کمرے میں باقی ہے...... اسے لکشون گاؤں آئے ہوئے آٹھ دس ماہ

ہو چکے تھے۔ اس کے رخساروں کی ہڈیوں پر تھوڑا بہت ماس آ گیا تھا اور اس کے بھونڈے طریقے سے کٹے ہوئے بال بھی اب لمبے ہو گئے تھے۔ وہ بدھ کی تعلیمات میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتی تھی...... سوتروں یعنی مذہبی دعاؤں کے بارے میں اسے بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا...... پھر ایک دن میں نے اسے پگوڈا میں ہونے والے ایک تہوار میں دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہ گیروے کپڑوں میں تھی۔ اور گلے میں پھولوں کے ہار تھے۔ وہ دیکھنے میں ایک خوبصورت راہبہ ہی لگ رہی تھی...... اس دن مجھے اندازہ ہوا تھا کہ گاؤں میں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرنے والی چنچل سون اب دوبارہ کبھی نظر نہیں آئے گی...... وہ کسی اور ہی سانچے میں ڈھلتی چلی جا رہی ہے۔''

''اس تبدیلی کے حوالے سے چنکی کا رویہ کیا تھا؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''وہ ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ نشے میں وہ سون سمیت ہر ایک کو گالیاں دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ حالانکہ ٹیکسی بیچ کر اس نے جو رقم حاصل کی تھی وہ ساری کی ساری شراب اور دوسری عیاشیوں میں اڑا دی تھی۔ اکثر نشے کی حالت میں اس کا ہاتھ بھی سون پر اٹھ جایا کرتا تھا۔ وہ چنکی کے اس رویے کی عادی ہو چکی تھی۔ عادی نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ کون تھا جو اس کی دادرسی کرتا۔ بھائی کوئی نہیں تھا...... باپ فوت ہو چکا تھا۔ جو دو چار رشتے دار تھے وہ چنکی جیسے خبیث کے منہ لگنا نہیں چاہتے تھے...... تین چار ماہ اسی طرح گزر گئے...... پھر ایک روز صبح سویرے گاؤں میں ایک عجیب خبر گردش کرنے لگی۔ معلوم ہوا کہ سون کل شام سے گاؤں میں نہیں ہے۔ چنکی اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ لوگ مختلف چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا...... کوئی کچھ۔''

''کیا کہہ رہے تھے لوگ؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''بس جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ کسی کا خیال تھا کہ چنکی نے اسے خود غائب کیا ہے اور اب گاؤں والوں کے سامنے انجان بن رہا ہے۔ کسی کا اندازہ تھا کہ سون کسی سے پیار کرتی تھی۔ وہ چپکے چپکے اس کا انتظار کرتی تھی۔ وہ آ گیا اور وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ کچھ کا کہنا تھا کہ سون اپنے جابر شوہر چنکی کے ہاتھوں قتل ہو چکی ہے۔ بہر حال ایک دو ہفتے بعد یہ ساری افواہیں دم توڑ گئیں۔ پتا چلا کہ سون یہاں سے قریباً بیس میل دور ''بڑے پگوڈا'' میں ہے۔''

لی نے ایک لمحہ رک کر ہماری طرف دیکھا اور بولا۔ ''بڑے پگوڈا...... کا لفظ تمہارے لیے اجنبی ہے...... یہ پگوڈا ''چاتو چانگ لے'' کے علاقے میں ہے اور جنگل میں گھرا ہوا ہے۔ وہاں کے مہان گرو کا نام ایلش ہے۔ گرو ایلش کبھی کبھی کسی تقریب کے موقعے پر ہمارے گاؤں کے پگوڈا میں بھی آتے تھے۔ یہیں پر سون کی ان سے ملاقات ہوئی اور یہیں پر اس نے ان کا وعظ سنا۔ سون کی ایک سہیلی کا کہنا ہے کہ وہ گرو ایلش کی باتوں سے بہت متاثر نظر آتی تھی اور اس انتظار میں رہتی تھی کہ گرو ان کے گاؤں میں تشریف لائیں جس دن سون گاؤں سے غائب ہوئی اس سے صرف تین روز پہلے ہمارے گاؤں کے پگوڈا میں ایک مذہبی تقریب تھی۔ جس میں اردگرد کے دیہات سے بھی بھکشو اور ان کے عقیدت مند آئے ہوئے تھے۔ اس تقریب میں گرو ایلش بھی آئے تھے۔ سون نے نہ صرف ان کا وعظ سنا تھا۔ بلکہ پردے کے پیچھے سے ان کے ساتھ بات بھی کی تھی۔

جب چنکی کو پتا چلا کہ سون اس کے چنگل سے نکل کر بڑے پگوڈا میں گرو ایلش کے پاس جا پہنچی ہے تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ وہ بہت بھنایا ہوا ''چاتو چانگ لے'' پہنچا۔ سون وہاں مٹھ میں ٹھہری ہوئی تھی (مٹھ کی حیثیت بدھ مت کے طلبہ کے ہاسٹل کی سی ہوتی ہے) چنکی نے حسب عادت مٹھ کے نگران سے جھگڑا کیا اور اس سے کہا کہ وہ ہر صورت سون سے ملنا چاہتا ہے۔ مٹھ کے نگران نے اسے ٹکا سا جواب دیا۔ چنکی بہت چیخا چلایا لیکن اس کی ایک نہیں چلی۔ گرو ایلش ایک بارسوخ شخص کا نام ہے۔ کئی بڑے بڑے لوگ اس کے عقیدت مند ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ مٹھ میں موجود کسی شخص کو اس کی مرضی کے بغیر وہاں سے لے جا سکے۔ چنکی بھی تین چار روز دھکے کھانے کے بعد ناکام واپس آ گیا......''

لی نے ایک گہری سانس لے کر ادھ کھلے دروازے سے باہر دیکھا۔ آسمان سے چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ جنگل میں ہونے والی دھواں دھار بارش نے سماں باندھ دیا تھا۔ پانی کی بوچھاڑیں پتوں سے ٹکرا کر ایسی آواز پیدا کرتی تھیں جو سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ لی نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''سچ پوچھو تو چنکی کے ناکام واپس لوٹنے کی وجہ سے کئی لوگوں نے سکھ کا سانس بھی لیا۔ انہوں نے سوچا چلو جو کچھ بھی ہے لیکن یہ اچھا ہوا کہ سون کی جان چنکی سے چھوٹ گئی۔ بہت سے لوگوں کو اس بات کا دکھ بھی تھا کہ سون ہمیشہ کے لیے ان سے دور چلی گئی ہے۔ یہ بستی، یہ کھیت یہ کھلیان اب کبھی اس ہنستی کھیلتی شوخ سون کو نہیں دیکھ سکیں گے۔ جس کی یادیں قدم قدم پر بکھری ہوئی ہیں اور یہ حقیقت

بھی ہے میرے ڈاکٹر دوستو! سون بہت دور چلی گئی ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ اس دنیا میں ہوتے ہوئے بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ اور یہ صورتحال صرف سون کے ساتھ ہی نہیں ہے۔ جو شخص بھی گیروے کپڑے پہن کر...... تین ماسن اور دس احکام مان کر سنگھ میں داخل ہو جاتا ہے، وہ عام لوگوں سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ اس کی پہلی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اس زندگی کی راکھ میں سے ایک نیا شخص نمودار ہوتا ہے۔ وہ صرف بھکشو ہوتا ہے۔ وہ صرف بھکشو ہوتا ہے۔'' لی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور سینے میں درد کی ایک تند و تیز لہر دوڑنے لگی تھی۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے کوئی اپنا اچانک مجھ سے ہاتھ چھڑا کر بہت دور چلا گیا ہے...... سون کی...... ساری روداد میں نے بے چینی کے عالم میں سنی تھی لیکن روداد کے آخری حصے نے مجھے زیادہ ہی بے چین کر دیا تھا۔

میں نے وارفتگی کے عالم میں کپاؤنڈر لی سے پوچھا۔ ''اب سون کہاں ہے؟''

''وہاں بڑے پگوڈا کے مٹھ میں۔ پچھلے مہینے اس کی والدہ اور بہن اس سے مل کر آئی تھیں۔ وہ بتاتی تھیں کہ وہ بالکل بدل چکی ہے۔ اسے اپنوں کی کوئی حرص ہی نہیں رہ گئی۔ اپنے گرو ایش کے کہنے پر وہ بے دلی سے ماں اور بہن سے ملی تھی۔ اس نے اشاروں کنایوں میں انہیں سمجھا دیا تھا کہ وہ لوگ اس سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔ اس طرح اس کے دھیان گیان میں فرق پڑتا ہے۔''

''چنکی اب کہاں ہے؟'' حمزہ نے دریافت کیا۔

''وہ کئی مہینے سے گاؤں میں نہیں ہے۔ اس کی ذہنی حالت منشیات کی وجہ سے بڑی خراب ہو چکی تھی۔ اول فول بکتا رہتا تھا۔ پتا نہیں کہاں دفع ہو گیا ہے۔

میں اور حمزہ قریباً آدھا گھنٹہ مزید کپاؤنڈر لی کے پاس بیٹھے۔ بارش میں ذرا سا وقفہ آیا تو ہم اپنی رہائش گاہ واپس پہنچ گئے۔

بارش ساری رات ہی ہوتی رہی۔ میں رات کے آخری پہر تک سو نہیں سکا...... چھوٹے سے برآمدے میں چکراتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ کمرے کے اندر ڈاکٹر حمزہ گہری نیند کا مزہ لے رہا تھا۔ جنگل میں سرلاٹے کے ساتھ برستی ہوئی بارش کا شور رہ رہ کر بجلی کا چمکنا اور بستی کے جھونپڑا نما مکانوں کا روشن ہونا۔ گیلی زمین پر کچے پکے ناریل گرنے کی آوازیں۔ پگوڈا کے پار سے گاہے گاہے کتے کی ابھرتی ہوئی آواز...... وہ سب کچھ آج

تک ذہن پر نقش ہے۔

اس رات مجھے یوں لگا جیسے میں خود یہاں نہیں آیا، کسی نادیدہ زنجیر سے باندھ کر یہاں لایا گیا ہوں اور اس زنجیر کی گرفت میرے جسم پر ہر لمحہ سخت ہوتی جا رہی ہے۔ سون کو دیکھنے اور اس کے احوال جاننے کی خواہش ذہن میں شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید میں تھائی لینڈ آیا ہی اس لیے تھا کہ مجھے سون کو ڈھونڈنا تھا...... کپاؤنڈر لی کا فقرہ بار بار سماعت سے ٹکراتا اور دل میں درد کی لہریں جاگ اٹھتی تھیں۔ لی نے کہا تھا۔ ''یہ صورتحال صرف سون کے ساتھ ہی نہیں ہے۔ جو شخص بھی گیروے کپڑے پہن کر...... تین ماسن اور دس احکام مان کر سنگھ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ عام طور پر لوگوں سے دور چلا جاتا ہے۔ اس کی پہلی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔''

سون کی پہلی زندگی کے خاتمے کا سوچ کر مایوسی...... کا سمندر میرے سینے میں ہلکورے لینے لگا تھا...... پھر میں خود سے سوال کرتا، یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے۔ یہ مایوسی اور دکھ کیسا؟ یہ سون کی زندگی ہے وہ اپنی زندگی کو جیسے چاہے گزار سکتی ہے اس کی زندگی سے تمہارا کیا واسطہ؟ تم اس سے پیار تو نہیں کرتے ہو نا...... تمہارا تعلق تو رخشی سے جڑ چکا ہے۔ اب وہی تمہارا مستقبل ہے اور وہی تمہارا پیار ہے۔ وہ لاہور میں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ تم اس کی زندگی کا محور ہو اور اس نے اپنی انگلی میں تمہارے نام کی انگوٹھی پہن رکھی ہے۔

پھر میں خود کو سمجھانے لگتا...... میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ میں سون سے پیار کرتا ہوں۔ یہ تو بس ایک وابستگی ہے اور ایسی وابستگی ''بیتے ہوئے ماہ و سال'' سے اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ میں بس اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنی یادوں کو اس کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ بس اسے ڈھونڈ کر اور دیکھ کر میں حمزہ کے ساتھ لوٹ جاؤں گا۔ سون کی زندگی کیوں بدلی؟ اس کی زندگی بدلنے میں میرا بھی کوئی کردار ہے یا نہیں؟ ان باتوں سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔

اگلے روز ہم ساتھ والی بستی ''روتھی'' میں پہنچے۔ دونوں بستیوں میں تھوڑا ہی فاصلہ تھا۔ بمشکل ایک کلومیٹر کا۔ یہ دوسری بستی سون کا ''میکا'' تھی۔ یہاں اس کی بوڑھی والدہ اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ میں اس کی والدہ سے ہی ملنا چاہتا تھا۔ یہ بستی لکشون گاؤں سے تھوڑی سی چھوٹی تھی۔ تاہم اس کا رنگ ڈھنگ...... وہی تھا۔ ویسے ہی جھونپڑا نما مکان، ویسے ہی سبزے کی بھرمار...... یہاں پانی کھینچنے کے لیے ایک بڑا ہینڈ پمپ بھی لگا ہوا تھا۔ اس ہینڈ پمپ کو دو تین بندے مل کر حرکت دیتے تھے۔

ہمیں سون کی والدہ کا گھر ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ کیونکہ کارینگ ہمارے ساتھ تھا۔ یہ صبح سویرے کا وقت تھا۔ ابھی بستی کے بیشتر لوگ سو رہے تھے۔ ایسا نہ ہوتا تو ہمارے گرد لوگوں کا ہجوم ہو جاتا۔ پہلے کارینگ اندر گیا۔ کچھ دیر میلے کچیلے گھر کے اندر سے مقامی زبان میں باتوں کی آواز آتی رہی پھر کارینگ باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ یہ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ گارے کی دیواریں ادھڑی ہوئی تھیں۔ ساری رات چھت ٹپکتی رہی تھی اس لیے کچی زمین پر تین چار جگہ ٹین کے ڈبے رکھے تھے۔ گھر کی ہر شے سے غربت ٹپکی پڑتی تھی۔ سون کی ماں کا نام فینگ تھا...... اس کی عمر ساٹھ سے کم نہیں تھی۔ بیماری اور غربت کے سبب وہ اور بھی عمر رسیدہ لگ رہی تھی...... تاہم کھنڈر بتاتے تھے کہ کسی وقت عمارت خوبصورت رہی ہوگی۔

وہ ہمیں تپاک اور قدرے خوف سے ملی۔ ہم نے کارینگ کے ذریعے اپنا تعارف ڈاکٹروں کی حیثیت سے کرایا اور بوڑھی فینگ کو بتایا کہ ہم یہاں دورے پر ہیں۔ فینگ کو مسلسل کھانسی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا معائنہ کیا۔ اور ایک دو دواؤں کے علاوہ چند مشورے بھی دیئے۔ میں نے فینگ کو بتایا کہ کل ہم نے کپاؤنڈر لی سے اس کی بیٹی سون کی کہانی سنی ہے اور ان لوگوں سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا ہے۔ ہماری یہ ساری گفتگو مترجم کارینگ کے ذریعے ہو رہی تھی۔

سون کے نام پر فینگ کی گدلی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ بولی۔ ''ڈاکٹر صاحب! سون میری سب سے لاڈلی بیٹی تھی۔ سب سے زیادہ دکھ بھی اسی کو ملے ہیں۔ اس جنجھی چنگی نے میری پھول سی بیٹی کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ وہ ہریالی کی طرح سندر اور بارش کے قطروں کی طرح چمکیلی تھی۔ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے کہ میں نے اس ہنستی کھیلتی...... گڑیوں کی شادیاں رچاتی سون کو چنگی جیسے پاگل بیل کے حوالے کر دیا......''

ایک دم وہ روتے روتے اپنی جگہ سے اٹھی اور بید کی ایک بڑی ٹوکری اٹھا لائی۔ اس ٹوکری کے اندر فینگ کی کچھ رنگی برنگی گڑیاں نکال کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھو...... یہ تھی سون...... گڑیاں بناتی تھی، گڑیاں سجاتی تھی...... اس کے کھیلنے کھانے کی عمر تھی۔ ہم نے اس روتی کرلاتی کو چوٹی سے پکڑ کر اس بردہ فروش کے حوالے کر دیا۔ لالچ میں آ گئے کہ وہ شہر میں کماتا ہے ہماری لاڈلی کو سکھی رکھے گا...... بہت سکھی رکھا اس نے...... بہت سکھی رکھا......'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''ڈاکٹر صاحب!

آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں۔ بیٹیوں کی قسمت ایسی کیوں ہوتی ہے۔ کیوں انہیں پال پوس کر اجنبی لوگوں کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔''

میں نے کارینگ کے ذریعے فینگ سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔ اس کی آنکھیں کچھ خشک ہوگئیں۔ وہ عجیب جذباتی کیفیت میں ہمیں سون کی اشیا دکھانے لگی۔ وہ اشیا جو چند سال پہلے سون اس گھر سے رخصت ہوتے ہوئے چھوڑ گئی تھی۔ ان میں اس کے اسکول کی کتابیں، اس کی گھسی ہوئی پنسلیں...... اس کے ربڑ...... اس کی چوڑیاں...... تصویریں...... کپڑے پر کاڑھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے پھول...... اس کی پالتو بلی کی گھنٹی...... اس کی بنائی ہوئی گڑیاں...... اور گڑیوں کے چھوٹے چھوٹے کپڑے...... گڑیوں کی اس کولیکشن میں تین چار گڈے بھی تھے۔ وہ بھی خوب سجے سنورے تھے۔ ان کے لباس مختلف تھے لیکن ان کی شکل ایک جیسی ہی دکھائی دیتی تھی۔

حمزہ نے کہا۔ ''سنا ہے آنٹی جی کہ سون اب پگوڈا میں ہے اور وہیں رہتی ہے۔''

''ہاں بیٹا! وہ بس اور کی اور ہو گئی ہے۔ زندگی کے دکھوں نے اسے اتنا ستایا ہے کہ وہ اب سون ہی نہیں رہی ہے...... ہم تو اسے واپس آنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس طرح گناہگار ہوتے ہیں۔ اور کہیں گے بھی تو وہ کون سا آ جائے گی۔ اس نے تو اب آگے ہی آگے جانا ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ شاید بدھا نے ٹھیک ہی کیا ہے۔ کچھ بھی ہے، سنگھ میں جا کر وہ زندہ تو ہے نا، اس شیطان چنگی کے ہاتھوں مری تو نہیں ہے۔''

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کارینگ نے باہر جا کر دیکھا اور پھر ایک دم اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ یہی کیفیت سون کی والدہ فینگ کی بھی ہوئی۔ زعفرانی رنگ کے کپڑوں والا ایک شخص اندر آیا اور اس نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ دروازہ کھلا تو ایک صحت مند راہب اندر آ گیا۔ اس نے گیرو لباس پہن رکھا تھا۔ اس لباس میں اس کا ایک کندھا ننگا تھا۔ راہب کے پاؤں بھی ننگے تھے۔ سر پر استرا پھیرا گیا تھا وہ بڑی تمکنت سے چلتا ہوا اندر پہنچا۔ اس کے عقب میں دو چیلے تھے۔ ان کے سر بھی صفاچٹ اور پاؤں ننگے تھے......

کارینگ نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی گرو کشپال ہیں۔ بدھا کا ان پر خاص کرم ہے۔ ان کے ہاتھ میں بہت شفا رکھی گئی ہے۔''

گرو نے ایک نگاہ غلط انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں اور حمزہ نے گرو کو تعظیم پیش

کی، جس کا جواب شان بے اعتنائی سے دیا گیا۔ ہانپتی کانپتی بڑھیا نے لکڑی کی ایک چوکی کمرے کے وسط میں رکھ دی تھی۔ گرو بڑے ٹھاٹ سے چوکی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں مالا ہولے ہولے گردش کر رہی تھی اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ کافی دیر تک منہ میں بدبداتا رہا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک جواں سال عورت لمبی چادر میں لپٹی ہوئی برآمد ہوئی اور گرو کے روبرو دوزانو بیٹھ کر اپنا سر یوں جھکا لیا کہ وہ زمین سے لگتا ہوا محسوس ہوا۔

جواں سال عورت اور گرو کے درمیان چند فقروں کا تبادلہ ہوا۔ اس گفتگو میں سون کی والدہ نے بھی مختصر سا حصہ لیا یہ ساری گفتگو مقامی زبان میں تھی لہٰذا ہمارے پلے نہیں پڑی۔ گرو نے اپنی خوابناک نظریں اٹھا کر اپنے ایک چیلے کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور اپنا کشکول گرو کے سامنے کر دیا۔ گرو نے کشکول میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا اور کوئی شے جواں سال عورت پر چھڑکی۔ یہ غالباً کوئی عرق قسم کی شے تھی۔ ایک تیز خوشبو نے جھونپڑے کے مختصر خلا کو ڈھانپ لیا۔ عجیب سحر انگیز سی خوشبو تھی۔ گرو نے مدھم آواز میں چند سوتروں (مذہبی دعاؤں) کا الاپ کیا۔ پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔

بوڑھی فینگ جلدی سے اندر گئی وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس نے یہ پوٹلی گرو کے پاؤں سے چھوئی اور پھر ایک چیلے کے کشکول میں ڈال دی۔ ہم اس ساری کارروائی کے دوران ایک طرف مودب کھڑے رہے تھے۔ گرو اور اس کے عقیدت مندوں میں سے کسی نے ہماری طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی دو تین منٹ مزید رکنے کے بعد گرو اور اس کے دونوں چیلے باہر چلے گئے۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ فینگ، کارینگ اور جواں سال عورت ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے رہے۔

گرو کے جانے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ جواں سال عورت دراصل جواں سال لڑکی تھی اور یہ سون کی بڑی بہنوں میں سے ایک تھی۔ سون کی والدہ نے اس کی جلد شادی کے لیے گرو جی سے دعا کروائی تھی۔ اس کے علاوہ اپنی بیماری کے لیے بھی اس نے گرو جی سے عمل کیا ہوا پانی حاصل کیا تھا۔ کارینگ نے یہ بھی بتایا تھا کہ ابھی یہاں سے جانے والے گرو کشپال...... گرو ایش کے شاگرد ہیں۔ گرو ایش کو استاد گرو بھی کہا جاتا ہے اور ان کا قیام بڑے پگوڈا میں ہے۔ تیسرے اہم اور سب سے بڑے گرو کا نام واشوجت تھا۔ واشوجت کی عمر کافی زیادہ تھی۔ وہ زیادہ تر بڑے پگوڈا میں ہی رہتے تھے۔ انہیں "بڑے

گرو" کے لقب سے بھی پکارا جاتا تھا۔

اپنی رہائش گاہ پر واپس آنے کے بعد میں نے کارینگ سے پوچھا۔ "وہ پوٹلی کیسی تھی جو فینگ نے گرو کے قدموں سے چھوا کر کشکول میں رکھی تھی؟"

کارینگ نے بتایا۔ "اس میں سونے چاندی کا کوئی زیور ہوگا...... یا پھر کوئی چھوٹی موٹی رقم ہوگی جو سون کی والدہ نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کی ہوگی۔ یہ رقم پگوڈا کے فنڈ میں جائے گی۔ ایسی رقوم لوگ کثرت سے جمع کراتے ہیں۔ ان سے پگوڈا کا انتظام چلتا ہے اور تقریبات وغیرہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ لکشون گاؤں کا ایک زمیندار ہر ماہ ایک خطیر رقم اس مد میں جمع کراتا ہے۔"

توہمات کا یہ سلسلہ ہم نے تھائی لینڈ کے مضافاتی علاقوں میں ہر جگہ دیکھا تھا۔ راہب، بھکشو، عامل، عطائی اور نیم حکیم کئی طریقوں سے ضرورت مندوں کو لوٹتے تھے۔ بے شک بدھ مت کے سچے پیروکار بھی ملتے تھے جو بے حد سادہ دل اور قناعت پسند لوگ ہوتے تھے تاہم بہروپیوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ان بہروپیوں نے کئی حوالوں سے بدھ مت کی شکل بگاڑ رکھی تھی۔ اس بے حد سادہ اور فقیری قسم کے مذہب میں راگ رنگ اور کھیل تماشوں کو دخول مل گیا تھا اور خرافات واضح دکھائی دیتی تھیں۔

رات بھر کی بارش کے بعد موسم بہت اچھا ہو گیا تھا۔ ہر شے نکھری ہوئی تھی۔ دس بجے کے قریب میں اور حمزہ، کمپاؤنڈر لی کے کلینک پر پہنچ گئے۔ آج ہم چھتریاں لانا نہیں بھولے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کلینک میں کافی مریض جمع ہو چکے تھے۔ مقامی اسکول کے ماسٹر ایک بری تھے۔ انہیں جوڑوں کا درد لاحق تھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے سے کلینک میں آئے بیٹھے تھے۔ ہم نے سب سے پہلے انہی کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد دوپہر ڈیڑھ بجے تک مختلف مریضوں کو دیکھتے رہے۔ ایک بھکشو ٹائپ شخص بھی اس سارے عرصے میں وہاں موجود رہا۔ وہ چپ چاپ ایک گوشے میں کھڑا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص پگوڈا کے بھکشوؤں اور گرو کشپال کی طرف سے یہاں موجود ہے۔ شاید اس کی ذمے داری یہ تھی کہ وہ ہماری حرکات وسکنات پر نظر رکھے۔ بعد میں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

ہم نے دوپہر ڈیڑھ بجے تک جن مریضوں کو دیکھا ان میں کل والی مریضہ بھی شامل تھی، یعنی سون کی بوڑھی ساس، وہ کل کی طرح اپنی بڑی بہو پیاؤ کے ساتھ آئی تھی۔ آج

میں نے زیادہ دھیان سے پیاؤ کو دیکھا، کیونکہ کل مجھے پیاؤ کے جانے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ وہ سون کی جیٹھانی ہے اور سون کے ساتھ اس کی گہری دوستی بھی تھی۔

پیاؤ کی عمر تیس سال سے کم نہیں تھی لیکن اپنی جسمانی موزونیت اور اچھی شکل وصورت کی وجہ سے عمر کم دکھائی دیتی تھی۔ اس کے سراپے میں خاص قسم کی نسوانی دلکشی تھی۔ اس دلکشی نے اس کی چال میں بھی لوچ اور لہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ وہ ساڑھی پہنتی تھی اور اسے ساڑھی پہننے کا طریقہ بھی آتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ جتنی دیر وہاں رہی بڑے غور سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کا یہی انداز میں نے کل بھی نوٹ کیا تھا۔ اس کے انداز نے مجھے گڑبڑا سا دیا۔

وہ اپنی ساس کے ساتھ کمرے میں آئی تو اس وقت بھی گاہے گاہے میری آنکھوں سے آنکھیں چار کر لیتی تھی۔ میں نے اس کی ساس کا تفصیل سے طبی معائنہ کیا۔ اس کے کانوں میں درد بھی رہتا تھا، شاید یہی اس کے مکمل بہرے پن کا سبب تھا۔ میں جب نسخہ لکھ رہا تھا، پیاؤ نے اچانک عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں...... اکیلے میں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے باکی سے میری آنکھوں میں گڑی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''اس وقت بھی یہاں کوئی نہیں...... آپ بات کر سکتی ہیں۔''

''نہیں یہ موقع ٹھیک نہیں...... باہر رش لگا ہوا ہے۔ کئی لوگ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''تو پھر آپ شام سے تھوڑی دیر پہلے آ جائیں۔ آپ کی والدہ (ساس) کو گلوکوز کی ڈرپ بھی لگنی ہے۔ انہیں تقریباً دو گھنٹے یہاں رکنا پڑے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

میں ابھی تک الجھن میں تھا۔ بہر حال میں نے اسے نسخہ تھماتے ہوئے کہا۔ ''اس میں دو دوائیں ایسی ہیں جو میرے پاس موجود نہیں۔ اگر آپ انہیں کسی قریبی قصبے سے منگوا سکیں تو بہتر ہے۔ دو تین دن لگ بھی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ یہ بعد میں بھی شروع کرائی جا سکتی ہیں۔''

پیاؤ نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا اور پھر اپنی کمزور ساس کو سہارا دے کر باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا، وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہے؟ وہ

مجھے بار بار گھورنے کیوں لگ جاتی تھی۔ کہیں وہ میرے حوالے سے کوئی خاص بات تو نہیں جانتی تھی؟ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور زمانہ شناسی کی چمک تھی۔ ایسی خواتین بالکل موہوم اشاروں سے بڑے واضح اندازے لگا لیتی ہیں۔ وہ ہواؤں میں نادیدہ واقعات کی خوشبو سونگھ لیتی ہیں...... یا پھر...... یا پھر کوئی اور چکر بھی ہو سکتا تھا۔ وہ جوان اور خوش شکل دیہاتن تھی۔ اس کا شوہر کمزور جسم کا مالک ایک عام سا شخص تھا اور اکثر بستی سے باہر رہتا تھا۔ کہیں پیاؤ ان خائن عورتوں میں سے تو نہیں تھی جو اپنے مردوں کے پیچھے ان کے حقوق پر ڈاکا ڈالتی ہیں اور غیر مردوں کی طرف میلان رکھتی ہیں؟ ایسے ہی کئی سوال شام تک میرے ذہن میں آتے رہے۔ یہاں تک کہ پیاؤ اپنی ساس کو لے کر کمپاؤنڈر لی کے کلینک پر پہنچ گئی۔

ڈاکٹر حمزہ بستی کا ایک راؤنڈ لگانے کے لیے نکلا ہوا تھا۔ میں نے لی کے ساتھ مل کر بوڑھی عورت کو ڈرپ وغیرہ لگائی۔ پیاؤ، ساس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ گاہے گاہے وہ اپنی ساڑھی کے پلو سے ساس کی پیشانی پر چمکنے والا پسینہ پونچھ دیتی تھی۔ آج حبس محسوس ہو رہا تھا۔ پیاؤ نے کہا۔ ''یہ بارش کی نشانی ہے ڈاکٹر صاحب!''

''شاید ایسا ہی ہے۔'' میں نے کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ناریل اور کیلے کے جھنڈ کے عقب میں افق ابر آلود دکھائی دے رہا تھا۔ الگنیوں پر جھولتے ہوئے رنگ برنگے کپڑے ہوا نہ ہونے کے سبب بالکل ساکت تھے۔ کوئی پتا...... گھاس کا کوئی تنکا بھی جنبش کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

وہ بانس کی لکڑی سے بنے ہوئے اسٹول پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے قریب ہی کرسی پر موجود تھا۔ وہ بولی۔ ''آپ کا نام آختر (اختر) ہے۔ کیا یہ آپ کا پورا نام ہے؟''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ''کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟'' میں نے اپنے تاثرات کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

اس نے نگاہیں میرے چہرے پر جمائے رکھیں اور بولی۔ ''کہیں آپ کے نام میں شاد کا لفظ تو نہیں آتا۔''

پیاؤ کے یہ الفاظ میرے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوئے، میرا منہ کھلا رہ گیا۔ شک کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی کہ پیاؤ میرے بارے میں جانتی ہے۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مسز پیاؤ! آپ کی باتیں، میری

سمجھ میں نہیں آرہی ہیں آپ......"

"میرا خیال ہے کہ میرے پاس آپ کی ایک تصویر بھی موجود ہے۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا اور میرے اعصاب کچھ اور بھی کھنچ گئے۔

اس نے ادھر اُدھر احتیاط سے دیکھا۔ اس کی بہری ساس ناریل کی چھال سے بنی ہوئی لبوتری چارپائی پر لیٹی تھی اور غنودگی کے سبب اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ پیاؤ نے اپنی ساڑھی کے پلو کے نیچے بلاؤز میں ہاتھ ڈالا اور اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز نکال لی۔ یہ ایک تصویر تھی۔ اس نے اپنے جسم کی اوٹ میں رکھ کر اخباری کاغذ کی تہیں کھولیں اور کارڈ سائز کی تصویر میرے سامنے کر دی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ میری اور سون کی تصویر تھی۔ میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا تھا، اور پچھلے چار پانچ برسوں میں کئی مرتبہ اس تصویر کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ جب بنکاک میں میری اور سون کی آخری ملاقات ہوئی تھی ایک فوٹو گرافر نے سری لنکن ہوٹل میں یہ تصویر کھینچی تھی۔ تصویر دیکھ کر ماضی کا ایک دریچہ میرے سامنے کھل گیا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ عقب میں ایک "ان ڈور" پودا تھا۔ سون کے دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے تھے اور عریاں دودھیا کلائی پر کنگن آڑھا ترچھا ٹکا ہوا تھا۔ میں آج برسوں بعد اس تصویر کے ذریعے سون کی شکل دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے یہ شکل ہمہ وقت میری نگاہوں کے سامنے رہی ہے۔ میں کبھی اسے بھولا ہی نہیں ہوں۔"

مجھے یاد آیا کہ اس تصویر کی پے منٹ بھی سون نے اپنے پرس سے کی تھی اور کہا تھا۔ "یہ تصویر میں نے اپنے لیے کھنچوائی ہے ٹورسٹ! اگر تمہیں درکار ہے تو اور کھنچوا لو۔"

میں نے بے رخی سے جواب دیا تھا۔ "نہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ میری اس بے رخی کو بھی بہت سی دوسری "بے رخیوں" کی طرح تحمل و سکون سے برداشت کر گئی تھی۔ آج ایک بار پھر وہ تصویر میرے سامنے تھی اور میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ تصویر کے رنگ کچھ پھیکے پڑ گئے تھے لیکن سون کے چہرے کی پر درد چمک اسی طرح نمایاں نظر آ رہی تھی۔

پیاؤ کی آواز نے مجھے چونکایا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "صرف اتنا فرق ہے کہ آپ کی شیو بڑھی ہوئی ہے اور بال تھوڑے سے لمبے ہیں لیکن آپ کو دیکھنے کے فوراً بعد ہی میرے ذہن میں شک رینگنے لگا تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا تھا کہ آپ وہی ہیں جس کا یہاں

کسی نے بہت شدت سے انتظار کیا تھا۔ اتنی شدت سے کہ وہ اپنے آپ کو بھی بھلا بیٹھی تھی۔"

پیاؤ کے آخری الفاظ نے میری سماعت پر لرزہ طاری کر دیا۔ میں نے ہکلا کر کہا۔ "آ......آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"اس کی...... جس کے لیے آپ یہاں آئے ہیں...... ہاں ڈاکٹر آختر! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور شاید وہ کچھ بھی جو آپ کو معلوم نہیں۔"

میرے سینے میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں نے ہراساں نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ کمپاؤنڈر لی بڑی تندہی سے ایک دوا پیسنے میں مصروف تھا۔ پیاؤ کی ساس آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ اسٹیتھسکوپ اتار کر میز پر رکھا اور ہتھیار پھینکنے والے لہجے میں کہا۔ "آپ میرے بارے میں کیا جانتی ہیں مسز پیاؤ؟"

"میں پہلے یہ بتانا چاہوں گی کہ میں سون کے بارے میں کیا جانتی ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "اس کی سیاہ آنکھوں میں آنسو سے چمک گئے تھے اور پتہ نہیں کیوں، ایک دم میں اپنے آپ کو قصور وار محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے اپنے "قصور" کی ٹھیک نوعیت معلوم نہیں تھی مگر کیفیت وہی تھی جو قصور وار کی ہوتی ہے۔ پتہ نہیں، کیوں ہوا تھا ایک دم ایسا؟ پیاؤ نے کہا۔ "ڈاکٹر آختر! آپ کو نہیں معلوم، ہاں آپ کو نہیں معلوم، آپ نے اس پھول سی لڑکی کے ساتھ کیا کیا ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا ہے جو کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ میں جب اس پہلو سے سوچتی ہوں تو گستاخی معاف مجھے آپ اور چنگی ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں۔ سون کی زندگی برباد کرنے میں آپ دونوں کا ہاتھ ہے، اور اس لحاظ سے آپ زیادہ قصور وار نظر آتے ہیں کہ آپ نے اپنے رویے سے ایک ایسی بے بس لڑکی کو لہولہان کیا جو پہلے ہی زخموں سے چور تھی۔" پیاؤ کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر گئے۔ یوں لگا جیسے بوندیں دروازے سے باہر ہی نہیں اندر بھی گر رہی ہیں۔ وہ دکھ بھری شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "مسز پیاؤ! آپ مجھے سون کے بارے میں بتانا چاہتی ہیں۔ آپ بتا لیں میں آپ سے پوچھوں گا کہ آپ میرے بارے میں کیا جانتی ہیں اور پلیز! یہ آنسو وغیرہ پونچھ لیں۔ کسی نے اندر آ کر دیکھ لیا تو کیا سوچے گا۔"

قریباً پانچ منٹ تک پیاؤ بس سسکتی ہی رہی۔ پھر دھیرے دھیرے اس کے جذبات میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ بالآخر اس نے اپنی بسنتی ساڑھی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور بولی۔ ''وہ بڑی چنچل اور ہنس مکھ تھی۔ خوشی اس کے اندر سے پھوٹا کرتی تھی۔ میرے دیور چنکی نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا، کسی اور لڑکی کے ساتھ ہوتا تو خودکشی کر لیتی یا ہمیشہ کے لیے مردار ہو جاتی...... اس بے چاری نے پھر بھی کسی نہ کسی طرح زندہ رہنے کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ بنکاک میں قریباً ایک سال تک سخت بیمار رہنے کے بعد جب وہ دوبارہ صحت یاب ہوئی تو اس کے اندر سے ایک اور سون پھوٹ نکلی۔ اپنی ساری تکلیفوں اور مصیبتوں کو سینے میں چھپا کر اس نے جینا سیکھ لیا۔ وہ ہنستی کھیلتی تھی، کھاتی پیتی تھی، رقص کرتی تھی۔ یہ اس کے اندر کی خوشی ہی تھی جس نے اسے زندہ رہنے کا نیا ڈھنگ سکھایا۔ یوں میں کہہ سکتی ہوں ڈاکٹر آختر! کہ چنکی کے ہاتھوں مسمار ہونے کے بعد وہ پھر تعمیر ہو گئی...... لیکن گستاخی معاف! آپ نے اسے یوں توڑا کہ اس میں دوبارہ تعمیر ہونے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ وہ ملبے کا ڈھیر بنی اور اس کی زندگی کی صورت بدلتے بدلتے کیا ہو گئی۔''

پیاؤ نے چند لمحے توقف کیا اور جذباتی لہجے میں بولی۔ ''وہ آپ سے پیار کرنے لگی تھی ڈاکٹر آختر! بلکہ شاید پیار بھی چھوٹا لفظ ہے۔ مجھے اس کے لیے ایک دوسرے لفظ کا سہارا لینا پڑے گا۔ ہاں...... وہ آپ سے عشق کرنے لگی تھی۔ وہ بچپن سے بڑی جذباتی تھی۔ وہ اپنے گڈے گڈیوں سے عشق کرتی تھی۔ ان کی جدائی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی۔ اسے کسی سے لگاؤ ہوتا ہی نہیں تھا، اگر ہو جاتا تھا تو پھر بہت شدید ہوتا تھا۔ جیسے آپ سے ہوا۔ وہ بنکاک میں کال گرل کی زندگی گزار رہی تھی۔ آپ سے اس کا سامنا ہوا۔ آپ اسے ان تمام لوگوں سے مختلف لگے جو اب تک اسے ملے تھے۔ وہ مجھ سے کچھ بھی چھپاتی نہیں تھی ڈاکٹر آختر! چھوٹی چھوٹی بات بھی بتا دیتی تھی، آپ کے بارے میں بھی اس نے اپنے دل کی ہر واردات مجھے بتائی ہے۔ وہ کہتی تھی جب اس نے آپ کو پہلی بار ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کے ڈانس ہال میں دیکھا تو آپ اسے اپنے چہیتے گڈے سونو کی طرح لگے۔ سونو اس کا گڈا تھا، وہ بچپن میں اس سے عشق کرنے لگی تھی۔ اس کی حرکتیں ایسی ہی اوٹ پٹانگ ہوا کرتی تھیں۔ وہ شادی کے بعد بھی اپنے سونو گڈے کا نام لیا کرتی تھی اور آہیں بھرتی تھی۔ شادی کے کوئی پانچ ماہ بعد سون کو پہلی بار بے ہوشی کا دورہ پڑا تھا۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ اسے کبھی کبھار بے ہوشی کا دورہ پڑ جاتا تھا؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔

''جس روز پہلی بار ایسا ہوا تھا وہ یہاں لکشون گاؤں میں ہی تھی۔ گاؤں میں آنے والی ایک بارات کو دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں آ گئی تھی لیکن اس پر ساری رات گہری غنودگی طاری رہی تھی۔ ہاں تو میں تمہیں ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کی بات بتا رہی تھی وہاں سون سے تمہاری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے بعد ہونے والی ہر ملاقات میں وہ تمہاری طرف کھنچتی چلی گئی تھی۔ وہ تم پر ظاہر نہیں کرتی تھی لیکن وہ تم سے بے انتہا وابستگی محسوس کرنے لگی تھی۔ تم اس سے جتنا دور رہتے تھے وہ تم سے اتنا ہی وابستہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ ان دنوں اس نے مجھے اوپر تلے دو خط بھی لکھے تھے۔ ان میں سے ایک خط اب بھی میرے پاس ہے، موقع ملا تو تمہیں دکھاؤں گی ڈاکٹر!......''

بات کرتے کرتے ایک دم پیاؤ ٹھٹک گئی اور اس کے چہرے پر شرمندگی کی جھلک آئی۔ ''اوہ سوری! میں آپ کو ڈاکٹر صاحب کے بجائے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کر رہی ہوں۔ آپ نے برا تو نہیں منایا۔''

''بالکل نہیں۔ مجھے آپ...... جناب کے بجائے بے تکلفی سے مخاطب کرو۔ مجھے ایسا اچھا لگتا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اپنی کوئی بات بھی سون نے مجھ سے چھپائی نہیں ہے۔ وہ تمہارے چلے جانے کے خیال سے بہت افسردہ تھی لیکن اسے پتہ تھا کہ جانے والے نے آخر جانا ہی ہے...... تم...... ایک پردیسی پرندے تھے ڈاکٹر آختر! اور وہ تمہیں دل دے بیٹھی تھی لیکن اسے اپنی حیثیت بھی بڑی اچھی طرح معلوم تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ زمین پر رینگنے والی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی چیونٹی ہے، تم نیلے آسمان پر اڑنے والے شہپر ہو۔ تمہارا اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں۔ تمہیں جانا ہی ہے اور پھر تم چلے گئے تھے۔ وہ بھرے پرے بنکاک میں بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اس کا جی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ پتہ نہیں کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ نہ وہ خود بھی نہ مجھے سمجھا سکی۔ تم اسے ایک ایسا روگ دے گئے تھے جس کا کہیں علاج نہیں تھا۔ شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو ڈاکٹر آختر! کہ تمہارے بنکاک چھوڑنے سے دو تین دن پہلے ہی سون نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لیے نائٹ لائف سے الگ ہو گئی تھی۔ اس کے پاس کچھ جمع پونجی موجود تھی۔ وہ اسی میں سے کچھ رقم نکال نکال کر چنکی کو دیتی رہی تاکہ وہ اس سے ''پگاڑ'' کا تقاضا نہ کرے...... پھر اس نے بیماری کا بہانہ بنایا اور کچھ عرصے

کے لیے اپنی بڑی بہن کے پاس ''آ کی'' چلی گئی لیکن اسے وہاں بھی چین نہیں آیا۔ وہ بنکاک میں رہنا چاہتی تھی اور ہوٹل نیوٹروکیڈرو کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ اس کے دل کے اندر سے ہر روز یہ آواز آتی تھی، کہ اس کا ٹورسٹ! واپس آئے گا۔ بس ایک بے نام آس تھی۔ ایک بے وجہ یقین تھا...... بغیر کسی جواز کے...... بغیر کسی منطق کے وہ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا، ڈاکٹر آختر! کہ وہ بس ایسی ہی اوٹ پٹانگ تھی۔ میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ وہ خوابوں کی دنیا سے باہر نکلے۔ یہ قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔ لوگوں کی دلچسپی کے لیے سیاح حضرات جو سفرنامے لکھتے ہیں ان میں ایسے واقعات شامل کیے جاتے ہیں۔ وہ سب سمجھتی بھی تھی، مانتی بھی تھی لیکن جان بوجھ کر آنکھیں بند کیے ہوئے تھی میں نے ایک دن اسے جھڑکا بھی۔ میں نے کہا۔ ''سون! تو کیا سمجھتی ہے، تو نے رخصت کے وقت اسے بوسہ نہیں دیا تھا...... اور وہ اس بوسے کے لیے تڑپ تڑپ کر پھر تمہارے پاس آ جائے گا؟ تو پاگلوں جیسی باتیں کرتی ہے۔ خوامخواہ اپنے آپ کو دکھ دے رہی ہے۔ چنکی کے صبر کا پیالہ چھلک گیا تو وہ تجھے پٹایا کے ساحل پر غوطے دے دے کر مار دے گا۔''

وہ کچھ نہیں بولی تھی ڈاکٹر آختر! اس کے چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ نہ دکھ نہ خوف نہ مایوسی، بس ایک انتظار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک انتظار ہے۔ وہ چنکی کے ساتھ گاؤں آتی بھی تھی تو اسے واپس جانے کی جلدی ہوتی تھی۔ جیسے ایک ان دیکھی ڈور اسے مسلسل بنکاک کی طرف کھینچتی رہتی تھی۔ چنکی اس پر بہت سختی کرتا تھا۔ وہ اسے واپس اس کے پیشے کی طرف لانا چاہتا تھا۔ اسے اپنی عورت کے جسم کی کمائی کھانے کی لت لگ گئی تھی اور بہانے بناتا تھا قرضے کے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے بنکاک میں سون کی بیماری پر بے تحاشا خرچ کیا تھا۔ اس خرچ کے سبب وہ مقروض ہوا اور اب قرض خواہ اس کا گلا دباتے ہیں۔ سون نے بنکاک کے ایک جوہری ہوچی وانگ کے ہاں محنت مزدوری شروع کر دی تھی اور دن رات خود کو مشقت کی چکی میں پیس کر چنکی کے تقاضے پورے کر رہی تھی لیکن چنکی کے دلی منصوبے تو کچھ اور ہی تھے۔ اس نے ہوچی کے ہاں بھی سون کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہاں اس نے ہوچی اور سون کو ایسے چکر میں پھنسایا کہ ہوچی کو اپنی عزت بچانے کے لیے سون پر بلیک میلنگ کا الزام لگانا پڑا اور سون چھ ماہ کے لیے جیل چلی گئی۔ جیل کاٹنے کے بعد وہ رہا ہوئی تو پھر سے چنکی کی گرفت میں تھی۔ چنکی نے اسے اپنے

حبس بے جا میں رکھا اور بری طرح مارتا پیٹتا رہا۔ بعد ازاں جب سون کی ذہنی حالت ابتر ہونے لگی تو وہ اسے یہاں لکشون گاؤں لے آیا۔ گاؤں کا پگوڈا اس گھر کے قریب ہی ہے جہاں سون، چنکی کے ساتھ رہتی تھی۔ یہیں پر اس نے گروکشپال کے وعظ سننے شروع کیے اور دھیرے دھیرے وہ مذہب کی طرف مائل ہونے لگی۔ وہ اکثر گیروے کپڑے پہننے لگی تھی۔ اس کی گفتگو میں گہری سنجیدگی اور اداسی آتی جا رہی تھی۔ یہ کوئی اور ہی سون لگتی تھی پھر ایک دن ایسا آیا جب وہ بڑی خاموشی کے ساتھ یہ گلیاں یہ کھلیان اور یہ گاؤں چھوڑ گئی۔ کئی روز بعد معلوم ہو سکا تھا کہ وہ ''چاتو چانگ لے'' کے بڑے پگوڈا میں چلی گئی ہے اور وہاں مٹھ میں راہباؤں کے ساتھ رہ رہی ہے۔''

پیاؤ بولتی رہی۔ میں اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا۔ حالانکہ ان میں اسے اکثر باتیں، میں پہلے لی سے بھی سن چکا تھا۔ پیاؤ کی گفتگو اختتامی مراحل میں پہنچی تو اس نے مجھے وہ خط دکھایا جو قریباً چار سال پہلے سون نے بنکاک سے اسے لکھا تھا۔ یہ خط تھائی زبان میں تھا جس رات سون سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی یہ خط اس سے اگلی رات لکھا گیا تھا۔ میرے کہنے پر پیاؤ نے یہ خط پڑھنا شروع کیا۔ وہ تھائی میں لکھا گیا ایک ایک جملہ پڑھتی گئی اور انگریزی میں اس کا ترجمہ کرتی گئی۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''پیاری پیاؤ!

پچھلے دنوں دل کی حالت بڑی عجیب رہی ہے۔ مجھے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آ رہی ہے، یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ زندگی میں سینکڑوں بار پیار کا لفظ سنا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ''پیار'' ہوتا کیا ہے۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے آپی...... انسان اپنے آپ سے ہی جدا ہو جاتا ہے۔ میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور نہ کبھی ہونے دوں گی۔ میں اس سے اس کا پتا ٹھکانا نہیں پوچھوں گی، اور میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے بتا کر بھی نہیں جائے گا۔ میں اس کے کالر میں اپنے انتظار کا گلاب ٹانک کر اسے آزاد چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ کہتے ہیں کہ جو اپنا ہوتا ہے وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلا جائے واپس آ جاتا ہے۔ شاید میں بھی کسی موہوم امید کے سہارے اس کا انتظار کرنا چاہتی ہوں۔ یہ چاہتی ہوں کہ وہ اپنا نام ونشان بتائے بغیر چلا جائے اور پھر مجھے ڈھونڈتا ہوا واپس آ جائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا میرے جیسی لڑکی کے لیے کوئی پردیسی واپس آ سکتا ہے؟

شاید نہیں آ سکتا اور ٹورسٹ، تو بالکل ہی اور طرح کا ہے پھر بھی نجانے کیا بات ہے

میں اس کے جانے کے بعد دن رات اس کی راہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ خبر نہیں یہ کیسا دیوانہ جذبہ ہے۔ میں اس بارے میں جتنا سوچتی ہوں اتنا ہی الجھ جاتی ہوں۔

وہ پتہ نہیں کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ لیکن چند ہی دنوں میں ایسا لگنے لگا ہے کہ میں اسے مدتوں سے جانتی ہوں۔ اس کی کوئی ادا اس کی کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

پچھلے چوبیس گھنٹے میں نے بڑی اذیت میں گزارے ہیں۔ یوں سمجھو کہ بس روتی ہی رہی ہوں اتنا پانی تو یانگ دریا میں بھی نہیں ہوگا جتنا میری آنکھوں سے بہا ہے۔ پتہ ہے آپی! ایسا کیوں ہوا ہے؟ اس لیے کہ کل رات ہماری آخری ملاقات ہوئی ہے۔ سری لنکن ہوٹل کی جلتی بجھتی روشنیوں میں میں نے بہت دیر تک بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھا ہے۔ وہ بھی کچھ کچھ جذباتی نظر آ رہا تھا۔ اردگرد کی ہر شے کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں اپنی محبت تلاش کرتی رہی لیکن یا تو میری نگاہ میں اتنی سکت نہیں کہ ٹورسٹ کے اندر تک جا سکے، یا پھر اس کی آنکھیں بہت گہری ہیں۔ میں ہمیشہ کی طرح ناکام رہی۔ ہم الوداعی باتیں کرتے رہے۔ جدائی کی گھڑی قریب آتی رہی، پھر ایک بڑی عجیب بات ہوئی آپی! وہ ہوا جو اب تک نہیں ہوا تھا اور نہ میں نے جس کا تصور کیا تھا۔ بالکل آخری لمحوں میں اس نے مجھے بازوؤں سے تھام لیا، اس نے مجھے چومنا چاہا۔ وہ میری زندگی کی خوش قسمت ترین گھڑیاں تھیں۔ لیکن پھر ایک دم یوں ہوا کہ میرے اندر کوئی شے بجھ گئی۔ ٹورسٹ کے ہونٹ جب میرے قریب آئے تو میں نے ایک دم اپنا چہرہ ایک طرف ہٹا لیا۔ پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا آپی! لیکن یہ ہو گیا۔ ٹورسٹ کی روشن روشن آنکھوں میں ایک دم دھواں پھیل گیا تھا۔ وہ بڑے عجیب لمحے تھے۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں میں انہی لمحوں کے بارے میں سوچتی رہی ہوں اور روتی رہی ہوں۔ پتہ نہیں اس نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ شاید دل ہی دل میں مجھ پر لعنت بھی بھیجی ہو۔ اس کے دل میں آیا ہو کہ ایک کچلی مسلی بے آبرو لڑکی ایک الھڑ دوشیزہ کا ناٹک رچا رہی ہے یا ممکن ہے کہ اس نے مجھے بے حس و مغرور جانا ہو، یا پھر اس نے سمجھا ہو کہ میں نے اس سے اس کے پچھلے رویے کا بدلہ لیا ہے۔ آہ آپی! اسے کیا پتہ، اس کے ایک بوسے کے لیے میں اپنی زندگی نچھاور کر سکتی تھی۔ ایک بار اس سے گلے ملنے کے عوض میں اپنے سات جنموں کی ساری خوشیاں اس کے قدموں میں ڈال سکتی تھی، وہ بوسہ میرے لیے کتنا قیمتی تھا اس کا

تصور اس کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس بوسے سے محروم ہو کر میں نے اپنی جان پر جو عذاب جھیلا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ ابھی ٹورسٹ بنکاک میں ہی ہے۔ اس کا دوست واپس اس کے پاس آ گیا ہے۔ لہٰذا ہمارے درمیان یہ بات کل رات ہی طے ہو گئی تھی کہ اب ہم نہیں ملیں گے۔ میرے لیے یہ خیال بھی بڑا روح فرسا ہے کہ ٹورسٹ بنکاک میں ہونے کے باوجود میرے لیے بنکاک میں نہیں ہے۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس کے بنکاک میں ہوتے ہوئے بھی میں اسے نہ دیکھوں۔ میں نے سوچا ہے کہ میں پرسوں ائرپورٹ پر ایک پیکٹ...... اس تک ضرور پہنچاؤں گی۔

اچھا رات بہت ہو گئی ہے۔ سر میں سخت درد ہے۔ کچھ دیر لیٹنا چاہتی ہوں۔ اب مجھے اجازت دو۔ امید ہے کہ جلد ملیں گے۔"

خط پڑھتے پڑھتے کئی بار پیاؤ کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ یہی لرزش مجھے اپنے جسم میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک میٹھا میٹھا درد جو کئی دنوں سے جسم میں لہریں لے رہا تھا، اچانک شدت اختیار کر گیا تھا اور کسی اندرونی اذیت کے سبب رگ و پے چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔

میری نگاہیں سون کے برسوں پرانے خط پر جمی تھیں اور پیاؤ کی شکوہ کناں نگاہیں میرے چہرے پر تھیں۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں بار بار ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی۔ 'تم نے ایسا کیوں کیا ڈاکٹر! تم ہماری پھولوں جیسی سون کو کانٹوں میں پرو کر کیوں چلے گئے۔ وہ تو پہلے ہی دکھوں کی ماری تھی، تم نے اسے پارہ پارہ کر ڈالا۔'

میری اور پیاؤ کی یہ نہایت اہم گفتگو شاید کچھ دیر مزید جاری رہتی لیکن اسی دوران میں کمپاؤنڈر لی اپنے کام سے فارغ ہو کر کمرے میں آ گیا اور تام چینی کی پلیٹ میں تازہ انناس کی قاشیں کاٹ کاٹ کر میرے سامنے رکھنے لگا۔ پیاؤ کی بوڑھی ساس کو لگی ہوئی ڈرپ بھی ختم ہو چکی تھی۔ میں نے پیاؤ کو کل دوبارہ آنے کی تاکید کی اور ساس بہو کو واپس بھیج دیا۔

میرے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے سے میرے لاشعور میں موجود تھا، میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہونا ہے۔ پانچ سال پہلے کھینچی گئی تصویر اور پانچ سال پہلے لکھا گیا خط میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے وہ سب کچھ جو پچھلے پانچ برسوں میں ایک افسانہ رہا تھا، آج ایک ٹھوس حقیقت بن کر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا اور میں اس سے وابستہ تمام کیفیات کو بڑی وضاحت سے محسوس کر سکتا تھا۔

رات کو تیز ہوا چلتی رہی، گھنے جنگل سے شب بیدار جانوروں کی صدائیں آتی رہیں اور ناریل کے بلند و بالا درخت جھوم جھوم کر ایک دوجے سے گلے ملتے رہے۔ اسی آسمان تلے، انہی فضاؤں میں، اس گھنے جنگل میں کہیں میرے آس پاس، سون موجود تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنی بدل چکی ہے۔ مجھے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا ذہن کتنا تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن میں ایک بات اچھی طرح جانتا تھا، وہ مجھے بھولی نہیں ہوگی، جیسے کہ میں اسے نہیں بھولا تھا۔ برسوں پہلے بنکاک میں سون نے مجھے جو نظم سنائی تھی وہ پتا نہیں کیوں شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اس نظم کے الفاظ دھیمی بارش کے قطروں کی طرح دل کی زمین پر گرنے لگے اور جذب ہونے لگے۔

ایک حیران بلبل پام کے بلند درخت پر بیٹھا ہے
وہ اپنے سامنے پھیلے وسیع و عریض سمندر کو دیکھتا ہے
اور سوچتا ہے
یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے؟
یہ ہوا کہاں سے چلتی ہے؟
یہ سورج کی سرخ گیند کہاں اوجھل ہوتی ہے؟
وہ اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرتا ہے
اس کا خیال ہے کہ جس طرح
سمندر میں گم ہونے والی لہریں
پھر پلٹ کر کنارے پر آتی ہیں
جس طرح دن میں ختم جانے والی ہوا
رات پچھلے پہر پھر چلنے لگتی ہے
جس طرح گمشدہ سورج
دوبارہ آسمان پر نمودار ہو جاتا ہے
اس طرح اس کا ساتھی
جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا۔
ایک دن واپس آ جائے گا۔

میرے دل سے آواز آئی۔ ”شاداب! تم سون سے ملے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔

اگر جاؤ گے تو بری طرح پچھتاؤ گے۔ ہو سکتا ہے کہ سون سے ملنے میں خطرات پوشیدہ ہوں۔ کچھ لوگوں کو تمہاری یہ ”دیدہ دلیری“ پسند نہ آئے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں، لیکن پھر بھی تمہیں کم از کم ایک بار سون تک پہنچنا ہوگا۔“ پھر ایک دم میرے ذہن میں حمزہ کا خیال آیا۔ میرے دماغ میں تو سون والا کانٹا چبھ گیا تھا لیکن میں حمزہ کو اپنے ساتھ کیوں مشکلات میں گھسیٹ رہا تھا۔ اس نے محبت کا ثبوت دیا تھا اور میرے بہت منع کرنے کے باوجود میرے ساتھ یہاں تک چلا آیا تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ ساتھ والے بستر پر حمزہ گہری نیند سو رہا تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں گیس لیمپ جل رہا تھا، اس کی مدھم روشنی حمزہ کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ پچھلے چار پانچ برسوں کے ساتھ نے ہمیں ایک دوجے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ ہم ایک دوجے کو بہت اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی طرح حمزہ کو اپنے ساتھ آگے جانے سے روک دوں...... لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری مانے گا نہیں۔

اگلا دن میں نے سخت بے چینی میں گزارا۔ سون کا خیال بری طرح ذہن پر سوار تھا۔ اس کے خط کے الفاظ بار بار کانوں میں گونج رہے تھے۔ لکشون گاؤں میں ہر طرف مجھے اس کی نشانیاں بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں جھونپڑا نما مکانوں کے درمیان ٹیڑھی میڑھی گلیوں کو دیکھتا تو اس کے قدموں کے نشان دکھائی دیتے۔ درختوں کے تنوں کو دیکھتا تو سوچتا کہ وہ ان تنوں پر ہاتھ رکھ کر گزری ہوگی۔ دوپہر کے وقت میں پگوڈا کے پہلو میں وہ مختصر سا گھر دیکھنے چلا گیا جہاں سون راہبہ بننے سے پہلے چنکی کے ساتھ رہی تھی۔ میں ایک ایک شے کو دیکھتا رہا اور اس سے سون کی نسبت کو محسوس کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ حمزہ سے میری یہ کیفیت چھپی ہوئی نہیں ہوگی۔ مجھے شرمندگی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ حمزہ کے نزدیک میں ایک حقیقت پسند اور عملی رویہ رکھنے والا شخص تھا اور دوسروں کو بھی ایسے ہی رویے کی تلقین کرتا تھا لیکن لکشون گاؤں پہنچ کر میری دانائی کے سارے چراغ گل ہو گئے تھے اور میرے اندر سے ایک رومان پسند ٹین ایجر برآمد ہو گیا تھا۔ پچھلے دو تین روز میں میرے اور پیاؤ کے درمیان جو انکشاف انگیز گفتگو ہوئی تھی اس کی کچھ تفصیلات میں نے حمزہ کے گوش گزار بھی کر دی تھیں۔ تاہم کچھ باتیں فی الحال چھپائی تھیں۔

پیاؤ اپنی ساس کے ہمراہ آج پھر لی کے کلینک پر آنے والی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جب پیاؤ آئے تو حمزہ وہاں موجود نہ ہوتا کہ میں پیاؤ سے کھل کر بات کر سکوں۔

پیاؤ کے آنے کا وقت ہوا تو میں نے حمزہ کو لی کے ساتھ گاؤں کے شمالی حصے کے مختصر دورے پر بھیج دیا۔ وہاں ملیریا کے چار پانچ کیس موجود تھے۔ پیاؤ مقررہ وقت سے پہلے ہی آ گئی۔ اس کی ساس اب بہتر نظر آ رہی تھی۔ کلینک میں دو تین مریض موجود تھے انہیں نمٹا کر میں پیاؤ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی ساس کو ڈرپ لگا دی۔ پیاؤ کچھ روئی ہوئی سی لگتی تھی۔ آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ گاہے گاہے وہ ناک سے سوں کی آواز نکالتی تھی اور ناک کی سرخ پھنگی کو کاٹن کے پھول دار رومال سے رگڑنے لگتی تھی۔

وہ بولی۔ ''ڈاکٹر آختر! میں رات بھر تمہارے اور سون کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ کاش تم دونوں مل سکتے اگر تم سون کو قبول کر لیتے تو کتنی اچھی جوڑی ہوتی تمہاری۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک دوسرے کو بہت خوش رکھتے لیکن اب تو وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ پھر بھی میں تم سے ایک بات ضرور کہوں گی۔ کیا تم میری بات مانو گے؟''

''ماننے والی ہوئی تو ضرور مانوں گا۔''

اس نے بے ساختہ میرے دونوں ہاتھ تھام لیے اور بولی۔ ''پلیز ڈاکٹر آختر! تم ایک بار سون سے ضرور ملو۔ تم اس سے مل بھی سکتے ہو۔ تم ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ''چاتو چانگ لے'' جا سکتے ہو اور پھر کسی طرح ''بڑے پگوڈا'' میں بھی پہنچ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی اور کر سکے یا نہ کر سکے لیکن تم یہ ضرور کر سکتے ہو۔''

وہ اشک بار نظروں سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''میرے ملنے سے کیا ہو گا؟''

وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی...... لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ کچھ نہ کچھ بہتر ہو گا۔ شاید سون کے رویے میں تھوڑی بہت تبدیلی آ جائے۔ کم از کم اتنا ہی ہو جائے کہ وہ کسی وقت دوسرے بھکشوؤں کے ساتھ ساتھ گاؤں کا رخ کرنے لگے اور ہمیں اپنی شکل دکھانے لگے۔ وہ تو مٹھ (ہاسٹل) میں سے نکلتی ہی نہیں ہے۔ کسی سے ملتی ہی نہیں ہے۔ کہیں کوئی مل جائے تو بالکل اجنبی بن جاتی ہے۔ بس ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی ہے۔ یا پھر چھپاک سے مٹھ کے اندر اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس کی ماں دن رات اس کے لیے تڑپتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ میں مرنے سے پہلے ایک بار اپنی سون کو چھو لوں، اس کا ماتھا چوم لوں۔ اپنے ہاتھ سے بس ایک لقمہ بنا کر اسے کھلا لوں، لیکن وہ تو اتنی کٹھور ہو چکی ہے کہ روتی بلکتی ماں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔''

''میرے وہاں جانے سے کیا بہتری ہو گی پیاؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا۔ وہ نارمل زندگی کی طرف واپس تو شاید اب کبھی نہ آ سکے، لیکن اس کے پتھریلے سینے میں تھوڑا بہت جیون تو جاگ ہی سکتا ہے۔ ورنہ تو...... ورنہ تو وہ جس طرح دنیا سے دور ہو رہی ہے، فاقہ کشی کر رہی ہے، وہ زیادہ دیر زندہ ہی نہیں رہ سکے گی۔''

پیاؤ خاموش ہو گئی میں بھی خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ پیاؤ کی بوڑھی ساس غنودگی میں ہولے ہولے کھانسنے لگی۔ ایک بلی کسی ہدف کے پیچھے بھاگتی ہوئی میرے اور پیاؤ کے درمیان سے گزر گئی۔ باہر دیو قامت ناریل خاموش کھڑے تھے۔ میں نے پیاؤ سے کہا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ میں بڑے پگوڈا میں پہنچ کر سون سے مل سکوں گا۔''

''تم ضرور مل سکو گے۔'' وہ وجدانی انداز میں بولی۔ پھر وہ دھیمے انداز میں مجھے سمجھانے لگی کہ سون تک پہنچنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔

اگلے دو روز میں نے شدید سوچ بچار میں گزار دیے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اس سلسلے میں حمزہ سے بھی مشورہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہمیں اب یہاں آئے ہوئے چار دن ہونے کو آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ ہمارے واپس جانے کا وقت ہے، کیونکہ پاکستان میں ہمارے لواحقین نے پریشان ہونا شروع کر دیا ہو گا۔ اگلے روز ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے میری ساری سوچوں کو درہم برہم کر ڈالا۔

صبح سویرے کمپاؤنڈر لی سے ملاقات ہوئی تو اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''ڈاکٹر! تم نے کبھی پوئے دیکھا ہے؟''

''پوئے؟ یہ کیا چیز ہے؟'' میں نے اور حمزہ نے تقریباً ایک ساتھ پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں نے نہیں دیکھا۔'' وہ بولا پھر اپنی چربی دار تھوڑی کھجا کر کہنے لگا۔ ''پوئے ایک خاص قسم کا رقص ہوتا ہے، یا یوں کہہ لیں کہ ایک ڈراما آمیز رقص ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ قبائل میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی بڑی عمر کا شخص مر جاتا ہے تو اس کی آخری رسومات پر جھوٹے آنسو بہانے کے بجائے قدرے مختلف انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آخری رسومات میں خوشی کی ایک لہر شامل کر دی جاتی ہے۔ کل قریبی بستی آنگی میں ایک معمر شخص کی موت واقع ہوئی ہے۔ یہ شخص بستی کا کرتا دھرتا تھا بالکل جس طرح ''لان کون'' ہماری بستی کا مکھیا ہے۔ آج اس مرنے والے کی

آخر رسمیں ادا ہوں گی اور یہ سب کچھ پوئے کی شکل میں ہوگا۔ تم دونوں دوست دیکھنا چاہو تو یہ تمہارے لیے نادر موقع ہے۔"

لی کی باتیں سن کر حمزہ فوراً تیار ہوگیا۔ جب وہ تیار ہوگیا تو پھر مجھے بھی تیار ہونا پڑا۔ ہم دوپہر کے بعد لکشون گاؤں سے روانہ ہوئے۔ گاؤں سے پانچ چھ مزید افراد بھی جا رہے تھے۔ ان میں گاؤں کا مکھیا "لان کون" بھی تھا۔ اس نے حسب معمول رنگ دار لنگی زیب تن کر رکھی تھی اور ادھ کھلے شلوکے میں سے اس کی صحت مند توند جھانک رہی تھی۔ گاؤں میں ہماری طبی سرگرمیوں کے حوالے سے لان کون کی رائے ابھی تک غیر جانب دارانہ ہی تھی۔ اس نے ہماری تعریف کی تھی اور نہ ہی ہمارے کام میں کسی طرح روڑے اٹکائے تھے۔ ہاں لکشون میں موجود چھوٹے گرو اور اس کے چیلوں کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ ان کی نگاہوں میں ہم دونوں ڈاکٹر حضرات کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ یہ ناپسندیدگی بالکل منطقی اور سمجھ میں آ جانے والی بات تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم علاقے کے لوگوں کا علاج معالجہ کر کے گرو اور اس کے چیلوں کے پیٹ پر لات مار رہے تھے۔ اگر ہماری کوششوں سے لوگ سچ مچ جدید طریقہ علاج کی طرف متوجہ ہو جاتے تو ان منتروں، شعبدوں اور ٹوٹکوں کا کیا بنتا جن کے زور سے یہ لوگ روٹی کما رہے تھے۔ ذرا غور کیا جاتا تو یہ وہی صورتحال تھی جو اس سے پہلے ہم پسرور کے نواحی گاؤں "راجوالی" میں دیکھ چکے تھے اور اس جیسے دوسرے درجنوں دیہات میں دیکھ چکے تھے۔ وہی جاہلیت، وہی توہم پرستی، وہی حقائق سے فرار کا سنگین رجحان...... دونوں خطوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا لیکن مماثلت حیرت انگیز تھی۔

ہم لوگ دو بجے سجائے چھکڑوں کے ذریعے لکشون سے آنگی نامی بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ مکھیا لان کون اور گرو کشپال وغیرہ ایک چھکڑے میں سوار تھے جبکہ میں حمزہ اور لی چند دیگر "معززین" کے ساتھ دوسرے چھکڑے میں تھے۔ ہم روانہ ہونے لگے تو ایک فربہ اندام تھائی عورت تھل تھل کرتی ہوئی آئی۔ اس نے ایک بڑی رکابی میں پانچ بھنے ہوئے چوزے رکھے تھے۔ اس نے تین چوزے مکھیا لان کون والے چھکڑے میں دے دیئے اور دو ہمارے والے چھکڑے میں۔ سب لوگوں نے فوراً چوزوں کے حصے بخرے کر کے کھانا شروع کر دیا۔ ہم نے بھی دیکھا دیکھی ان کا ساتھ دیا۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ بھکشو لوگ گوشت وغیرہ نہیں کھاتے بلکہ کئی تو اتنے پرہیزگار ہوتے ہیں کہ پانی بھی باریک کپڑے

سے چھان کر پیتے ہیں کہ کہیں پانی کے ساتھ کوئی خوردبینی جان دار ان کے پیٹ میں نہ چلا جائے لیکن یہاں ہم دیکھ رہے تھے کہ چھوٹے گرو کشپال بڑی یکسوئی کے ساتھ چوزے کی ٹانگ اپنے دانتوں سے ادھیڑ رہے تھے۔ ان کے دو عدد چیلے بھی اس کار خیر میں برابر کے شریک تھے۔

ہمیں جنگل کے دشوار راستوں پر قریباً دس کلو میٹر سفر کرنا پڑا۔ دو چار مقام ایسے بھی آئے کہ چند افراد کو چھکڑوں سے اتر کر چھکڑوں کو دھکا لگانا پڑا۔ دور کے گھنے درختوں میں ہمیں گاہے گاہے بندروں کی جھلکیاں نظر آتی رہیں اور ان کی تیز چیختی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ بالآخر ہم آنگی بستی میں جا پہنچے۔ ہمیں تقریباً تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ سورج ڈھل چکا تھا اور اس کی تھکی ہاری کرنیں مغربی سمت کے دراز قامت درختوں کے اندر سے جھلک دکھا رہی تھیں۔

آنگی بستی سائز اور وضع قطع کے اعتبار سے لکشون گاؤں کی کاربن کاپی ہی تھی۔ ماسوائے اس کے کہ ہمیں مضافات میں ناریل اور تاڑ کے چند بلند درختوں پر مچانیں نظر آئیں۔ لی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہاں رات کے وقت جنگلی جانوروں کا خطرہ ہوتا ہے۔ بستی کو چاروں طرف سے نہایت گھنے اور چمکیلے سبزے نے گھیر رکھا تھا۔ گھاس پھونس اور ناریل کی چھال کے جھونپڑے ایک ڈھلوان پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ بستی میں گہما گہمی کے آثار صاف محسوس کیے جا سکتے تھے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ بستی کے درمیان درخت وغیرہ صاف کر کے ایک کشادہ گول میدان بنایا گیا تھا۔ ایسا ہی میدان میں نے لکشون گاؤں میں بھی دیکھا تھا۔ میں اور حمزہ دیکھ رہے تھے کہ آنگی بستی کا یہ میدان رنگ برنگے کاغذوں اور پھولوں وغیرہ سے سجایا گیا ہے۔ چند جگہوں پر رنگ دار کپڑے بھی لہرا رہے تھے۔ میدان کے ایک چھوٹے حصے کو رسیوں اور بانس کے ڈنڈوں کے ذریعے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ یعنی یہ ایک طرح کا پنڈال بن گیا تھا۔ یہاں بید کی بنی ہوئی خوبصورت چٹائیاں بچھی تھیں اور ان چٹائیوں پر چھوٹے چھوٹے گدے رکھے تھے جن میں یقیناً روئی اور پرندوں کے پر وغیرہ بھرے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ گدے (کشن) نسبتاً بڑے تھے اور ریشم کے کپڑے سے بنائے گئے تھے۔ ان چٹائیوں کے سامنے ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ یہاں بہت سے ساز رکھے تھے ابھی سازندہ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ رنگ دار لنگیاں پہنے ہوئے مقامی تھائی تقریب کے انتظامات میں مشغول تھے اور تیزی

سے ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ کچھ لڑکیاں بھی نظر آئیں۔ ان کے بالوں میں پھول سجے تھے اور ان کی کسی ہوئی دھوتیوں میں سے جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ ذرا حیرت اور توجہ سے مجھے اور حمزہ کو دیکھتی اور پھر مسکراتی اور سرگوشیاں کرتی آگے نکل جاتیں۔

مکھیا کے بیٹے نے آم کی کٹی ہوئی قاشوں سے ہماری تواضع کی۔ جب سے لان کون نے ہمارا تعارف ڈاکٹروں کی حیثیت سے کرایا تھا، وہ لوگ کچھ زیادہ مودب نظر آنے لگے تھے۔ احترام کے اظہار کے لیے مکھیا کے بیٹے نے ہمارے بارے میں چند فقرے بھی کہے۔ جن کا ترجمہ ہمارے لیے کمپاؤنڈر لی نے کیا۔ اس دوران میں چھوٹا گروکشپال بھی وہاں موجود تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھے تاہم اس نے منہ سے کوئی بات نہیں کہی۔ گروکشپال نے اس سارے سفر کے دوران میں ایک بار بھی ہم سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ واضح طور پر احساس کمتری اور رقابت میں مبتلا نظر آتا تھا۔

شام کے فوراً بعد پوئے کی تقریب شروع ہو گئی۔ اسٹیج کے ارد گرد درختوں کے ساتھ بہت سے ہنڈولے روشن کر دیئے گئے تھے، ان میں چربی جل رہی تھی۔ اس کے علاوہ درجنوں گیس لیمپ بھی موجود تھے۔ پورے پنڈال میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی بہت سی لڑکیاں ایک قطار میں نمودار ہوئیں۔ وہ ریشمی دھوتیاں اور نہایت مختصر کرتے پہنے ہوئے تھیں۔ ان کی لچکیلی کمریں عریاں تھیں۔ ہر ایک کے بالوں میں رنگ برنگ پھول سجے تھے۔ لی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بری لڑکیاں ہیں۔ یہ اپنی مہربان مسکراہٹوں کے لیے بڑی مشہور ہیں۔"

لڑکیوں کے عقب میں بہت سے مرد و زن جوق در جوق پنڈال کی طرف چلے آ رہے تھے۔ ان سب کے چہروں سے خوشی ٹپکی پڑ رہی تھی۔ ایک مرنے والے کی آخری رسومات کا یہ انداز ہمارے لیے بڑا حیران کن تھا۔ لڑکیاں پنڈال میں داخل ہو کر اسٹیج پر پہنچ گئیں اور انہوں نے رقص کے انداز میں اپنے سڈول جسموں کو تھرکانا شروع کر دیا۔ اسٹیج پر موجود سازندے زور و شور سے اپنے ساز بجانے لگے۔ گھڑیال، ڈھول، نقارے، ستار، بربط، پتہ نہیں کیا کیا کچھ بج رہا تھا۔ دودھیا روشنی میں حسین چہروں کی جگمگاہٹ اور اعضا کی شاعری بڑی خواب ناک معلوم ہوتی تھی۔

ہجوم کی صورت میں آنے والے لوگ پنڈال کے اندر داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ رسیوں

کے ساتھ ساتھ دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے تھے۔ پنڈال کے اندر صرف معززین اور مرنے والے کے قریبی رشتے داروں کو جانے کی اجازت تھی، یا پھر منڈے ہوئے سروں اور گیروے لباسوں والے بھکشو نظر آ رہے تھے۔ گروکشپال بھی ان میں موجود تھا۔

کچھ دیر بعد رقص ختم ہو گیا اور اسٹیج پر کوئی "ٹیبلو" قسم کی چیز پیش کی جانے لگی۔ ایک شہزادی کے حصول کے لیے دو شہزادے سرگرم نظر آئے اور درمیان میں کہیں کہیں ایک پری بھی دکھائی دیتی رہی۔

تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ قریبی بستیوں سے بھی بہت سے لوگ اس تقریب میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے ناریل کے درخت سے حاصل کیا جانے والا مخصوص نشہ آور مشروب پی رکھا تھا اور بہکے بہکے قہقہے لگا رہے تھے۔ مرنے والے کی روح کو اس صورتحال سے یقیناً خاصا "سکون" مل رہا ہو گا۔

ٹیبلو ختم ہوا تو ایک بار پھر رقص شروع ہو گیا۔ تاہم اس مرتبہ "یہ مخلوط رقص" تھا۔ کافر ادا تھائی حسینائیں اپنے مرد ساتھیوں کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کر رہی تھیں۔ ان کا انداز ہیجان خیز تھا۔ دوران رقص دو چار چنچل لڑکیوں نے ہم سے بھی آنکھیں چار کیں۔ ان کے اشارے معنی خیز تھے۔ لی نے مجھے اور حمزہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اجنبی ہونے کی وجہ سے تم ان شوخ لڑکیوں کی توجہ کا خاص مرکز بنے ہوئے ہو۔ اگر تم چاہو تو آج رات بآسانی کسی کے ساتھ دوستی کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے لی، ایسی دوستی کے بعد گروکشپال ہمیں زندہ چھوڑے گا۔"

لی مسکرایا۔ "ہاں، یہ بات تو ہے۔ وہ تمہاری موجودگی کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھ رہا لیکن پچھلے دو تین مہینوں میں ڈاکٹروں کی کئی ٹیموں نے علاقے کا دورہ کیا ہے۔ ان کی وجہ سے مقامی مریضوں کو اتنا فائدہ پہنچا ہے کہ رائے عامہ میں اچھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کشپال وغیرہ نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی ہوئی ہے۔

ہجوم اب بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ باجے گاجے کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اچانک ایک ہلچل سی محسوس ہوئی۔ ملی جلی آوازوں کا شور ہماری داہنی جانب سے سنائی دے رہا تھا۔ میں اور حمزہ کھڑے کھڑے کچھ تھک گئے تھے لیکن اس نئی ہلچل کو محسوس کر کے پھر سے تازہ دم ہو گئے۔ بہت سے لوگ ایک جلوس کی شکل میں پنڈال کی طرف

بڑھ رہے تھے وہ گا بجا رہے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ سوتر (مذہبی دعائیں) پڑھنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا یہ جلوس ہمارے سامنے پہنچا۔ لکڑی کی بنی ہوئی ایک بہت بڑی گاڑی تھی۔ اس گاڑی کو کم و بیش بیس افراد کھینچ رہے تھے۔ گاڑی کو رنگ برنگے کاغذوں اور کپڑوں سے سجایا گیا تھا۔ اس گاڑی پر ایک مینار سا تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مینار بھی مختلف آرائشی چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ گھنٹیاں، کھلونے، رنگین ٹوکریاں، سجاوٹی زیورات، پتہ نہیں کیا کچھ اس مینار پر ٹانک دیا گیا تھا۔ اس گاڑی کو کھینچنے والے لوگ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور اردگرد کے لڑکے لڑکیوں کی ٹولیاں مسلسل رقص کر رہی تھیں۔ لی نے ہمیں انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”اس گاڑی میں وہ میت ہے جسے یہاں جلایا جائے گا۔“

ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔ ہم اس گاڑی کو بھی کھیل تماشے کا حصہ ہی سمجھ رہے تھے۔ اس گاڑی کے پیچھے گیروے (سرخی مائل) کپڑوں والی ایک نسبتاً سنجیدہ جماعت چلی آ رہی تھی۔ یہ منڈے ہوئے سروں والے کئی درجن بھکشو تھے۔ وہ سر جھکائے بڑی متانت کے ساتھ مناجات پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھے لیکن ہنڈولوں کی روشنی میں ان کے سپاٹ چہرے باآسانی دیکھے جا سکتے تھے۔ ان کے گلوں میں زرد پھولوں کے ہار تھے اور ہاتھوں میں چمکتی مالائیں تھیں۔ اچانک میری نگاہ ایک چہرے پر پڑی اور مجھے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی اور ڈگمگاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے بھکشوؤں کے اس گروہ میں سون نظر آئی تھی۔ ہاں وہ سون ہی تھی۔ میں اس کی صورت کو لاکھوں چہروں سے الگ پہچان سکتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں تھی۔ وہ وہی تھی۔ وہ پہلے سے کچھ کمزور ہو چکی تھی۔ اس کی غیر معمولی چمکیلی جلد پہلے سے کچھ ماند پڑ چکی تھی۔ اس کے بالوں کا اسٹائل اور لباس بدل چکا تھا لیکن وہ سون تھی۔ جس نے چار پانچ سال پہلے بنکاک کی ایک جلتی بجھتی رات میں ایک خوبصورت پارک کے قریب ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے خدا حافظ کہا تھا۔

”حمزہ تم نے اسے دیکھا۔“ میں نے کانپتی آواز میں سرگوشی کی۔

”کسے؟ کون ہے؟“ حمزہ نے کہا اور میری نظر کے تعاقب میں نظر دوڑائی۔ اس نے سون کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے کیسے پہچان سکتا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ سون میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ وہ منڈے ہوئے سروں اور

گیرواں لباسوں کے پیچھے روپوش ہو گئی تھی۔ میں نے کہا ”حمزہ میرا خیال ہے کہ میں نے سون کو دیکھا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی میرے قدم اس باڑ کی طرف اٹھتے چلے گئے جس نے پنڈال کو باقی میدان سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ ان لمحوں میں مجھے یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ لی ہمارے آس پاس موجود ہے اور وہ میری کسی حرکت سے شک میں پڑ سکتا ہے۔ میں لوگوں کے درمیان سے دیوانہ وار راستہ بناتا ہوا پنڈال کے عین سامنے پہنچ گیا۔ میرے اردگرد تھائی مرد و زن تھے اور میں ان سب سے دراز قد تھا۔ رسیوں کے قریب پہنچ کر میں نے ایک بار پھر سون کو دیکھا۔ وہ دو ساتھی بھکشوؤں کے ساتھ اسٹیج کے زینے طے کر رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں بہت سے پھول سجے تھے، کلائیوں میں بھی سفید پھولوں کے گجرے تھے۔ اس کا جسم یقیناً پہلے ہی کی طرح دلکش تھا لیکن یہ دلکشی ایک لمبے سرخی مائل چغے نے ڈھانپ رکھی تھی۔

میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔ میں سون کو پکارنا چاہتا تھا لیکن میں ایسا کرتا تو یہ بات بڑی بے وقوفی کی ہوتی۔ پھر ابھی تک میرے ذہن میں یہ شبہ بھی موجود تھا کہ یہ سون ہے بھی یا نہیں بھکشوؤں کی جماعت زینے طے کر کے اسٹیج پر پہنچ گئی۔ وہ سب ایک قطار میں کھڑے ہو گئے اور ان کا رخ سامعین کی طرف ہو گیا۔ میرے دل پر بجلی سی گر گئی۔ سون اور میں آمنے سامنے تھے۔ بے شک ہمارے درمیان چالیس پچاس گز کا فاصلہ تھا اور ان گنت لوگ بھی تھے لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے چہرے پر ہماری نگاہ پڑ سکتی تھی۔

اور پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کائنات کی گردش تھم گئی ہے۔ مجھے صاف پتا چلا کہ سون کی نگاہیں مجھ پر پڑی ہیں اور دو تین سیکنڈ کے لیے جم گئی ہیں۔ ان دو تین سیکنڈ میں مجھے اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہراتا محسوس ہوا۔ ایک بجلی تھی جو چمکی تھی، ایک شعلہ تھا جو لپکا تھا، ایک صدا تھی جو تڑپ کر افق تا افق چلی گئی تھی لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا تھا، دو تین سیکنڈ کے اندر ہوا تھا اور ختم سا ہو گیا تھا۔ یکسر معدوم ہو گیا تھا۔ اب پھر میں اپنے سامنے ایک سپاٹ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ بالکل اجنبی، بالکل غافل، وہ میری جانب تو شاید دیکھ رہی تھی لیکن مجھے نہیں دیکھ رہی تھی، دور کہیں بہت دور، کائنات کی آخری حد سے پار نگاہ تھی اس کی۔

حمزہ بھی لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ میرے شانے پر تھا۔ ”دائیں طرف سے پانچویں لڑکی ہے نا وہ؟“ اس نے لرزتی آواز

میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ محویت سے دیکھتا رہا۔ بدھ بھکشوؤں نے چند سوتر پڑھے کچھ رسومات ادا کیں، اور پھر اسٹیج سے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے سجی سجائی گاڑی کے اردگرد ایک چکر لگایا اور دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر گاڑی کو چھوا ان ساری رسومات کی قیادت مضبوط جسم کا ایک سرخ و سپید بھکشو کر رہا تھا۔ اس کا سر معمول سے کچھ بڑا تھا اور چمک رہا تھا۔ یہ بھکشو اپنی جسامت کے علاوہ حرکات و سکنات سے بھی منفرد نظر آتا تھا۔ سون کو دیکھنے کے بعد میری نگاہ کسی جانب اٹھی ہی نہیں تھی، ورنہ اب تک مجھے اندازہ ہو چکا ہوتا کہ یہی وہ ایلش نام کی ہستی ہے جسے یہاں استاد گرو کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ استاد گرو کی عمر چالیس سے اوپر ہی رہی ہوگی۔

ایک نظر استاد گرو کو دیکھنے کے بعد میری نگاہ پھر سے دیوانہ وار سون کا طواف کرنے لگی۔ وہ اپنے گرو کی تقلید میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مختلف حرکات و سکنات کر رہی تھی اور اردگرد سے قطعی غافل ہو چکی تھی۔ اس کی یہ غفلت مجھے بہت شاق گزر رہی تھی۔ ایک عجیب سی بے کلی پورے جسم میں بھر گئی تھی۔ مجھے سون کی بوڑھی بیمار ماں کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ اس نے سون کے متعلق کہا تھا۔ ''وہ بہت دور نکل گئی ہے جی...... بس اور کی اور ہی ہوگئی ہے۔''

واقعی وہ اور کی اور ہوگئی تھی۔ بنکاک کی اس اٹھکیلیاں کرتی اور کھلکھلاتی لڑکی سے اس بھکشن (راہبہ) کا موازنہ کرنا بہت مشکل تھا۔ کمپاؤنڈر لی بھی اب ہمارے پاس آن کھڑا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم گرو کو نزدیک سے دیکھنے کے لیے پنڈال کے پاس چلے آئے ہیں۔ وہ ہمیں گرو کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے گرو کی تعریف کی اور بتایا کہ لوگوں کے دلوں میں استاد گرو کی عزت ہے اس کا خیال تھا کہ گرو کو بہت جلد ''لاما'' کا درجہ مل جائے گا۔

میرے کانوں میں لی کی آواز تو پڑ رہی تھی مگر میری ساری حسیات آنکھوں میں تھیں اور آنکھیں سون پر مرکوز تھیں۔ دفعتاً لی نے بھی سون کو دیکھ لیا۔ اس نے میرا بازو زور سے پکڑا اور اپنی انگلی کا رخ اسٹیج کی طرف کرتے ہوئے زور سے بولا۔ ''ڈاکٹر! وہ دیکھو...... وہ ہے چنکی کی بیوی سون! وہ دیکھو قطار میں دائیں طرف سے پانچویں، تمہیں نظر آ رہی ہے نا؟''

میں اسے کیسے بتاتا کہ مجھے اس کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔ میں بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اسی دوران میں سجی سجائی چوبی گاڑی کو آگ دکھا دی گئی۔ یقیناً کوئی تیل وغیرہ بھی ڈالا

گیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بلند ہو گئے اور ہر طرف دھواں گردش کرنے لگا۔ کھلونے، پھول، رنگ برنگ کاغذ بھی کچھ گاڑی کے ساتھ جل رہا تھا۔ میرے اور سون کے درمیان دھوئیں کی ہلکی سی چادر حائل ہو گئی تھی۔ میری بے تاب نگاہیں اس چادر سے الجھ رہی تھیں۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں صرف دو تین بار مجھے سون کی جھلک نظر آ سکی لیکن ہر بار وہ اپنی مصروفیات میں مگن نظر آئی۔

آدھ گھنٹے کے اندر اندر گاڑی جل کر بجھ گئی۔ بھکشوؤں کی جماعت گاڑی کی راکھ میں سے مردے کی ہڈیاں تلاش کرنے لگی لیکن ان بھکشوؤں میں مجھے سون دکھائی نہیں دی، نہ ہی استاد گرو ایلش نظر آیا۔

''وہ کہاں گئی؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

آگ کے بجھتے ہی پوئے کی رونق عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اسٹیج پر نوجوان مرد و زن والہانہ رقص کر رہے تھے ان میں سے بیشتر ناریل کے نشہ آور مشروب کے زیر اثر تھے۔ کئی نوخیز جوڑے ایک دوسرے سے لپٹ چمٹ بھی رہے تھے۔ تیل اور گوشت کے جلنے کی بو کو مختلف قسم کی تیز خوشبوؤں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ کچھ روز پہلے میں بنکاک کے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں گھوم رہا تھا۔ پٹایا بیچ، ہوٹل نیوٹرو کیڈرو اور پیٹ پونگ روڈ کے ہوش ربا مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے لیکن آج میں اس دور افتادہ جنگل میں لنگی پوش دیہاتیوں کی ایک روایتی تقریب میں شریک تھا۔ یہ دو مختلف قسم کے تجربات تھے اور ان کے درمیان صدیوں کا فاصلہ محسوس ہوتا تھا۔ میں نے حمزہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہم اچھلتے کودتے لوگوں'' کے درمیان سے راستہ بناتے، ادھر ادھر گھومتے رہے اور سون کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ یوں غائب تھی جیسے کبھی یہاں آئی ہی نہیں تھی۔ استاد گرو اور گرو بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پسینے اور حبس نے برا حال کر رکھا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا دماغ اور جسم بہت بڑے گرداب میں ہے اور چکرا رہا ہے۔ ایک انجانی کشش مجھے ایک خاص سمت میں کھینچتی چلی جا رہی تھی۔

❀❀❀

میں پوئے دیکھ کر اور سون کو دیکھ کر واپس لکشون گاؤں آ گیا تھا مگر میرا دل اور دماغ وہیں رہ گئے تھے۔ مجھے اپنے آس پاس سون کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری حالت نفسیاتی مریض کی سی ہو رہی تھی۔ ذہن میں کئی بار یہ خیال آ چکا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا میں تھائی لینڈ آتا ہی نہ...... کتنا اچھا ہوتا کہ رخشی مجھے یہاں آنے کے لیے مجبور نہ کرتی، جو ایک دبی دبی سی چنگاری پچھلے چار پانچ برس سے سینے میں سلگ رہی تھی وہ چنگاری ہی رہتی، ایسا شعلہ نہ بنتی جو میری جان کو پگھلا رہا تھا۔

اس رات میں اور حمزہ دیر تک جشن مرگ (پوئے) کی باتیں کرتے رہے اور سون کی باتیں کرتے رہے۔ حمزہ کا خیال تھا کہ سون اس تصور سے تھوڑی سی مختلف ہے جو اس کے ذہن میں تھا لیکن اتنی مختلف بھی نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران میں حمزہ نے یہ بات پورے اصرار کے ساتھ کہی کہ مجھے سون سے ضرور ملنا چاہیے۔ اسے یقین تھا کہ میرے ملنے سے سون کے دل و دماغ میں مثبت تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”حمزہ! تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ میری ایک بات مانو گے؟“

”ہاں...... کہو۔“

میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ”حمزہ! تم واپس چلے جاؤ۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اگر تم واپس نہیں جاؤ گے۔ تو پھر ہم دونوں واپس جائیں گے۔ شاید میں سون سے پھر کبھی نہ مل سکوں گا۔“ میں نے چند لمحے توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”تم جانتے ہی ہو کہ پیچھے کیا حال ہو رہا ہوگا۔ ممکن ہے کہ ہماری گمشدگی کا چرچا لاہور سے بنکاک تک پھیل گیا ہو...... یا پھیلنے والا ہو۔ تم جا کر معاملات کو سنبھال لو گے۔ اس کے بعد میرے لیے یہ ممکن ہو جائے گا کہ میں چند دن مزید یہاں رہ سکوں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، یہاں میرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں نے خطرے والا کوئی کام ہی نہیں کرنا ہے۔ تم میرے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتے ہو...... اگر......“

”میری بات سنو شاداب!“ حمزہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”جو اندیشے تمہارے ذہن میں ہیں، انہیں میں بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ ان میں سب سے بڑا اندیشہ یہی ہے کہ ہمارے گھر والے ہمارے بارے میں سخت پریشان ہوں گے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کاریگ (چنگڑا بان) سے ساری معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ کاریگ کے ذریعے ہمارا کوئی بھی پیغام صرف چار پانچ گھنٹوں میں بذریعہ فون ہمارے گھروں تک پہنچ سکتا ہے اور اگر ہم خط لکھنا چاہیں تو وہ بھی کاریگ کے ذریعے بذریعہ ڈاک ہو سکتا ہے اس کا جواب بھی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔“

اس کے بعد حمزہ نے تفصیلات بتانا شروع کر دیں کہ یہ کام کیسے اور کیونکر ممکن ہے۔ اس کے بعد اس نے پھر اپنا وہی پسندیدہ مقولہ دہرایا کہ ایک ایک اور دو گیارہ ہوتے ہیں اور وہ مجھے کسی صورت بھی ایک نہیں رہنے دے گا۔ چند منٹ کے اندر اس نے میرے سامنے دلائل کے انبار لگا دیے۔ ہر دلیل کا نچوڑ یہی تھا کہ ہم یہاں دونوں آئے تھے اور دونوں ہی واپس جائیں گے۔

اگلے روز میں نے چنچی کی بھابی پیاؤ سے پھر ملاقات کی۔ پیاؤ کو بھی یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کل آگی بستی میں برپا ہونے والے پوئے کے جشن میں بھکشوؤں کی جماعت کے ساتھ سون بھی موجود تھی۔ وہ بڑے اشتیاق سے مجھ سے سون کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہ کیسی تھی؟ اس نے مجھے دیکھا یا نہیں؟ اس کے تاثرات کیا تھے؟ اس نے کوئی بات کی یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ساری صورتحال من و عن پیاؤ کو بتائی۔ اس نے پھر آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔ کئی آنسو اس کے بھرے بھرے رخساروں پر بھی لڑھک گئے۔ ہر آنسو میں کرب تھا۔ ہر آنسو التجا کر رہا تھا کہ میں اتنی دور آ گیا ہوں تو اب ایسے ہی واپس نہ چلا جاؤں۔ میں کم از کم ایک بار تو سون سے ضرور ملوں...... ایک بار تو اس کے خیالات جاننے کی کوشش کروں۔

پیاؤ نے بے تاب لہجے میں کہا۔ ”ڈاکٹر آختر! وہ ہم سے بہت دور چلی گئی ہے اور گزرنے والا ہر لمحہ اسے مزید دور لے جا رہا ہے۔ اگر تم نے اس کے پیچھے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پھر اور دیر نہ کرو میں تو کہتی ہوں کہ آج ہی ”چا تو چانگ لے“ روانہ ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ’’میرا خیال تم سے مختلف ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس بارے میں کسی کو معمولی سا شک بھی ہو۔ کل لی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اس کے علاوہ گروکشپال کے چیلے بھی ہمیں مسلسل گھورتے رہے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ پروگرام کے مطابق دو تین دن مزید یہاں رکوں۔ اس دوران مریضوں کو دیکھنے کا کام بھی مکمل ہو جائے گا پھر نارمل انداز میں ہم یہاں سے ’’چاتنگ لے‘‘ روانہ ہو جائیں گے۔‘‘

❁❁❁

یہ پانچویں روز کی بات ہے۔ میں اور حمزہ چکڑا بان کاریگ کے ساتھ دشوار راستوں پر سفر کرتے ہوئے۔ ’’چاتو چاتنگ لے‘‘ پہنچے۔ لکشون گاؤں کے سردار ’’لان کون‘‘ نے ’’چاتنگ لے‘‘ کے سردار کے نام ایک محبت بھرا خط لکھ کر ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ اور یقین دلایا تھا کہ لکشون گاؤں کی طرح ’’چاتنگ لے گاؤں‘‘ میں بھی ہمیں ہر طرح کا تعاون حاصل ہوگا اور آرام ملے گا۔ اس خط کے علاوہ لان کون نے کچھ زبانی ہدایات بھی کاریگ کے ذریعے اپنے ہم منصب کے لیے روانہ کی تھیں۔

چاتو چاتنگ لے روانہ ہونے سے دو روز پہلے میں نے ایک خط والد صاحب کے نام لکھ دیا تھا اور ایک رخشی کے نام۔ حمزہ نے بھی ایک خط اپنے گھر کے پتے پر ارسال کر دیا تھا۔ کاریگ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ یہ تینوں خط دو چار دن کے اندر منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے اور اس کا ثبوت بھی خطوط کے جواب کی صورت میں مل جائے گا۔ خطوط میں ہم نے جوابی پتہ بھی لکھا تھا۔ یہ پتہ لکشون گاؤں سے قریباً اٹھارہ کلومیٹر دور کسی ’’لاکسور‘‘ نامی قصبے کا تھا۔ کاریگ نے یقین دلایا تھا کہ اگر ہمارے خطوط کا جواب آتا ہے تو اس کے دوست کے ذریعے یہ جواب ضرور ہم تک پہنچے گا۔ ہم دونوں نے اپنے خطوط میں پیشہ ورانہ مصروفیت کا ذکر ہی کیا تھا۔ ہم نے بتایا تھا کہ بنکاک سے قریباً چھ سو کلومیٹر آگے Maha Sarakham کے کچھ علاقوں میں ملیریا اور ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ ہم کچھ مقامی ڈاکٹروں کے ساتھ ان علاقوں میں جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہم اپنے اس دورے میں بہت کچھ سیکھیں گے بھی اور یوں مسلسل بارشوں کے سبب ہمارے مطالعاتی دورے کو جو Set Back ہوا تھا اس کا مداوا بھی ہو جائے گا۔ مجھے پتا تھا کہ رخشی زیادہ پریشان ہو گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے سے ہی پریشان تھی۔ بنکاک میں عین وقت پر پراسرار انداز میں ہماری واپسی کا پروگرام کینسل ہو جانا۔ یقیناً اس کے لیے پریشان کن رہا تھا۔

اب اس تاخیر پر مزید تاخیر ہو رہی تھی۔ بہرحال میں نے اپنے طور پر اسے تسلی تشفی دینے کی پوری کوشش کی تھی اور اسے جواب دینے کی بھی تاکید کی تھی۔

چاتو چاتنگ لے ایک سرسبز ڈھلوان پر واقع تھا۔ یہ کافی بڑی بستی تھی۔ کم و بیش تین سو گھر تو ہوں گے۔ تیس چالیس گھروں کی ایک ٹکڑی علیحدہ سے نشیب میں موجود تھی۔ بستی کے چاروں اطراف کھیت تھے۔ ایک ٹیلے پر شان دار پگوڈا موجود تھا۔ میں نے ابھی تک دیہاتی علاقے میں اتنا بڑا پگوڈا نہیں دیکھا تھا۔ اسے بعض لوگ ٹمپل بھی کہتے تھے۔ جب ہم چاتو چاتنگ لے پہنچے اس وقت بھی پگوڈا میں ڈھول بج رہے تھے اور نفیریوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ ملی جلی آوازیں عجیب سا تاثر پیدا کرتی تھیں۔ پگوڈا تک جانے کے لیے پتھر کے طویل زینے بنے ہوئے تھے۔ ان زینوں پر زعفرانی کپڑوں والے بہت سے بھکشو آ جا رہے تھے۔ پگوڈا کے اطراف میں مقدس پھولوں کی بھرمار تھی پگوڈا کے ساتھ ہی مٹھ کی وسیع عمارت بھی تھی۔ مٹھ کی چھتیں مخروطی تھیں اور بیرونی چار دیواری جو سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی تھی کافی بلندی تک چلی گئی تھی۔ مٹھ یعنی ہاسٹل سے پگوڈا تک جانے کے لیے علیحدہ سے ایک پگڈنڈی بنائی گئی تھی۔ یہ پگڈنڈی ایک سیدھی لکیر کی طرح نہیں تھی بلکہ دو بل کھانے کے بعد پگوڈا تک پہنچتی تھی، بالکل جیسے کوئی پہاڑی سڑک ہو۔

بستی کے سردار یا مکھیا کا نام عام مقامی ناموں سے قدرے مختلف تھا۔ اسے کاستو کہا جاتا تھا۔ کاستو گٹھے ہوئے جسم کا پستہ قد شخص تھا، تاہم اس کے شانے بہت چوڑے تھے اور گردن کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک شخص ہے۔ وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہمارے بارے میں جان چکا تھا۔ مکھیا لان کون کا خط دیکھ کر وہ اور بھی بااخلاق اور مہمان نواز نظر آنے لگا۔ اس بات کا پتہ ہمیں کافی بعد میں چلا کہ لان کون اور کاستو ہم زلف بھی ہیں۔

مکھیا کاستو نے ہمیں ایک صاف ستھرا اور ہوا دار مکان رہنے کے لیے دیا۔ یہ جھونپڑا نما مکان لکشون گاؤں والے مکان سے اس لحاظ سے بہت مختلف تھا کہ یہاں ہوا اور روشنی وافر مقدار میں آتی تھی اور یہ کوئی ہمارے مکان ہی کی بات نہیں تھی، یہ پوری بستی ہی روشن روشن اور ہوا دار تھی یا تو درخت یہاں ویسے ہی کم تھے یا انہیں کاٹ چھانٹ دیا گیا تھا۔ یہاں کھلا نیلا آسمان دکھائی دیتا تھا اور حبس بھی نہیں تھا۔ کھیتوں میں خچروں اور بیلوں وغیرہ کے ذریعے ہل چلائے جا رہے تھے۔ ڈھلتے سورج کی روشنی میں نیلگوں آسمان پر خوش نما

پرندے حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ناریل اور زرد کیلوں والے درختوں کے جھنڈ دور تک چلے گئے تھے، ان کے درمیان ایک چمکتی آبی گزرگاہ تھی۔ یہ مناظر دیکھ کر ہمیں بنکاک کا "پٹایا" ساحل یاد آ گیا۔

کھیا کاستو کے ساتھ بات چیت میں طے پایا کہ ہم جس مکان میں قیام پذیر ہوئے ہیں اسی کو اپنے کلینک کے طور پر استعمال کریں گے۔ اس کے علاوہ اگر ہم کہیں آنا جانا چاہیں گے تو ہمیں آمدورفت کی مکمل سہولت فراہم کی جائے گی۔ کاستو نے ہمیں یہ بتا کر تھوڑا سا حیران کیا کہ بڑے گرو واشو جت کو بھی ہماری یہاں آمد کے بارے میں معلوم تھا اور ان کی اجازت سے ہی ہمیں یہاں ٹھہرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ بہرحال کاستو نے اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی بتا دیا کہ ہم کسی بھکشو یا پگوڈا سے متعلق کسی شخص کا علاج معالجہ نہیں کریں گے۔ اگر کوئی ایسا کہے بھی تو ہمیں انکار کر دینا چاہیے۔ کاستو نے بتایا کہ یہ بھی بڑے گرو کا حکم ہے۔ تیسرے اہم گرو یعنی بڑے گرو واشو جت کے فرمودات کو یہاں بے حد تعظیم اور اہمیت دی جاتی تھی۔

ہم نے اگلے دن سے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ مریضوں کی ٹولیاں ہمارے عارضی کلینک کا رخ کرنے لگیں۔ زیادہ تر عورتیں تھیں جو اپنے بچوں کے عوارض لے کر آئی تھیں۔ بچوں میں پیٹ کے کیڑے، سوکھا اور اسہال وغیرہ کے امراض عام تھے۔ بڑوں میں ملیریا پایا جاتا تھا۔ قریباً وہی صورتحال تھی۔ جو اس سے پہلے ہم ملائیشیا اور تھائی لینڈ کے ان گنت دیہات میں دیکھ چکے تھے۔ توہم پرستی کا عالم بھی وہی تھا، بلکہ یہاں کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ یہ علاقہ شہری سہولتوں سے زیادہ فاصلے پر تھا، لکشون جیسے گاؤں کے برعکس اس علاقے میں سرے سے کوئی کلینک یا کمپاؤنڈر وغیرہ موجود ہی نہیں تھا۔ ہر قسم کی بیماریوں کا علاج راکھ مٹی اور پانی وغیرہ کے ذریعے کیا جاتا تھا یا پھر تعویذ گنڈے کا رواج تھا۔ یہ سارے عملیات دو سر کردہ بھکشو کرتے تھے۔ وہ اپنی کم علمی اور بدنیتی کے سبب بے شمار لوگوں کو قبروں میں پہنچا چکے تھے اور بہت سوں کو پہنچانے والے تھے۔

بہرحال اس صورتحال پر کڑھنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا تھا؟ یہ چلن ان علاقوں میں عام تھا۔ جہاں طبی سہولتیں موجود نہ ہوں وہاں اس قسم کے ٹونے ٹوٹکوں کو پروان چڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ کاریگ کی زبانی ہمیں معلوم ہوا کہ بڑے گرو واشو جت ایک مہینے میں صرف ایک بار مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ ورنہ یہ کام ان دونوں گروؤں کا ہے جنہیں

یہاں چھوٹے گرو اور استاد گرو کہا جاتا ہے۔

پہلے دن ہم نے جو مریض بچے دیکھے ان میں ایک دس بارہ سالہ لڑکا بھی تھا۔ اس کے سر میں رسولی تھی۔ جو بڑھتے بڑھتے کافی بڑھ چکی تھی۔ بظاہر سر پر کوئی زیادہ ابھار نظر نہیں آتا تھا۔ میری اور حمزہ کی متفقہ رائے کے مطابق یہ لڑکا بس چند مہینے کا مہمان تھا۔ رسولی کسی بھی وقت دماغ کے اندر پھٹ سکتی تھی۔ تاہم لڑکا جسمانی طور پر نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ استاد گرو وغیرہ اسے افیم دے رہے تھے جس کے سبب وہ سویا رہتا تھا اور درد بھی کم محسوس ہوتا تھا۔ لڑکے کے والدین خوش تھے کہ وہ اب صحت یاب ہو رہا ہے۔ خاص طور سے اس کی والدہ بار بار تشکر آمیز انداز میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتی تھی۔ وہ دونوں لڑکے کو ہمارے پاس اس لیے لے کر آئے تھے تاکہ ہم اسے کوئی طاقت کی دوا دیں جس سے "بیماری کے بعد کی کمزوری" جلدی سے دور ہو جائے۔

شیلن نامی اس لڑکے کو دیکھ کر میرا ایک پرانا زخم تازہ ہو گیا۔ مجھے راجوالی گاؤں کی وہ چھ سالہ شہناز یاد آ گئی جو اسی سے ملتے جلتے مرض میں مبتلا تھی۔ وہ مجھے بڑے لاڈ سے ڈاکٹر چاچا کہنے لگی تھی۔ اسپتال کے اس نیم روشن وارڈ میں وہ میری گود میں سر رکھ کر سو جاتی تھی۔ مجھ سے کھلونوں اور مٹھائیوں کی فرمائش کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جب تک اس کا ڈاکٹر چاچا اس کے پاس ہے اسے کچھ نہیں ہو گا۔ درد...... آنسو...... گھبراہٹ...... اس قسم کی کوئی شے اس کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی اور پھر ایک دن موت کا فرشتہ اپنی مخصوص بے رحمی کے ساتھ شہناز کو میرے ہاتھوں سے چھین کر لے گیا تھا۔ وہاں بھی والدین کی جاہلیت اور ہٹ دھرمی ہی اس معصوم کی موت کا بہانہ بنی تھی۔ شہناز کا والد آپریشن سے چند گھنٹے پہلے شہناز سمیت اسپتال سے فرار ہو گیا تھا۔ کافی عرصہ گزر چکا تھا لیکن میں، اور ڈاکٹر رخشی اس واقعے کو بھول نہیں سکے تھے۔ ابھی بھی کسی وقت بیٹھے بٹھائے ننھی شہناز کی صورت میری نگاہوں کے سامنے آتی تھی اور اس کی آخری گفتگو کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔

ہم نے شیلن نامی اس بچے کے والدین سے بھی وہی باتیں کیں جو ہمیں کرنا چاہئیں تھیں۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ بچے کا علاج کسی بڑے شہر کے بڑے اسپتال میں ہی ممکن ہے۔ وہ لوگ پہلے ہی کافی وقت ضائع کر چکے ہیں، اب مزید ضائع نہ کریں اور مریض کو شہر لے جائیں اس گفتگو میں کاریگ مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ والدین ہماری

باتیں سنتے رہے اور اثبات میں سر ہلاتے رہے۔

اس روز ہم نے شام سے کچھ دیر پہلے تک قریباً چار درجن مریض دیکھے۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اور حمزہ پگوڈا کی طرف چلے گئے۔ میری نگاہ اس بل کھائی پگڈنڈی پر تھی جو متھ سے براہ راست پگوڈا میں جاتی تھی۔ کارینگ کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بھکشو شام کے وقت متھ سے نکل کر پگوڈا کا رخ کرتے ہیں۔ مجھے اور حمزہ کو امید تھی کہ ہم آج پھر سون کو دیکھ سکیں گے، لیکن ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ متھ میں موجود سارے بھکشو اور طالب علم تو پگوڈا میں نہیں جاتے تھے۔

ہم دھڑکتے دل کے ساتھ پگوڈا کو جانے والی طویل سیڑھیوں پر پہنچے۔ حمزہ کے اندازے کے مطابق ان پتھریلی سیڑھیوں کی لمبائی دو فرلانگ سے کم نہیں تھی۔ کسی کسی جگہ ان کی چوڑائی تیس پینتیس فٹ تک تھی۔ پگوڈا کو جانے والے دوسرے راستے یعنی پگڈنڈی کی لمبائی بھی کم و بیش اتنی ہی تھی۔ ایک دو جگہوں پر یہ دونوں راستے بالکل متوازی چلتے تھے۔ سورج مغربی افق پر جھک چکا تھا۔ سرخ کناروں والے چھوٹے چھوٹے بادل شفاف آسمان پر تیر رہے تھے۔ سورج کی الوداعی کرنیں ناریل تاڑ اور پام کے درختوں کو چھو کر ان کے سایوں کو طویل تر کر رہی تھیں۔ سرسبز گھاس پر ان طویل سایوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی بہت بڑی کھڑکی میں طویل آہنی سلاخیں لگی ہوں۔ میں نے کھڑے ہونے کے لیے ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں پگڈنڈی اور سیڑھیوں کا درمیانی فاصلہ کم سے کم تھا۔ یہ فاصلہ ساٹھ ستر میٹر کے قریب ہوگا اور یہاں سے ہم پگڈنڈی پر سے گزرنے والوں کی شکلیں پہچان سکتے تھے۔

بستی کے لوگ ہمارے قریب سے گزر رہے تھے۔ ان کے انداز میں تعظیم تھی۔ کچھ نے ہمیں مخصوص انداز میں جھک کر سلام بھی کیا۔ سیڑھیوں کی طویل مسافت کے سبب کچھ لوگ ستانے کے لیے یہاں وہاں بیٹھے تھے۔ کچھ خوانچہ فروش بھی تھے جن کے خوانچوں میں ابلے ہوئے چنے، زرد رنگ کے پاپڑ مختلف پھلوں کی قاشیں وغیرہ تھیں۔ ابھی بھکشوؤں اور طلبہ کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم کچھ دیر کھڑے رہے پھر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر اردگرد کا نظارہ کرنے لگے۔ اوپر پگوڈا میں گھنٹیاں وغیرہ بجنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر اچانک حمزہ نے مجھے ٹہوکا دے کر کہا۔ ''وہ دیکھو۔''

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ دور متھ کے بغلی دروازے میں سے گیروا کپڑوں

والے بھکشوؤں کی قطار برآمد ہو رہی تھی۔ ان میں زیادہ تر بچے اور نوجوان تھے۔ ان کے صفاچٹ سر سورج کی آخری کرنوں میں دمک رہے تھے۔ اپنی آئندہ زندگی میں انہوں نے نفس کشی کی کئی منازل طے کرنا تھیں۔ انہیں گیان دھیان اور تپسیا کے سوا کچھ نہیں کرنا تھا۔ یہاں تک کہ کھانا بھی مانگ تانگ کر کھانا تھا۔ وہ روحانی سکون کے متلاشی تھے اور ان کے نزدیک روحانی سکون صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ انسان دنیاوی ہنگاموں سے یکسر الگ تھلگ ہو کر اپنی ضروریات کو محدود تر کر دے۔

قطار طویل ہوتی جا رہی تھی۔ یہ کم و بیش سو نفوس تھے۔ قطار کے آخر میں راہبائیں (بھکشنیں) تھیں۔ ان کے سروں کو گہری زعفرانی اوڑھنیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کے کھلے لبادوں نے انہیں ٹخنوں سے نیچے تک چھپا رکھا تھا۔ بڑے نظم و ضبط کے ساتھ یہ بھکشو اور بھکشنیں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے پگوڈا کی طرف بڑھنے لگے۔ میری نظر سون کو تلاش کر رہی تھی۔ دفعتاً میرا دل بے پناہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ سون قطار میں موجود تھی۔ اس کی قامت اس کی شبیہ گواہی دے رہی تھی کہ وہ سون ہے۔ حمزہ بھی آنکھیں سکوڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوں جوں بھکشوؤں کی قطار ہمارے قریب آتی گئی میرے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی پھر وہ وقت آیا جب ہمارے درمیان کم سے کم فاصلہ رہ گیا۔ میں سون کے خدوخال وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نازک گردن، اس کے چمکیلے رخسار کی جھلک، میں سیڑھیوں کے کنارے پر کھڑا ہو گیا تھا۔ امید تھی کہ شاید سون میری طرف دیکھ لے۔ وہ میرے عین سامنے سے گزر کر آگے چلی گئی...... لیکن ابھی امید موجود تھی۔ بیس تیس گز آگے جا کر پگڈنڈی کو یوٹرن لینا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ جب سون اس موڑ پر گھومے گی تو اس کی نگاہ سیدھی مجھ پر پڑ سکے گی۔ میں اس کے مڑنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ قطار کے ساتھ مڑی۔ میرا اندازہ بڑی حد تک درست تھا۔ سون اپنا سر ذرا سا اٹھاتی تو مجھے دیکھ سکتی تھی۔ میں انتظار کرتا رہا لیکن وہ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ سر جھکائے ہوئے گزر گئی۔ میرا جی چاہا چیخ چیخ کر اسے آوازیں دوں، سون مجھے دیکھو مجھے پہچانو...... میں ٹورسٹ ہوں...... میں تمہیں دیکھنے واپس آ گیا ہوں...... میں آ گیا ہوں۔

لیکن میں آواز نہیں دے سکتا تھا۔ میری زبان پر مجبوریوں کا قفل تھا۔

ساری رات سون کا تصور مختلف بہروپ بھر کر آتا رہا اور مجھے ستاتا رہا۔ ایک ایسی بے کلی تھی جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی ذہن میں یہ خیال آتا کہ شاید سون

نے مجھے ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ شاید پوئے کی تقریب میں بھی مجھے دھوکا ہی ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہ کافی فاصلے پر تھی میں نے چند لمحوں کے لیے اس کے تاثرات کو تبدیل ہوتے دیکھا تھا لیکن تاثرات کی اس تبدیلی سے کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسے میرا بصری واہمہ بھی قرار دیا جاسکتا تھا۔

اگلی شام اپنے کام سے فارغ ہو کر ہم پھر پگڈنڈی کی طول طویل سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ میں مسلسل دعا کر رہا تھا کہ آج بھی سون قطار میں موجود ہو۔ آخر سرخی مائل زرد کپڑوں والی قطار مٹھ کے چوبی دروازے سے برآمد ہوئی اور پگوڈا کی طرف روانہ ہوگئی۔ سون آج بھی قطار میں موجود تھی۔ آج مطلع بالکل صاف تھا اور روشنی کل سے بھی بہتر تھی۔ آخر وہ صبر آزما لمحے آئے جب سون ہمارے سامنے سے گزری۔ وہ حسب سابق سر جھکائے خاموشی سے گزر گئی۔ دل سے ہوک سی اٹھی۔ کچھ آگے جا کر قطار نے یوٹرن لیا۔ سون کا اور قطار کے دیگر شرکا کا رخ دو تین منٹ کے لیے ہماری طرف ہو گیا تھا، یہ دو تین منٹ بہت اہم تھے۔ میں سرتاپا آنکھ بنا ہوا تھا۔

اچانک ایک بار پھر کائنات کی گردش رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ سون نے تھوڑا سا سر اٹھایا ہے اور اس کی نگاہ ہماری جانب آئی ہے۔ ایک یا دو سیکنڈ جان لیوا تذبذب میں گزرے...... پھر یک لخت سینے میں سنسنی کی ایک بلند و بالا لہر دوڑ گئی۔ سون نے مجھے سیڑھیوں کے کنارے پر کھڑے دیکھ لیا تھا...... ہاں اس نے دیکھ لیا تھا۔ اس بات کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ''چلتی قطار'' میں ایک دو سیکنڈ کے لیے رک گئی تھی۔ اس کے پاؤں زمین نے تھام لیے تھے۔ اس کے پیچھے آنے والی لڑکیاں اپنی روانی میں اس کے ساتھ جڑ گئی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ سون کے عقب میں قطار کا ''ردھم'' ٹوٹ گیا تھا۔

ایسا بس تین چار سیکنڈ کے لیے ہوا پھر سون کے قدم حرکت میں آگئے۔ اس کے عقب میں سرخی مائل زرد قطار بھی حرکت میں آگئی۔ آٹھ دس قدم آگے جانے کے بعد سون نے ایک بار پھر ہولے سے سر گھمایا اور ہماری جانب دیکھا، اس کے بعد وہ موڑ مڑ گئی اور ہماری جانب اس کی پشت ہوگئی ''اس نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔'' حمزہ خوشی سے لرزتی آواز میں بولا۔

''ہاں اس نے دیکھا ہے۔'' میں نے تائید کی۔

''اب کیا ہوگا؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ ہوگا کہ لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو جائیں گے اور ان میں سے گرو کشپال کا کوئی چیلا نکل کر پوچھے گا۔ ''اوئے مشٹنڈو! تم یہاں کیا تا کا جھانکی کر رہے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارا انداز مشکوک قسم کا ہے۔''

ہم اپنی جگہ سے حرکت میں آئے اور دھیرے دھیرے پگوڈا کی طرف چل دیے۔ کل کے تجربے سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ پگوڈا سے بھکشوؤں کی واپسی رات آٹھ بجے کے قریب ہوتی ہے۔ اس وقت تک گہرا اندھیرا ہو جاتا تھا اور بھکشو لالٹینوں کی روشنی میں راستہ دیکھتے ہوئے واپس آتے تھے۔ اس وقت یہ ہرگز ممکن نہیں تھا کہ سون مجھے یا میں سون کو دیکھ سکتا، میرا دل ابھی تک شدت سے دھڑک رہا تھا۔ سون کے ٹھٹکنے کا انداز نگاہوں کے سامنے تھا۔

اگلے تین چار روز تک بھی ہمارا معمول یہی رہا۔ ہم دن بھر اپنی رہائش گاہ پر مریضوں کو دیکھتے۔ کارینگ کے ذریعے ان کے دکھ درد سنتے اور شام سے کچھ پہلے پگوڈا کی سیڑھیوں پر ٹہلنے نکل جاتے۔ سون مسلسل نظر آرہی تھی، لیکن اس دن کے بعد اس نے ایک مرتبہ بھی نگاہ اٹھا کر میری جانب نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل غافل اور لاتعلق ہوگئی تھی۔ وہ مشینی انداز میں قطار کے اندر چلتی ہوئی میرے سامنے سے گزرتی تھی اور پگوڈا میں چلی جاتی تھی۔ ''یہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔'' تیسرے دن حمزہ نے زچ ہو کر کہا۔

''مجھے کیا معلوم ویسے پوئے کے دوران بھی اس کا ردعمل یہی تھا۔''

''موجودہ صورتحال سے ثابت تو یہی ہو رہا ہے۔''

''اتنی زیادہ بے حسی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہتے ہیں کہ جہاں انتہا سے زیادہ گریز ہوتا ہے وہاں دراصل انتہا سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے۔'' حمزہ نے کہا۔

''کسی خوش فہمی میں نہ رہو اور نہ مجھے مبتلا کرو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ بے حسی اس قسم کی نہیں ہے جسے شاعر لوگ تغافل کا نام دیتے ہیں اور جو اکثر فلموں، ڈراموں کے اندر دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ تو کوئی بہت گہرائی میں اتری ہوئی کیفیت ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کے خوف کو حتی الامکان چھپاتے ہوئے کہا۔

''اس گہرائی میں اتری ہوئی کیفیت کا کب تک دور دور سے نظارہ کریں گے۔'' حمزہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ ہم مزید تین چار مہینے بھی اسی طرح ان

سیڑھیوں پر کھڑے ہوتے رہے تو وہ اسی طرح پتھر کی مورتی کی طرح ہمارے سامنے سے گزرتی رہے گی۔"

"تو پھر واپس چلیں پاکستان؟" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔ "میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔ سون سے ایک بار ملے بغیر تم واپس نہیں جاؤ گے اور نہ میں تمہیں چھوڑ کر جاؤں گا۔"

"پھر کیا چاہتے ہو؟"

"ہمیں کچھ پیش رفت کرنی ہوگی۔"

ایک بھکشو عورت اپنا مخصوص گیروا لبادہ پہنے ہمارے قریب سے گزری۔ وہ جواں سال تھی۔ پرکشش بھی نظر آتی تھی لیکن موٹے کپڑے کے گھیردار لباس نے ایک تھیلے کی طرح اس کے سراپے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بالکل ایسا ہی لباس تھا جو سون بھی پہنتی تھی۔ میں سوچنے لگا ایک وہ وقت تھا جب سون بنکاک میں تتلی بنی پھرتی تھی۔ مختصر ترین لباس زیب تن کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جن دنوں وہ میرے ساتھ گائیڈ کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ میں نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ میرے سامنے مناسب لباس پہن کر آئے گی۔ وہ مناسب لباس پہن کر آنے لگی تھی لیکن ایک دن میں حیران رہ گیا تھا اس نے اپنے مناسب لباس کے نیچے وہی بیہودہ پیراہن زیب تن کر رکھا تھا۔ آج وہی مختصر ترین لباس پہننے والی لڑکی سرتاپا کھدر پوش نظر آتی تھی۔

اندھیرا پھیلنے لگا تو دور اوپر پگوڈا میں دیپ جل اٹھے۔ نشیب میں بستی کے جھونپڑا نما مکانوں میں بھی ان گنت جگنو چمکنے لگے تھے۔ چولہوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اپنے سروں پر تنکوں کے بڑے بڑے ہیٹ سجائے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان میں بہت سے مرد و زن ایسے دکھائی دیتے تھے جن کے کندھوں پر بانس ٹکے ہوئے تھے۔ ایسے بانسوں کے دونوں اطراف پانی کی بالٹیاں ہوتی تھیں یا کوئی اور بوجھ ہوتا تھا۔ اس بوجھ کو ترازو کی طرح کندھے پر بیلنس کیا جاتا تھا۔ ہم سیڑھیاں اترے اور بکریوں کے ایک بڑے ریوڑ کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنی رہائش گاہ کی طرف بڑھنے لگے۔ حمزہ کے پاؤں کی چوٹ اب ٹھیک تھی، صرف معمولی سی لنگڑاہٹ رہ گئی تھی۔ راستے میں ہمیں تین بھکشو ملے وہ ہمارا راستہ چھوڑ کر ایک طرف سے ہو کر گزر گئے۔ ان کی آنکھوں میں بیگانگی اور بغض کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ ہم نے اندازہ لگایا تھا کہ

جن بھکشوؤں کا تعلق مٹھ اور پگوڈا وغیرہ کی انتظامیہ سے تھا ان کا رویہ ہمارے ساتھ ٹھیک نہیں تھا...... لیکن عام بھکشو اور طالب علم ہمارے ساتھ معاندانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بس اپنے کام سے کام تھا۔ ہاں بستی کے عام باشندے ہمیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، خاص طور سے وہ لوگ جنہیں ہمارے طبی مشوروں سے فائدہ پہنچا تھا۔

اپنی رہائش گاہ پر پہنچے تو درمیانی عمر کا ایک تھائی جوڑا وہاں موجود تھا۔ یہ اسی شیلن نامی لڑکے کے والدین تھے جسے برین ٹیومر کے سبب فوری علاج کی ضرورت تھی۔ ہم نے انہیں پر زور مشورہ دیا تھا کہ وہ بچے کو علاج کے لیے بنکاک لے جائیں۔ اب ان دونوں کا ذہن کسی حد تک بنا ہوا تھا بچے کی والدہ نے روتے ہوئے بتایا۔ "میں نے اپنا زیور بیچ دیا ہے۔ اب ہمارا کل سرمایہ دو بھینسے ہیں جن سے ہم ہل چلاتے ہیں۔ میرا شوہر ان میں سے بھی ایک بھینسا بیچنے کو تیار ہے۔ جونہی کچھ رقم اور اکٹھی ہو جاتی ہے ہم شیلن کو لے کر شہر چلے جائیں گے۔

حمزہ نے کہا۔ "اگر تم رقم کا انتظام جلدی کر لو تو پھر تم ہمارے ساتھ بھی شہر جا سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ پانچ چھ روز تک ہمارا بھی جانے کا پروگرام بن جائے۔"

لڑکے کا باپ بولا۔ "رقم کا انتظام تو شاید ہو ہی جائے گا مگر اتنی جلدی جانا ہمارے لیے شاید دشوار ہو۔"

"رقم کے علاوہ کیا مجبوری ہوگی؟" میں نے پوچھا۔ میاں بیوی خاموش رہے۔ ان کے سانولے زرد چہروں پر الجھن واضح تھی۔ میں نے کہا۔ "کیا کوئی تمہیں روکنے کی کوشش کر رہا ہے؟"

شیلن کے باپ نے گہری سانس لیتے ہوئے کارینگ کے ذریعے جواب دیا۔ "شیلن کا دادا شیلن کو شہر لے جانے کا مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ شیلن اب اچھا بھلا ہے۔ جو تھوڑی بہت کمزوری ہے وہ گروالیش کے علاج سے دور ہو جائے گی۔ وہ روزانہ اس کے لیے پگوڈا سے بھکشا لے کر آتا ہے اور اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہے۔ وہ بہت پیار کرتا ہے اس سے۔"

"یہ بھکشا کیا چیز ہے؟" حمزہ نے کارینگ کی وساطت سے لڑکے کے باپ سے پوچھا۔

اس نے کہا۔ "بھکشو اپنے کشکول میں جو کھانا مانگ کر لاتے ہیں وہ بھکشا کہلاتا ہے۔"

ہمارا عقیدہ ہے کہ اس میں بہت شفا ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم لوگوں کا کہنا ہے کہ شیلن کا دادا اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ لیکن یہ پیار نہیں دشمنی ہے۔ وہ اپنی نادانی کے سبب پوتے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دے گا۔ دیکھو! زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اس خدا کے دیے ہوئے علم کے مطابق بس اندازے لگا سکتے ہیں اور اندازہ یہی ہے کہ تمہارا بچہ صحت مند نہیں صرف صحت مند نظر آ رہا ہے۔ خدانخواستہ تم لوگوں نے دیر کی تو وہ تین چار ماہ کے اندر تمہیں خون کے آنسو رلا دے گا۔"

شیلن کی والدہ زار و قطار رونے لگی۔ اپنے اکلوتے بچے کے حوالے سے وہ کوئی تکلیف دہ بات سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔

مسئلے کی سنگینی کا احساس دلانے کے بعد میں نے میاں بیوی کو تھوڑی سی تسلی تشفی بھی دی اور انہیں ہدایت کی کہ وہ مزید سستی نہ دکھائیں۔

رات کو تیز ہوا چلتی رہی۔ اطراف کے جنگل سے سائیں سائیں کی آوازیں آتی رہیں۔ میں دیر تک بستر پر لیٹا رہا اور ہولے ہولے جھولتی ہوئی لالٹین کو دیکھتا رہا۔ مٹی کی دیواروں پر کمرے میں موجود مختلف چیزوں کے سائے حرکت کرتے رہے۔ میں سوچتا رہا، یہاں سے صرف دو ڈھائی فرلانگ کے فاصلے پر سون بھی مٹھ کے کسی حجرے میں موجود ہو گی۔ ہوا کی یہی سائیں سائیں وہ بھی سن رہی ہو گی۔ وہ مجھے دیکھ چکی تھی۔ یقیناً دیکھ چکی تھی؟ کیا مجھے دیکھنے کے بعد اس نے میرے بارے میں سوچا ہوگا؟ کیا اسے بھی ماضی کی گمشدہ آوازوں نے پکارا ہو گا؟ کیا اسے بھی...... ایک ادھورے بوسے کی بات یاد آئی ہو گی؟ میں سوچتا رہا اور سوچتے سوچتے ایک بے قرار نیند سو گیا۔

یہ اگلے روز شام کی بات ہے۔ اپنے مریضوں سے فارغ ہو کر ہم کارینگ کے ساتھ چہل قدمی کے لیے نکلنا چاہ رہے تھے کہ دو مہمان آ گئے۔ یہ بھکشو تھے۔ ایک لڑکی اور ایک مرد۔ دونوں اپنے مخصوص لباس میں تھے۔ گلے میں مالائیں تھیں۔ ایک ایک کشکول ان کے جسم کے ساتھ منسلک تھا۔ ان کے پاؤں ننگے تھے۔ وہ شکل و صورت سے کچھ پڑھے لکھے بھی نظر آتے تھے۔ جب انہوں نے گفتگو شروع کی تو اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ وہ دونوں انگریزی بول سکتے تھے، خاص طور سے لڑکی کی انگلش زیادہ اچھی تھی۔ وہ مرد کی نسبت ذہین بھی دکھائی دیتی تھی۔ دونوں قومیت کے لحاظ سے تھائی تھے۔

وہ دراصل تبلیغی راؤنڈ پر تھے۔ کم و بیش تیس چالیس ایسے ہی مزید جوڑے آس پاس کے گھروں میں پھیلے ہوئے تھے اور ہفتہ وار تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ لڑکی ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اس نے منہ وغیرہ ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دراصل ان لوگوں کا خیال تھا کہ مہاتما بدھ کا چیلا یا چیلی بن جانے کے بعد ایک انسان عام انسان نہیں رہتا وہ ایک اور روپ میں ڈھل جاتا ہے۔ ساری خواہشیں اور جبلتیں اس سے علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی ہمارے لیے تو لڑکی تھی مگر کارینگ کے لیے وہ فقط بھکشو تھی۔ اس حوالے سے بدھ مت کے مختلف فرقوں کے خیالات مختلف ہو سکتے تھے۔

لڑکی نے اپنی پلکیں جھکا رکھی تھیں۔ اس نے ہمیں مخاطب کیا اور تبلیغ کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے مشینی انداز میں بولنا شروع کیا۔ "محترم! ہمیں سوچنا چاہئے کہ جب ہم مصیبت اور تکالیف کی زندگی سے چھٹکارا پاتے ہیں تو ہمیں کیسی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیا یہ خوشی دائمی ہو سکتی ہے اور کیا یہ دائمی خوشی ہماری طرح دنیا کے لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بھی حاصل ہو سکتی ہے؟ ہمیں بڑے درد کے ساتھ سوچنا چاہئے کہ کتنا اچھا ہو، یہ خوشی، یہ سکون دنیا کے ہر انسان کو حاصل ہو جائے۔ یہ کوئی بہت دشوار کام بھی نہیں ہے۔ ہمیں بس اس زنجیریں توڑنی ہیں اور اس کے علاوہ تین مامن اور دس احکام ماننے ہیں۔"

تین مامن اور دس احکام کا تذکرہ میں نے پہلے بھی سنا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی سے تین مامن اور دس احکام کے بارے میں پوچھوں کہ وہ خود ہی بول اٹھی۔

"تین مامن یہ ہیں۔ میں بدھ میں پناہ لیتا ہوں۔ میں قانون (بدھ کی شریعت) میں پناہ لیتا ہوں۔ میں سنگھ میں پناہ لیتا ہوں۔"

پھر وہ ہمیں دس احکامات کے بارے میں بتانے لگی۔ یہ عام اخلاقی باتیں تھیں۔ مثلاً، میں قسم کھاتا ہوں کہ چوری نہیں کروں گا، جھوٹ نہیں بولوں گا، نشہ نہیں کروں گا، ناپاکی سے بچوں گا، کسی جاندار کو نہیں ماروں گا وغیرہ وغیرہ۔ لڑکی کا بھکشو ساتھی بس تائیدی انداز میں سر ہلانے پر اکتفا کر رہا تھا۔

ہم بظاہر توجہ سے سن رہے تھے لیکن دھیان ڈھلتی ہوئی شام کی طرف تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ لڑکی کا بیان جلد ختم ہو اور ہم معمول کے مطابق چہل قدمی کے لیے نکل سکیں مگر یہ سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ تین مامن اور دس احکام کے بعد، نوجوان مبلغہ دس

زنجیروں کی طرف آئی۔ دس زنجیروں کی وضاحت ذرا وقت طلب تھی۔ اس نے اپنے ساتھی بھکشو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ احکامات کی کتاب لے آئے۔

احکامات کی کتاب کسی پاس کے گھر میں پڑی تھی۔ بھکشو اٹھا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ میں اور حمزہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ہماری گلوخلاصی اتنی جلدی نہیں ہو گی لیکن پھر یکایک ہمیں بری طرح چونکنا پڑا۔ اپنے ساتھی بھکشو کے باہر جاتے ہی مبلغہ لڑکی کا انداز ایک دم بدل گیا۔ اس نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میرا نام ہوسنگ ہے۔ میں آپ سے ایک خاص بات کہنے کے لیے یہاں آئی ہوں۔''

ہم حیران نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔ ''آپ دونوں میں سے ڈاکٹر شاداب کون ہے؟''

''شاداب میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

''کیا میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہہ سکتی ہوں۔''

ڈاکٹر حمزہ صورتحال کا اندازہ پہلے سے لگا چکا تھا وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

لڑکی بے حد گمبھیر آواز میں بولی۔ ''میں منھ سے سون کا ایک اہم پیغام لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ میرا ساتھی تھوڑی ہی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔''

میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''جی کہیں میں سن رہا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''آپ کے لیے سون کا پیغام یہ ہے کہ آپ جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہاں سے چلے جائیں۔ ورنہ آپ کو شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''جو نقصان میرا ہو رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا۔''

وہ سنگین انداز میں بولی۔ ''آپ کچھ نہیں جانتے...... اور بے خبری میں مارے جائیں گے آپ گرو کشپال کی نگاہ میں آ چکے ہیں اور باہر سے آنے والے لوگوں کے لیے گرو کشپال کے ارادے کبھی بھی اچھے نہیں ہوتے۔ ابھی گرو کشپال کو معلوم نہیں کہ یہاں آنے سے آپ کا اصل مقصد کیا ہے، اس کے باوجود وہ آپ کے خلاف سخت نفرت محسوس کر رہا ہے، اگر اسے معلوم ہو جائے کہ آپ سون کی خاطر یہاں پہنچے ہیں تو وہ شاید چند منٹ کے

اندر آپ کی زندگی کا خاتمہ کر ڈالے۔''

میں نے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔ نجانے کہاں سے میری آنکھوں میں ایک دم نمی چلی آئی تھی۔ میں نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ''کیا ایک بار...... صرف ایک بار میں سون سے مل نہیں سکتا؟''

''ہوسنگ لی'' نامی اس لڑکی کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ''اب یہ ممکن نہیں رہا اور آپ سے التجا ہے کہ اس ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش بھی نہ کریں۔ اس میں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا اور ہاں...... ایک بات مجھے آپ سے اور بھی کہنا تھی۔'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''ہاں ہاں کہیں میں سن رہا ہوں۔''

''آپ شیلن نامی اس لڑکے کو شہر لے جانے کا مشورہ مت دیں۔ پگوڈا کے کچھ بزرگ بھکشو اور پروہت اس بات کا بہت برا منا رہے ہیں۔ وہ آپ کے اس خیال کو پگوڈا کے معالجوں کی توہین قرار دے رہے ہیں۔''

''یہ ان لوگوں کی نادانی ہے۔ انہیں ایسا نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم لڑکے کے والدین کو جو مشورہ دے رہے ہیں اس میں ہمارا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے۔ یہ سراسر انسانی ہمدردی ہے۔ ہم بستی کے بہت سے مریضوں کا علاج کر رہے ہیں یہ بھی بے لوث خدمت ہے۔ جو لوگ اپنی تکلیفیں لے کر ہمارے پاس آئے ہیں ان میں سے بہت سے اب خوش ہیں۔ آپ ان سے مل کر ان کی رائے جان سکتی ہیں۔ ان کی رائے جاننے کے بعد آپ بڑے گرو کو اس بارے میں بتا سکتی ہیں۔ آپ لوگوں کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے گرو قدرے مختلف مزاج کے شخص ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ حقیقت پسندی سے کام لیں گے تو ہماری مخالفت نہیں کریں گے۔''

ہوسنگ کے چہرے پر بیزاری اور عجلت کے تاثرات تھے۔ وہ بولی۔ ''پلیز مسٹر شاداب! میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی اور نہ ہی میرے پاس اس کا وقت ہے۔ آپ کے لیے سون کا پیغام بھی یہ ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ یہاں آنے کی کوشش نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے مس ہوسنگ! میں اس کی بات مان لیتا ہوں لیکن اس کے لیے سون کو کم از کم ایک بار مجھ سے ملنا ہو گا۔''

ہوسنگ نے قطعیت کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں محترم شاداب! آپ اس صورتحال کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں اور رومانیت میں کھوئے ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ جو انسان ایک مرتبہ تین ماسن اور دس احکام مان کر سنگھ میں شامل ہو جاتا ہے اور بودھ کی پناہ میں آ جاتا ہے، پھر باقی دنیا سے اس کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا ہر جذبہ، تعلق اور رشتہ اس کے ماضی کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا ہے۔ میں آپ کو واضح الفاظ میں یہ پیغام دے دینا چاہتی ہوں کہ اگر ماضی میں سون کے ساتھ آپ کی کوئی جذباتی وابستگی تھی، قطع نظر اس کے کہ وہ دوطرفہ تھی یا ایک طرفہ آپ اسے ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو میری یہ بات دکھ پہنچائے لیکن آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ سون زندہ ہوتے ہوئے بھی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔“

”یہ آپ کہہ رہی ہیں یا سون نے کہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ میں کہہ رہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”کیونکہ اگر سون کہے گی تو اس سے کہیں زیادہ سخت لفظ استعمال کرے گی۔“

میں نے کہا۔ ”مس ہوسنگ! اس وقت آپ کی حیثیت ایک پیغام بر کی ہے۔ اگر ہو سکے تو ایک میرا پیغام بھی سون تک پہنچا دیجئے۔“

ہوسنگ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے کہا۔ ”اسے کہہ دیجئے۔ کہ میں یہاں پر مر تو سکتا ہوں لیکن ایک بار اس سے ملے بغیر یہاں سے جاؤں گا نہیں۔“ میرا لہجہ اتنا اٹل اور گمبھیر تھا کہ خود مجھے بھی اس پر حیرت ہوئی۔

ہوسنگ کی نگاہوں میں ایک بار پھر خوف کی پرچھائیاں لرزیں۔ وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولی۔ ”یہ ناممکن ہے۔“

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ ایک بار مجھ سے مل لے...... بات کر لے...... اس کے بعد وہ جو فیصلہ کرے گی میں مان لوں گا۔“

”اب اس کا اپنا کوئی فیصلہ نہیں ہے۔“ ہوسنگ نے بے چینی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”اب اس کا ہر فیصلہ ساکھیہ منی (گوتم بدھ) کا فیصلہ ہے۔“

شاید وہ مزید کچھ کہتی لیکن اسی دوران میں ہوسنگ کا ساتھی بھکشو مٹی کے فرش پر ننگے پاؤں چلتا اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرانی کتاب تھی۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی اس کتاب کو بھکشو نے بڑے احترام سے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس نے کتاب ہوسنگ کو پیش

کرنا چاہی لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ اب کافی دیر ہو چکی ہے...... ہم پھر آئیں گے۔“

وہ دونوں اپنے مخصوص انداز میں چلتے ہوئے دروازے تک پہنچے اور پھر باہر نکل گئے۔

اس روز ہم سون کو دیکھنے پگوڈا کی خوبصورت سیڑھیوں پر نہ جا سکے۔ وجہ یہی تھی کہ ہوسنگ کے جانے تک گہرا اندھیرا ہو چکا تھا۔ رات کو میں اور حمزہ دیر تک تبادلہ خیال کرتے رہے۔ بے شک ہوسنگ کی گفتگو حوصلہ شکن تھی، لیکن پھر بھی کچھ پیش رفت تو ہوئی تھی۔ ایک رابطہ تو پیدا ہوا تھا۔ یہ بات بھی کچھ امید افزا تھی کہ شام کو جاتے ہوئے ہوسنگ نے دوبارہ آنے کا کہا تھا۔

ہم نے اس خطرے کے بارے میں بھی گفتگو کی جس کی نشان دہی ہوسنگ کر کے گئی تھی۔ یہ بات تو حقیقت تھی کہ چھوٹے گرو کشپال اور اس کے استاد ایش کے علاوہ ان دونوں کے چیلے چانٹے بھی ہمیں خشمگیں نظروں سے گھورتے تھے۔ انہیں ہماری کوئی بھی ادا بھاتی نہیں تھی۔ غالباً وہ بستی کے مکھیا ”کاستو“ کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور تھے کیونکہ ہماری حیثیت کاستو کے خصوصی مہمانوں کی تھی۔ اس کے علاوہ چونکہ بڑے گرو کا رویہ بھی ہمارے حوالے سے قدرے نرم تھا۔ لہٰذا وہ نہ چاہنے کے باوجود ہمیں ڈھیل دے رہے تھے۔

باتیں کرتے کرتے حمزہ نے ناریل کے پانی کی چسکی لی اور بید کی بنی ہوئی چارپائی پر ٹانگیں پسارتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو! میری بات ٹھیک نکلی نا۔ اس قسم کے کاموں میں تھوڑا بہت خطرہ تو موجود رہتا ہی ہے۔ اب ہم دو ہیں ایک اور ایک گیارہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اب ہم میں گیارہ گنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرا دھیان بار بار بڑے گرو کی طرف جاتا ہے۔ کیا ہم کسی طرح ان سے مل سکتے۔ لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے گرو ایک مختلف مزاج کے شخص ہیں۔ ان کا نام یہاں خصوصی احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہماری بات دھیان سے سنیں گے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ سون کے حوالے سے وہ ہماری بات سنیں گے؟“ حمزہ نے پوچھا۔

”نہیں یہ خوش فہمی تو مجھے نہیں لیکن یہ امید ضرور ہے کہ اگر بڑے گرو فطرتاً نیک دل

ہیں تو وہ ہمارے علاج معالجے کی مخالفت نہیں کریں گے اور ممکن ہے کہ شیلن کے حوالے سے بھی ان کی رائے اپنے ساتھیوں سے مختلف ہو۔ ہماری درخواست پر وہ اسے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔ ایک اچھا شخص کسی بھی ماحول میں ہو لیکن اچھا ہی سوچتا ہے۔"

دوسرے روز شام کو ہم پگوڈا کے اندر گئے۔ پگوڈا کے اندر کی دنیا عجیب تھی۔ وسیع و عریض دالان، منقش ستون، شفاف فرش اور فرشوں پر ننگے پاؤں دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے بھکشو، ان کی آوازیں پگوڈا میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ پگوڈا کے اندرونی حصے میں سحر انگیز خوشبوئیں سلگائی گئی تھیں۔ ذہن ایک طلسمی غنودگی میں ڈوب جاتا تھا۔ ایک بڑے ہال میں طویل قطار کے اندر ان گنت برتن رکھے تھے۔ زائرین ان برتنوں میں ایک سکہ ڈالتے تھے اور سوتر پڑھتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم بڑے گرو کا دیدار کر سکیں لیکن پگوڈا میں جا کر معلوم ہوا کہ فی الحال یہ ممکن نہیں۔

اگلی صبح ہم نے کلینک کھولا۔ حسب معمول انتظار گاہ میں تیس چالیس مریض موجود تھے۔ کارینگ نے باری کے حساب سے ان کے نمبر لگا رکھے تھے۔ دوسرا نمبر ہی شیلن کا تھا۔ رات سے اسے تیز بخار تھا اور سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ پچھلے چند دنوں کے میل جول سے شیلن ہمارے ساتھ کافی بے تکلف ہو گیا تھا اور انس محسوس کرتا تھا۔ اسے بس انجکشن سے ڈر لگتا تھا اور میں نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اسے انجکشن ہرگز نہیں لگاؤں گا۔ بس اتنی سی یقین دہانی پر وہ خوش تھا۔ اس معصوم کو کیا معلوم تھا کہ اسے انجکشن کی نہیں لمبی چوڑی چیر پھاڑ کی ضرورت ہے اور اس چیر پھاڑ کے بعد بھی اس کی زندگی بچنے کا امکان ففٹی ففٹی ہے۔ اکثر تھائی بچوں کی طرح شیلن بھی فٹ بال کا دیوانہ تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ کلینک میں آتا تھا اس وقت بھی اس کی بغل میں فٹ بال موجود ہوتا تھا۔ وہ مستقبل میں قومی فٹ بالر بننے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اسے تھائی لینڈ کے کئی مشہور فٹ بالرز کے نام یاد تھے اور کچھ ایسے اخباری تراشے بھی اس کے پاس موجود تھے جن میں ان کھلاڑیوں کی تصویریں تھیں۔

سر درد اور بخار وغیرہ کے لیے ہم شیلن کو ڈسپرین دینے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے۔ ڈسپرین بھی اب ہمارے پاس تھوڑی مقدار میں رہ گئی تھی۔ اسے ہلکی سی اینٹی بائیوٹک بھی دی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ معمول کا بخار تھا۔ اسے دو تین دن میں ٹھیک ہو جانا تھا۔ شیلن کی والدہ اظہار تشکر کے لیے ہمارے لیے کچھ نہ کچھ لے آتی تھی۔ کبھی کوئی پکی

ہوئی چیز، کبھی کوئی پھل وغیرہ۔ کچھ چیزیں ہمیں ناپسند بھی ہوتی تھیں لیکن دل رکھنے کے لیے ہم ان کی تعریف کرتے تھے اور کھا بھی لیتے تھے۔ آج وہ کوئی دلیا قسم کی چیز لائی تھی۔ کارینگ نے بتایا کہ یہ میٹھا پکوان ہے اور اس میں دودھ، تازہ کیلے اور مکئی وغیرہ استعمال کی جاتی ہے۔ ہم نے لکڑی کے چمچوں سے تھوڑا تھوڑا کھایا۔ یہ سویٹ ڈش واقعی مزے دار تھی۔

رات کوئی نو بجے کا وقت تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں اور حمزہ اپنے کمرے میں موجود تھے۔ کارینگ کہیں سے ایک مقامی بانسری نواز کو ڈھونڈ لایا تھا۔ وہ ہمارے پاس ہی بید کی چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا اور لوک دھنیں سنا رہا تھا۔ یہ وہ مقامی گیت تھے جن میں ان خوبصورت بارانی جنگلات کے تمام رنگ اور مناظر سمٹ آئے تھے۔ ان گیتوں میں ناریل اور کیلے کے جھومتے درختوں کا ردھم تھا۔ ان کنواریوں کے بدن کی مہک تھی جو بالوں میں پھول سجائے ندیوں کے پانی میں پاؤں ڈبو کر بیٹھتی ہیں اور شیلن جیسے ان معصوم بچوں کی ہنسی تھی جو بادوباراں کی راتوں میں ماؤں کی آغوش میں چھپ کر کہانیاں سنتے تھے۔ ہم چائے کی چسکیاں لیتے رہے اور بانسری کی مسحور کن آواز کو روح کی گہرائی سے محسوس کرتے رہے۔

اچانک تربتر کپڑوں والے دو افراد دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان کے چہروں پر ہیجانی کیفیت تھی۔ ایک شخص نے کارینگ کو مخاطب کر کے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ کارینگ کے چہرے پر بھی گہری تشویش نظر آنے لگی۔ کارینگ نے ہمیں بتایا۔ "شیلن کی طبیعت اچانک سخت خراب ہو گئی ہے۔ اس نے خون کی الٹی کی ہے اور بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" حمزہ نے پوچھا۔

"اپنے گھر میں......"

ہم نے چھتریاں ڈھونڈنے میں بھی وقت ضائع نہیں کیا اور میڈیکل باکس لے کر دوڑ پڑے۔ دو چار منٹ میں ہم شیلن کے گھر میں تھے۔ وہاں رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ اردگرد کے لوگ بھی موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ ہم لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے شیلن تک پہنچے۔ وہ بے حرکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ باچھوں سے خون کی ایک پتلی لکیر نکل کر گردن تک چلی گئی تھی۔ میں نے دیکھا شیلن کی مصیبت زدہ والدہ چارپائی کے پائے سے سر ٹکرا ٹکرا کر رو رہی ہے۔ میں نے شیلن کی نبض دیکھی وہ بہت مشکل سے محسوس

کی جا سکتی تھی لیکن وہ زندہ تھا۔

ہم نے رونے دھونے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر پیچھے ہٹایا اور پوری تن دہی سے شیلن کو سنبھالنے میں لگ گئے۔ شیلن کا بی پی بہت نیچے آ گیا تھا، نبض کی رفتار بھی سست تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس ناکافی دوائیں اور نہ ہونے کے برابر سہولتیں تھیں جو کچھ ہمیں میسر تھا اس کے ساتھ ہم شیلن کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگے۔ لواحقین نے بتایا کہ شیلن شام سے ہی الٹیاں کر رہا تھا، ایک دو پیلے پاخانے بھی آئے تھے۔ میں نے اس کے والد سے کہا۔ ''اگر ایسی بات تھی تو تم نے آ کر بتایا کیوں نہیں۔''

وہ کچھ نہیں بولا بس آنسو پونچھتا رہا۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے ایسی کوئی دوا نہیں دی تھی جس سے بچے کی یہ حالت ہو جاتی۔ اینٹی بایوٹک بھی بہت ہلکی تھی میں نے احتیاطاً اس کے ساتھ اینٹی الرجی بھی دے دی تھی۔

گھر سے باہر لوگوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ کرخت آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ کچھ موقع پرست بچے کی صورت حال کے لیے ہمیں مطعون کر رہے ہیں۔ ہم نے باہمی مشورے سے شیلن کو دو تین انجکشن دیئے۔ ڈرپ بھی لگا دی۔ اس کی حالت جوں کی توں تھی، شکر کا مقام تھا کہ مزید نہیں بگڑی تھی۔ جو آخری انجکشن دیا تھا اس کا اثر مکمل طور پر ظاہر ہونے میں کم و بیش 25 منٹ لگنے تھے۔ اس کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا تھا۔ کمرے سے باہر شور و غل بڑھتا جا رہا تھا۔ یکا یک سات آٹھ افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے ان میں دو تین بھکشو بھی تھے۔ سب سے آگے کشپال نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور آنکھیں باہر کو ابلی پڑتی تھیں۔ وہ ہمیں مخاطب کرتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔ ''گو...... گو آؤٹ...... یو کل دا چائلڈ...... گو آؤٹ!''

میں نے کہا۔ ''چھوٹے گرو! آپ اس لہجے میں بات مت کریں۔ جہاں تک بچے کی حالت کا تعلق ہے، ہم نے اسے کوئی ایسی چیز نہیں دی جو......''

''منہ بند کرو۔'' کشپال نے چیخ کر میری بات کاٹی۔ ''چلے جاؤ ہمارے علاقے سے چلے جاؤ۔ تم دونوں گمراہ کر رہے ہو۔''

وہ بھنایا ہوا آگے بڑھا، اس نے شیلن کو لگی ہوئی ڈرپ اتارنا چاہی میں نے اس کا ہاتھ روکا۔ اس کے ایک چیلے نے زوردار دھکا دے کر مجھے پیچھے ہٹا دیا۔ کشپال نے ایک جھٹکے سے نیڈل کھینچ کر پرے پھینک دی۔ شیلن کے سرہانے جو دو تین دوائیں رکھی تھیں،،

ایک دوسرے شخص نے دیوار پر پٹخ کر توڑ دیں۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ معمر شخص شیلن کا دادا تھا۔ اس کا شمار بھی ہمارے مخالفین میں ہوتا تھا۔ شیلن کی حالت کے پیش نظر ہم دونوں میں سے کوئی بھی یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا، مگر مخالفین ہمیں دھکے دے کر نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔

میں نے کشپال سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہاں خود نہیں آئے، بچے کے ماں باپ نے بلایا ہے۔ آپ ہمیں کہنے کے بجائے ان سے پوچھیں۔''

کشپال نے معمر شخص یعنی شیلن کے دادا کی طرف دیکھا۔ دادا دو قدم آگے بڑھا اور اس نے بڑے تلخ لہجے میں شیلن کے والدین سے چند باتیں کیں۔ غصے کے سبب اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔ شیلن کے والد نے اشک بار نظروں سے میری طرف دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے الفاظ تو ہماری سمجھ میں نہیں آئے لیکن انداز اور لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بھی سخت مایوس ہے اور ہمیں گھر سے جانے کے لیے کہہ رہا ہے۔

اسی دوران میں ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ یہ بڑے سر اور مضبوط جسم والا وہی گرو تھا جسے میں نے پوئے کی ہنگامہ خیز تقریب میں بھی دیکھا تھا۔ یہ استاد گرو ایش تھا۔ پوئے کی تقریب میں میں بس دور ہی سے ایش کا ''دیدار'' کر سکا تھا لیکن اب میں اسے نزدیک سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ہلکی بادامی آنکھیں اپنے اندر بہت گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ سمندر کی طرح اوپر سے سکون لیکن اندر سے طوفان خیز۔ اس کے شفاف منڈے ہوئے سر پر رگیں ابھری ہوئی تھیں اور نمایاں دکھائی دیتی تھیں۔

وہ میرے سامنے آ کر دھیمے لہجے میں کچھ بولا۔ اس نے جو کچھ کہا اس کا ترجمہ ایک لمبی ناک والے شخص نے کیا اور کہا۔ ''استاد گرو فرما رہے ہیں کہ وہ بچے کے روگ کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ بچے کا علاج بھی ہو رہا ہے۔ آپ لوگ اس علاج میں اپنا علاج شامل کریں گے تو بچے کے لیے اچھا نہیں ہوگا اور آپ کو بھی پریشانی اٹھانا پڑے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس معاملے کو ہم پر چھوڑ دیں۔''

یوں تو گرو ایش نے یہ باتیں بڑے دھیمے اور ملائم لہجے میں کہی تھیں، لیکن اس ملائم لہجے کے پیچھے کیا چھپا ہوا تھا اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گرو ایش ایک گہرا شخص نظر آتا تھا۔

اچانک معلوم نہیں کیسے مجھے یاد آیا کہ ''گرو ایش'' کا نام میں نے کچھ دن پہلے بنکاک

میں بھی سنا تھا۔ چنکی کی روداد سناتے ہوئے اس کے دوست ڈی ہوپ نے بتایا تھا کہ چنکی نشے کی حالت میں کسی گرو ایش کو گالیاں دیتا ہے اور اسے استرے سے قتل کر دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آج میں اس ایش نام کے شخص کو اپنے روبرو دیکھ رہا تھا۔ یقیناً یہ وہی ایش تھا۔

ایش نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک بار پھر کہا۔ ''یو گو...... یو گو......''

ایک ڈاکٹر کے لیے یہ بڑی اذیت کے لمحے ہوتے ہیں، وہ اپنے مریض کی حالت دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس کی ضرورت بھی سمجھ رہا ہوتا ہے۔ مریض کے لاعلم لواحقین کی ناقص اور خطرناک رائے کو تسلیم کرنا اس کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال تھی۔ ہم جانتے تھے کہ بچے کو ہماری سخت ضرورت ہے لیکن وہ لوگ ہمیں نکالنے پر تلے ہوئے تھے ایک دو منٹ میں ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ کشپال کے فربہ اندام چیلے ہمیں دھکے مارنے لگے۔ اس دھکم پیل میں حمزہ کے ''بی پی آپریٹس'' کو بھی نقصان پہنچا۔

اس سے پہلے کہ صورتحال مزید خراب ہو جاتی اور کچھ لوگ باقاعدہ ہاتھا پائی پر اتر آتے ایک طرف سے کھیا کاستو برآمد ہوا۔ وہ ہمارے اور مشتعل بھکشوؤں کے درمیان آ گیا۔ اس نے اشاراتی زبان میں ہمیں سمجھایا کہ فی الحال ہمارا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اس کے چند فقروں کا ترجمہ کارینگ نے بھی ہمارے لیے کیا۔ مطلب یہی تھا کہ کشپال کے مشتعل چیلے فساد پر آمادہ ہیں ہمیں فی الحال یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

مصیبت زدہ شیلن کے لیے ہم جو کچھ کر سکتے تھے اس میں سے نوے فیصد ہم نے کر دیا تھا۔ اس کے خوابیدہ چہرے پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے ہم باہر نکل آئے۔ میرا دل مسلسل شیلن کے لیے دعا گو تھا۔ ہم کھیا کے ساتھ واپس اپنی رہائش گاہ پر آ گئے۔ بارش کے سبب ہمارے کپڑے بری طرح بھیگ چکے تھے اور سردی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم نے فوری طور پر کپڑے بدلے، کارینگ نے ہمارے لیے قہوہ بنایا۔ کھیا کاستو ہمارے ساتھ ہی رہا اور تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ موجودہ صورتحال میں ہمارا بچے کے پاس رہنا بہت ضروری تھا، اور اگر وہ اب بھی ہمیں وہاں پہنچانے کی کوشش کر سکتا ہے تو ضرور کر دے۔ کاستو بس سر ہلا کر رہ گیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کشپال اور اس کے استاد ایش کے سامنے اس کا زور بھی نہیں چلتا۔

وہ رات ہم نے سخت بے چینی میں گزاری۔ صبح سویرے یہ اطلاع ملی کہ شیلن کی حالت اب بہتر ہے۔ اس کی بے ہوشی نیند میں بدل چکی تھی اور اس نے چند باتیں بھی کی تھیں۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ اگر شیلن کو کچھ ہو جاتا تو ہمارے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جانا تھی۔ ہمارا دست راست اور معاون چکڑا بان کارینگ بھی اس صورتحال پر خاصا مایوس نظر آتا تھا۔ اس نے زبان سے تو نہیں کہا تھا لیکن بہ زبان خاموشی وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔

اس روز ہمارے کلینک میں آنے والے مریضوں کی تعداد میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ رات والے واقعے کی وجہ سے اہل بستی میں زبردست غیر یقینی اور ہچکچاہٹ پائی جاتی تھی۔ شام کو ہم سیر کے لیے بھی نہیں نکلے۔ کھیا کاستو ہمارے بارے میں فکر مند تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ کاستو کے دو چار آدمی مسلسل ہماری رہائش گاہ کے اردگرد موجود تھے۔ بظاہر ان کے پاس اسلحہ وغیرہ نہیں تھا لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ ہماری نگہداشت کے لیے ہمارے آس پاس موجود ہیں۔ اندھیرا ہوا تو میں نے کارینگ کو ایک مقامی عورت سے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ دونوں ہمارے جھونپڑا نما مکان کے پچھواڑے کھڑے تھے، عورت کے ساتھ دو بکریاں تھیں۔ وہ بظاہر بکریوں کو چراتے ہوئے وہاں سے گزری تھی اور کارینگ سے باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔ نجانے کیوں مجھے یوں لگا کہ وہ کوئی اہم بات کہہ رہی ہے۔

دو چار منٹ بعد سبز لنگی اور نیلے کرتے والی وہ عورت بکریوں کو ہانکتے ہوئے آگے نکل گئی۔ اس کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے تک میں نے کارینگ کو کچھ خاموش دیکھا۔ یہی کیفیت حمزہ نے بھی محسوس کی۔ ہمارا کھانا کھیا کاستو کے گھر سے ہی آتا تھا۔ (ویسے کھانے پکانے کا سامان ہماری رہائش گاہ پر بھی موجود تھا۔ اس انتظام سے کارینگ فائدہ اٹھاتا تھا اور عموماً ہمارے لیے ناشتہ خود ہی بنا لیتا تھا) اس روز رات کا کھانا دال چاول کھا کر ہم فارغ ہوئے تو کارینگ برتن سمیٹ کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے۔ تم کچھ چپ چپ ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''منہ چھوٹا اور بات بڑی ہے جناب! ڈرتا ہوں کہ کہیں لپیٹ میں ہی نہ آ جاؤں۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس بات کو اپنے تک ہی رکھئے گا۔''

میں نے کہا۔ ''میں اپنی اور حمزہ کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم جو کچھ بتاؤ گے ہم

تک ہی رہے گا۔"

وہ کسی مزید تمہید کے بغیر بولا۔ "ابھی جو عورت آئی تھی، یہ شیلن کے گھر کے ساتھ والے گھر میں رہتی ہے۔ یعنی پڑوسن ہے۔ اسے یقین ہے کہ رات کو شیلن کی حالت یونہی نہیں بگڑی تھی۔ اس میں کشپال کے ایک چیلے راہل اور اس کی بیوی کا ہاتھ ہے۔ یہ راہل نامی چیلا بھی شیلن کا پڑوسی ہے۔ راہل کی بیوی کبھی کبھی شیلن کے گھر جاتی ہے۔ کل شام بھی وہ شیلن کے گھر گئی اور کافی دیر تک شیلن کی ماں کے پاس رسوئی میں بیٹھ کر باتیں کرتی رہی۔ اس وقت شیلن کی ماں شیلن کے لیے ادرک اور دال کی کھچڑی بنا رہی تھی۔ شیلن کی ماں شیلن کو پانی پلانے کے لیے رسوئی سے باہر گئی تو اس وقت بھی راہل کی بیوی رسوئی میں موجود تھی۔ عورت نے بتایا ہے کہ اس نے راہل کی بیوی کو رسوئی میں دیکھا۔ وہ چولہے کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور کچھ کر رہی تھی پھر شیلن کی ماں کے قدموں کی آواز آئی تو جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ضرور شیلن کے کھانے کے ساتھ کچھ کیا تھا۔ عورت کو شک تو اسی وقت پڑ گیا تھا بعد میں جب شیلن کی طبیعت سخت خراب ہوئی تو عورت کو یقین ہو گیا۔"

کارینگ نے جو کچھ بتایا اس میں وزن تھا۔ میرے اور حمزہ کے ذہن میں پہلے سے اس قسم کا شک موجود تھا۔ شیلن کی حالت دیکھ کر فوراً فوڈ پوائزننگ کا خیال ذہن میں آتا تھا۔ میں نے اور حمزہ نے کارینگ سے کچھ مزید تفصیلات معلوم کیں۔ آخر میں کارینگ بولا۔ "جناب! میں ایک بار پھر آپ سے ہاتھ باندھ کر درخواست کرتا ہوں کہ اس بات میں میرا یا اس عورت کا نام نہ آئے۔ ورنہ ہمارا برا حشر ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "یہی بات میں تم سے کہنا چاہ رہا ہوں۔ اس بات کو بس اپنے سینے میں دفن کر لو اور اس عورت کو بھی سمجھا دو۔ بات نکلے گی تو حاصل کچھ نہیں ہوگا، بس فساد بڑھے گا اور ہم یہاں فساد کرنے نہیں آئے ہیں۔"

حمزہ نے بھی تائیدی انداز میں کہا۔ "ہاں کارینگ! سچائی چھپتی نہیں ہے۔ ہمارے چپ رہنے کے باوجود وہ سامنے ضرور آ جائے گی۔ آج نہیں آئی تو چند دن ٹھہر کر آ جائے گی۔"

کارینگ بولا۔ "میں جانتا ہوں جی کہ آپ سو فیصد ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن یہاں گرو کشپال اور ان کے استاد گرو ایش کی رائے کے خلاف چلنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔"

"بڑے گرو کی یہاں کیا حیثیت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے گرو تو ظاہر ہے کہ بڑے گرو ہی ہیں لیکن ان کے ارد گرد جو لوگ موجود ہیں۔ وہ شاید سچی اور کھری بات ان تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ عام لوگوں سے بڑے گرو کا رابطہ بہت کم ہوتا ہے۔ ان تک جو بات پہنچتی ہے گرو کشپال، گرو ایش اور ان کے چیلوں کے ذریعے ہی پہنچتی ہے۔"

حمزہ نے پوچھا۔ "بڑے گرو سے ملنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟"

وہ بولا۔ "یہ ذرا مشکل کام ہے جی اس بارے میں آپ کو مکھیا کاستو ہی بتا سکتے ہیں۔"

اگلے دو تین دن خاصی کشمکش میں گزرے۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ "چاتو چانگ لے" میں ہمارا رہنا کافی مشکل ہو گیا ہے۔ بستی کے لوگ خواہش رکھنے کے باوجود اب ہمارے کلینک میں نہیں آ رہے تھے۔ مکھیا کاستو نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا تھا اور ہمیں امید تھی کہ کہے گا بھی نہیں کیونکہ اس نے ہمیں معزز مہمانوں کی حیثیت دے رکھی تھی لیکن اس کے بعض تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی ہماری میزبانی کو اب ایک کٹھن کام سمجھ رہا ہے۔

ایک شام کارینگ تیزی سے اندر آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ گوڈا سے کچھ مبلغ آئے ہیں اور بستی میں گھوم رہے ہیں۔ ابھی بمشکل کارینگ کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ دروازے پر دستک ہو گئی۔ کارینگ نے دروازہ کھولا اور پھر حسب دستور ہاتھ جوڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ ایک مبلغ اور مبلغہ اندر داخل ہوئے۔ مبلغہ ہوسنگ ہی تھی۔ اسے دیکھ کر سینے میں امید کی کرنیں روشن ہوئیں۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ وہ میرے لیے سون کا کوئی اور پیغام لائی ہو۔

حسب سابق ہم چٹائیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہوسنگ کا ساتھی مبلغ آج بدلا ہوا تھا۔ وہ ایک خاص دیہاتی شخص نظر آتا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ہو سکتا ہے یہ بھکشو انگریزی سے نابلد ہو بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہوسنگ کا ساتھی بھکشو انگریزی بالکل نہیں جانتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ہوسنگ اسے سوچ سمجھ کر ساتھ لائی تھی۔

کارینگ کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ اب دونوں مبلغین کے سامنے میں اکیلا تھا۔

ہوسنگ حسب سابق سپاٹ لہجے میں بولی۔ "مسٹر شاداب! آپ کا ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ ذرا محترم کاستو کی طرف گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ہوسنگ نے دعائیہ انداز میں ایک سوتر پڑھا پھر میکانکی لب و لہجے میں بدھا کی تعلیمات بیان کرنے لگی۔

''نروان اور شانتی حاصل کرنے کے لیے دنیا کی خواہشات اور ہنگاموں سے منہ موڑنا ضروری ہے۔ سکون اسی طور حاصل ہوگا جب ہم لذات کو ترک کریں گے۔ جو چیز جسم رکھتی ہے وہ مادے سے بنی ہے اور مادہ فانی ہے۔ ہر جان دار کی طرح انسان کو بھی فنا سے چارہ نہیں ہے۔ دکھ، نقاہت، بیماری اور موت جان دار کی فنا کے مختلف مدارج ہیں۔''

وہ تعلیمات بیان کرتی رہی۔ اس دوران میں اس نے تھوڑا سا توقف کیا۔ اپنے برتن میں سے چند گھونٹ پانی پیا اور موضوع بدل لیا۔ اب وہ سون کے بارے میں بات کرنے لگی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں ایک بار پھر آپ تک سون کا پیغام پہنچانا چاہتی ہوں۔ سون کا کہنا ہے کہ آپ اپنے ذہن سے ہر قسم کی ناپاک خواہشات نکال دیں اور شرافت وعزت کے ساتھ یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ دوسری صورت میں آپ کے حصے میں تکلیف اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں آئے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو زبردست جسمانی نقصان پہنچ جائے۔ اگر آپ اپنے دل میں ناپاک خیالات لے کر دس سال بھی یہاں بیٹھے رہیں گے تو آپ کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سون نے زور دے کر یہ بات کہی ہے کہ جس سون کو آپ جانتے تھے وہ مر چکی ہے اور مرنے والے لوٹتے نہیں ہیں۔''

ہوسنگ نے ایک لمحہ توقف کیا اور اپنے ساتھی کو کن انکھیوں سے دیکھ کر بولی۔ ''آج کے بعد میں آپ کے پاس نہیں آؤں گی۔ یہ سون کی طرف سے بھی آخری پیغام ہے آپ جتنی جلدی ہوسکتا ہے یہاں سے چلے جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں چلا جاؤں گا لیکن اسی صورت میں جب سون ایک بار مجھ سے ملے گی۔ مجھے بتائے گی کہ وہ ایسی کیوں ہوئی ہے؟ وہ کیا ہے جس نے اسے یوں اپنوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اس سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔ وہ جو کہے گی مان لوں گا اور چپ چاپ چلا جاؤں گا۔''

''میں معافی چاہتی ہوں۔ آپ کی یہ خواہش کسی طور پوری نہیں ہوسکتی۔ سون آپ سے نہیں مل سکتی اور نہ کوئی بات کر سکتی ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔ اس کے کپڑوں سے وہی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جو پگوڈا میں محسوس ہوئی تھی۔

''میں نے بھی جو آخری بات کہنی تھی کہہ دی ہے۔ سون کو بتا دیں کہ اس سے ملنے کے لیے میں نے دکھ اور انتظار کا بہت لمبا سفر کیا ہے۔ میں اس سے ایک بار مل کر ہی یہاں سے جاؤں گا...... اور میرے خیال میں یہ اس کے لیے کوئی ایسا ناممکن کام بھی نہیں ہے۔ جس طرح آپ یہاں چلی آئی ہیں وہ بھی آ سکتی ہے۔ وہ میری یہ ایک خواہش تو پوری کر ہی سکتی ہے۔''

ہوسنگ نے میرے آخری الفاظ شاید سنے ہی نہیں تھے وہ اپنے بھکشو ساتھی کے ہمراہ باہر نکل چکی تھی۔ بھکشو مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ ایک عجیب سی نقاہت تھی جو جسم و جاں میں اتر گئی تھی۔ اس نقاہت میں گہری مایوسی کی آمیزش بھی تھی۔ ہوسنگ کے یہ الفاظ خاص طور سے سماعت میں نشتروں کی طرح چبھ رہے تھے۔ ''آپ اپنے ذہن سے ہر قسم کی ناپاک خواہشات نکال دیں اور شرافت کے ساتھ یہاں سے چلے جائیں۔''

محبت تو ایک معطر اور لطیف جذبہ تھا۔ یہ ناپاک کب سے ہوگیا...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ مندرجہ بالا الفاظ ہوسنگ کے اپنے ہیں یا سون کے منہ سے نکلے ہیں۔ مگر ہر دو صورتوں میں یہ الفاظ مجھے سخت گراں گزرے تھے۔ میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ دل پر غم کی بے آواز پھوار گرتی رہی اور جذب ہوتی رہی۔ دل و دماغ کی جو کیفیت آج کل تھی پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس وقت بھی نہیں تھی جب میرے ہاتھوں میں رخشی کے ہاتھ ہوتے تھے اور میں اپنے آس پاس اس کی سانسوں کی مہک محسوس کرتا تھا۔ یہ کیفیت میرے لیے بالکل نئی تھی۔ مجھے کبھی اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میرے دل کے اندر سے آواز آ رہی تھی۔ 'یہ کچھ اور نہیں...... یہ محبت ہے۔ وہی جس کے لیے شاعروں نے لکھ لکھ کر کتب خانے بھرے ہیں۔ جس کے لیے زہر کھائے گئے ہیں، تخت ٹھکرائے گئے ہیں اور دنیا کے نقشے بدلے گئے ہیں۔'

ہاں یہی تو وہ محبت ہے جس کے بارے میں میں نے بس آج تک سنا تھا، دیکھا تھا اور پڑھا تھا۔ آج میں اسے محسوس کر رہا تھا۔ چند ہفتے پہلے جب میں بنکاک کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا تھا میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں میری ملاقات ''محبت'' سے ہونے والی ہے اور اتنی شدت سے ہونے والی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

مجھے رخشی کو مطعون کرنا چاہئے یا پھر اس کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ در حقیقت یہ رخشی ہی تھی جس نے چار پانچ سال بعد مجھے پھر بنکاک کا راستہ دکھایا تھا اور میرا ناتا گمشدہ ماضی سے جوڑا تھا۔

میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا جب حمزہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ کاستو کے گھر سے آرہا تھا۔ کاستو کی بیوی کو گردے کا درد تھا۔ وہ اسے دیکھنے گیا تھا۔ ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ میں نے اسے ہوسنگ کی آمد کے بارے میں بتایا اور وہ گفتگو بھی بتائی جو میرے اور ہوسنگ کے درمیان ہوئی تھی تاہم میں نے اس گفتگو کی درشتی کو کسی حد تک کم کر دیا تھا۔

میری طرح حمزہ کے اندر بھی ایک طرح کی مایوسی سرایت کر گئی۔ در حقیقت ہم مایوس تو پہلے سے ہی تھے، اب سون کی اٹل بے رخی ہمیں مایوس تر کر رہی تھی۔ اس اثنا میں ہمارا مددگار کاریگ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ اور چہرے پر دبا دبا جوش بھی تھا۔ وہ بولا دیکھئے جناب! میں نے کہا تھا نا کہ آپ کے لیٹر بس دو چار دن کے اندر ہی منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ دیکھ لیجئے ان میں سے ایک خط کا جواب تو آ گیا ہے۔

میں نے جلدی سے لفافہ لیا۔ یہ خط رخشی کی طرف سے تھا۔ ایڈریس بھی اسی کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا گیا تھا۔ حمزہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب مجھے باہر چلے جانا چاہئے۔“

میں نے اس کا کندھا تھام کر اسے بٹھایا۔ لفافہ چاک کیا اور رخشی کی تحریر پڑھنے لگا۔ اس نے حسب عادت انگریزی میں لکھا تھا۔ خط کچھ اس طرح تھا۔

”ڈیئر شاداب! آج ہی تمہارا خط موصول ہوا، آج ہی جواب لکھ رہی ہوں۔ چار پانچ روز سے سخت الجھن تھی۔ ذہن میں برے برے خیال آ رہے تھے۔ ادھر انکل آنٹی اور باجی، بھیا بھی سخت پریشان تھے۔ بہر حال تمہارا خط پڑھ کر حالات سے آگاہی ہوئی۔ تم نے جس طرح کے حالات لکھے ہیں اگر وہ ویسے ہی ہیں تو تمہیں اور حمزہ کو ضرور ٹائم دینا چاہئے تھا۔ میں نے سر احتشام الدین صاحب کو بھی تمہارے خط کے بارے میں بتا دیا ہے۔ انہیں خوشی ہوئی ہے کہ تم مقامی لوگوں کے صحت کے مسائل کو اتنی سنجیدگی سے لے رہے ہو۔ (اگر واقعی لے رہے ہو تو) اور اگر کوئی دوسری بات ہے تو بھی بتا دو۔ بھئی انکل نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ زیادہ خوشبوئیں وغیرہ لگا کر بنکاک میں مت گھومنا۔ ...

ہیں اس شہر خرابی میں بہت چڑیل قسم کی چڑیلیں گھوما کرتی ہیں۔ ان خوبصورت چڑیلوں کے چنگل میں پھنس کر نکلنا آدم زادوں کے لیے کار دارد ہوتا ہے۔ میں نے آنٹی جی سے کہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خط میں تمہیں کچھ تیر بہدف قسم کے وظیفے بھی لکھ کر بھیجیں۔ باقی ہم تو اتنی دور بیٹھ کر تمہارے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ تازہ ترین صورتحال سے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ واپس کب تک آ رہے ہو۔ انکل کی طبیعت بھی کچھ خراب رہتی ہے۔ اکثر تمہیں یاد کرتے ہیں۔“

اس کے بعد کچھ مزید چھوٹی موٹی باتیں تھیں۔ آخر میں اس نے کیٹس کے ایک خوبصورت شعر پر خط ختم کیا تھا۔

میں نے خط دوبارہ پڑھا پھر بلا تکلف حمزہ کے حوالے کر دیا۔ اس نے بھی خط پڑھا پاکستان میں سب کی خیر خیریت جان کر ایک طرح کا اطمینان ہوا تھا۔ وہ جو پیچھے کا ایک دھڑکا سا لگا رہتا تھا ایک دم کم ہو گیا تھا اور ہم ہلکے پھلکے ہو کر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اگر ہمارے حالات اجازت دیں تو ہم ہفتہ دس دن یہاں مزید قیام کر سکتے ہیں۔۔ بہر حال اس خط میں میرے لیے ایک غمزدہ کرنے والی کیفیت بھی تھی اور اس کیفیت کا ماخذ رخشی کے رومانی احساسات تھے۔ اس نے شوخ انداز میں کچھ باتیں لکھی تھیں، اسے کیا معلوم تھا کہ جو کچھ وہ مذاق میں لکھ رہی ہے وہ حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔

رخشی کا خط ہمارے لیے مایوسی اور بے چینی کے حبس میں خنک ہوا کا جھونکا ثابت ہوا تھا۔ وہ رات قدرے خوشگوار انداز میں گزری۔ میں اور حمزہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دور اوپر تاریکی میں لپٹے ہوئے پگوڈا کے اندر سے گھنٹیوں کی صدائیں آتی رہیں۔ ہوا ناریل کے درختوں میں سرسراتی رہی اور شب میں کھلنے والے جنگلی پھولوں کی باس اپنے دامن میں بھر بھر کر لاتی رہی۔ رات ایک بجے کے لگ بھگ ہم نے مچھر بھگانے والا تیل اپنے جسم کے کھلے حصوں پر لگایا اور سو گئے۔ صبح ہمیں کاریگ کی زبانی ایک اور اچھی خبر ملی اور وہ یہ کہ شیلن کی طبیعت اب بہتر تھی اور اسے کھانا ہضم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی طرح ہم شیلن کے والدین سے ملیں اور وہ غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کریں جو ان کے ذہنوں میں ہمارے حوالے سے پیدا کر دی گئی تھیں۔ شیلن کے مرض کے حوالے سے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ بستی میں کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا اور دیانت داری و فرض شناسی کا تقاضا یہی تھا کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں وہ دوسروں کو دکھانے

کی اپنی سی کوشش کریں۔ نجانے کیوں میں جب بھی شیلن کو دیکھتا تھا مجھے ''راجوالی'' میں بے بسی کی موت مر جانے والی معصوم شہناز یاد آ جاتی تھی۔ شاید اس لیے کہ شیلن کی آنکھیں بھی شہناز کی طرح براؤن تھیں یا شاید کوئی اور بات تھی۔ مجھے یوں لگنے لگتا تھا جیسے کئی برسوں بعد شہناز ایک اور روپ میں میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔ اپنے جسم میں وہی مہلک روگ لے کر اور اپنے ذہن میں میرے لیے وہی پیار اور اعتماد لے کر یہ سوچ کر میرا دل ہولنے لگتا تھا، کیا نئے روپ میں میرے سامنے آنے والی یہ ''معصومیت'' ایک بار پھر مر جائے گی۔ میں نے شیلن کے سلسلے میں مکھیا کاستو سے بھی طویل گفتگو کی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا تھا کہ شیلن کو کسی کے کہنے پر علاج کے لیے بنکاک نہ لے جایا گیا تو یہ اس کے قتل کے مترادف ہوگا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا علاج گرو ایش کی دی ہوئی راکھ اور اس کے دم کیے ہوئے ناریل کے پانی سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مکھیا نے میری باتیں بڑے دھیان سے سنی تھیں اور تفہیمی انداز میں سر ہلاتا رہا تھا، تاہم کوئی مثبت جواب اس نے نہیں دیا تھا، یا شاید دے ہی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے روز شام کو ہم سیر کے لیے نکلے۔ پچھلے تین چار دن ہم نے اپنی رہائش گاہ پر بند رہ کر ہی گزارے تھے۔ کل حمزہ اکیلا گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ سون مٹھ سے پگوڈا جانے والے بھکشوؤں کی قطار میں شامل تھی۔ وہ حسب سابق سر جھکائے ہوئے گزر گئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی سیڑھیوں کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ حمزہ نے بتایا تھا کہ ہوسنگ بھی قطار میں موجود تھی۔ وہ سون کے پیچھے چل رہی تھی۔ اس نے بھی سیڑھیوں کی جانب دیکھنے کی زحمت کی نہیں کی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے بستی کی گلیوں میں سے گزرتے رہے۔ لوگ اب بھی ہمارے ساتھ تعظیم سے پیش آتے تھے اور ہمارے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے لیکن وہ پہلے سی گرم جوشی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کی وجہ یقینی طور پر کشپال اور اس کے استاد ایش کا اثر و رسوخ تھا۔ ہمارے ''عارضی کلینک'' میں روزانہ بمشکل دو چار مریض ہی آ رہے تھے اور وہ بھی سہمے سہمے ہوتے تھے۔ ہم پگوڈا کی وسیع و عریض سیڑھیوں پر پہنچے یہاں روزانہ کی طرح گہما گہمی تھی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی سیدھی سیڑھیوں پر پڑ رہی تھی اور انہیں چمک دار بنا دیتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پگوڈا کے طلائی کلس بھی چمکتے دکھائی دیتے تھے۔

ہم سیڑھیوں پر اسی جگہ بیٹھ گئے جہاں اکثر بیٹھتے تھے۔ مقامی لوگ تعظیم کے سبب ہم سے دور دور رہتے تھے لیکن ہماری طرف دیکھتے رہتے تھے۔ ان کا مسلسل دیکھنا کبھی کبھی الجھن میں مبتلا کر دیتا تھا۔ ہم سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھا ایک مقامی شخص آٹا بیچ رہا تھا لیکن یہ خاص قسم کا آٹا تھا۔ مقامی زبان میں اسے نمکین مچھلی کا آٹا کہا جاتا تھا۔ اس آٹے کو بھوننے یا تلنے سے مزے دار پکوڑے تیار ہو جاتے تھے۔ ایک بوڑھا شخص ہمارے پاس سے گزرا۔ دور بیٹھے ایک بھکشو کی نظر بچا کر اس نے ہمیں کچھ کھانے کے لیے دیا اور ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ ہم اسے کھا کر دیکھیں۔ یہ بظاہر کوئی پھکری قسم کی شے تھی۔ بوڑھا آگے بڑھ گیا تھا۔ کچھ دیر ہم جھجکتے رہے، پھر تھوڑا تھوڑا چکھ کر دیکھا۔ یہ دراصل کوزہ مصری قسم کی چیز تھی۔ اسے مقامی کھانڈ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ذائقہ اچھا تھا۔

کچھ دیر بعد گیروا لباسوں والے بھکشوؤں کی قطار مٹھ سے برآمد ہوئی۔ میری نگاہیں سون کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئیں۔ اس کی جھلک دیکھنے کے لیے میں سرتاپا آنکھ تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ایک وقت تھا جب بنکاک کے ہوٹل نیو ٹرو کیڈرو میں سون ہر وقت میرے پاس تھی۔ وہ مجسم آمادگی و خود سپردگی تھی۔ لیکن میں اس سے دور، بہت دور تھا۔ آج وہ مجھ سے دور تھی اور اتنی دور تھی کہ اس دنیا میں ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

ایک دم میرا دل بجھ سا گیا۔ میں نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ سون قطار میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ قطار جب مزید قریب آئی تو ہمارا اندیشہ حقیقت میں بدل گیا۔ وہ قطار میں موجود ہی نہیں تھی۔ حمزہ نے کہا۔ ''شاذ! میرے خیال میں آج ہوسنگ بھی نہیں ہے۔''

واقعی ہوسنگ بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ''یہ کیا معاملہ ہے۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''کہیں وہ کسی اور جگہ تو نہیں چلی گئیں۔ کاریگ بتا رہا تھا کہ مٹھ سے کچھ بھکشو کسی قریبی مٹھ میں منتقل ہونے والے ہیں۔''

ہم گہری مایوسی کے ساتھ بستی میں واپس آ گئے۔ چراغ جل چکے تھے۔ جھونپڑا نما مکان کے اندر سے مختلف پکوانوں کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ بستی کے چوراہے میں ساگوان کے ایک چبوترے پر نوعمر لڑکوں کی ایک ٹولی بیٹھی بانسریاں بجا رہی تھی۔ یہ لڑکے اکثر یہاں آتے تھے۔

جب ہم پاس سے گزرتے تھے تو وہ ہم سے ہاتھ ملانے اور باتیں کرنے کے لیے آگے بڑھ آتے تھے، مگر جب سے شیلن کی بے ہوشی والا واقعہ ہوا تھا یہ بچے بھی ہم سے کھنچ سے گئے تھے۔ پوری بستی میں ہی کھچاؤ کی سی کیفیت تھی اور یہ سب بھکشوؤں کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہمیں یہاں سے نکالنے کے لیے بھکشوؤں کو بس ایک چھوٹے سے بہانے کی ہی ضرورت تھی۔ میں یہ سوچ کر لرز جاتا تھا کہ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم مٹھ کی ایک بھکشولڑکی کے چکر میں یہاں موجود ہیں تو پتہ نہیں کیا حشر ہو۔ مجھے اپنے ساتھ ساتھ حمزہ کی فکر بھی تھی یہی وجہ تھی کہ میں نے بے حد محتاط رویہ رکھا ہوا تھا۔ ہم بچوں کے قریب سے گزرے۔ وہ اپنے حال میں مگن رہے۔ جب ہم چند قدم آگے چلے گئے تو ایک بچہ بھاگ کر آیا اور اس نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اسے دیکھ کر دو بچے اور بھاگے آئے پھر یکا یک ساری ٹولی اٹھ کر ہمارے پاس آ گئی۔ بچے ہم سے ہاتھ ملانے لگے۔ اپنی ناقابلِ فہم زبان میں ہم سے ہمکلام ہونے لگے۔ ان کے بزرگوں نے بھی انہیں منع نہیں کیا دو بچے ہمیں کھینچ کر ساگوان کے منقش چبوترے پر لے آئے اور ہمیں بانسری سنانے لگے۔

یہ صورتحال ہمارے لیے خوشی کا باعث تھی۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ عام لوگ اب بھی ہماری طرف مائل ہیں اور اگر ان کے ذہنوں میں کچھ کھچاؤ آیا بھی تھا تو اب کم ہو رہا ہے۔ اصل مسئلہ بھکشوؤں کا تھا بلکہ شاید گروالیش اور کشپال کے خاص چیلوں کا تھا۔ بچوں کی فرمائش پر ہم نے بھی انہیں الٹی سیدھی بانسری سنائی جس پر وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

سورج ڈوبنے کے قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم اپنی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ابھی ہم اپنے جوتے ہی اتار رہے تھے کہ ایک درمیانی عمر کی عورت تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کاریگ سے چند باتیں کیں۔ کاریگ نے ہمیں بتایا کہ سات آٹھ دن پہلے ہم نے جس لڑکی کو کان درد کی دوا دی تھی اس کی طبیعت خراب ہے۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اور شدید بخار بھی ہو گیا ہے۔

اس بار پھر یہ اسی قسم کی صورتحال تھی جو لڑکے شیلن کے سلسلے میں سامنے آئی تھی۔ حمزہ نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کہیں پھر کسی نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کر دی؟“

”یہ تو وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا۔“ میں نے جوتے پھر سے پہنتے ہوئے کہا۔

ہم بھاگم بھاگ مریضہ کے گھر پر پہنچے۔ مجھے اس کے بارے میں سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس کا کان خراب تھا۔ مقامی ٹوٹکے کے مطابق اس کے گھر والے کان میں پیاز اور

کالی مرچوں کے تڑکے والا گھی ڈالتے رہتے تھے اور اس قسم کے دوسرے نقصان دہ طریقے اختیار کر رہے تھے۔ نوجوان لڑکی کے کان کا پردہ ضائع ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

ہم نیم پختہ جھونپڑے میں داخل ہوئے۔ بستی کے اکثر گھروں کی طرح یہ گھر بھی دو تین چھوٹے کمروں میں تقسیم تھا۔ فرش پر بید کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ بانسوں کو ستونوں کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ چھوٹے بانسوں کو جوڑ کر ایک مضبوط ستون تیار کر لیا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک ستون کے قریب چارپائی پر مریضہ لڑکی لیٹی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی چارپائیاں نہایت مختصر اور نیچی ہوتی تھیں۔ غالباً یہ بھی بدھ مت کی تعلیمات کا عکس تھا۔

ہم لڑکی کی چارپائی کے نزدیک لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھ گئے۔ لڑکی کو بخار تو واقعی تھا لیکن زیادہ تیز نہیں تھا، معمولی سی حرارت تھی۔ اس کا کان بھی پہلے سے بہتر ہی نظر آتا تھا۔ سوجن کم ہو گئی تھی اور مواد نکلنے کے آثار بھی نہیں تھے...... پھر پتہ نہیں کہ وہ کیوں تکلیف کا اظہار کر رہی تھی۔ درمیانی عمر کی جو عورت ہمیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی وہ مریضہ کی بڑی بہن تھی۔ اس کے سوا گھر میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ حمزہ ٹارچ کے ذریعے لڑکی کے کان کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ جب پردہ ہلا اور ساتھ والے کمرے سے نکل کر ایک لڑکی اندر آ گئی۔ یہ گیروا کپڑوں والی ہوسنگ ہی تھی۔ ہوسنگ کی یہاں موجودگی تعجب کا باعث بنی۔ اسے دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ہوسنگ نے رسمی کلمات ادا کیے۔ میں نے اور حمزہ نے جواب دیا۔ ہوسنگ ایک جانب اسٹول پر بیٹھ گئی۔ آج پہلا موقع تھا کہ ہوسنگ کے ساتھ کوئی مرد بھکشو نہیں تھا۔

ہوسنگ نے مریضہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری بچپن کی دوست ہے۔ اس کو تکلیف میں دیکھ کر مجھے بھی سخت تکلیف ہوتی رہی ہے۔ بہر حال اب بودھا کا شکر ہے کہ اس کی طبیعت پہلے سے اچھی ہے۔“

”اگر طبیعت اچھی ہے تو ہمیں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے کہا۔

”دراصل میں چاہتی تھی کہ آپ اسے ایک بار اور دیکھ لیں۔ اسی بہانے آپ سے ایک دو باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔“

یہ بات اب بالکل واضح تھی کہ لڑکی کی ”خرابیِ طبع“ کا بس بہانہ ہی تھا۔ دراصل ہوسنگ اس سے ملنا چاہتی تھی۔ غالباً پچھلی ملاقات میں ہوسنگ کا ساتھی بھکشو کچھ چونک گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہوسنگ نے پرانے طریقے سے ملنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ویسے بھی تبلیغی دوروں

کے اوقات مقرر تھے۔ وقت مقررہ سے ہٹ کر اس قسم کی کوشش، شکوک پیدا کر سکتی تھی۔

میں نے ہوسنگ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟“

ہوسنگ نے حمزہ کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”حمزہ میرا دوست ہے، اسے سب کچھ معلوم ہے، آپ کو جو کہنا ہے بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔“

ہوسنگ نے مریضہ کی بڑی بہن کو اشارہ کیا وہ باہر چلی گئی۔ مریضہ لڑکی بھی اٹھی اور دھیمے قدموں سے باہر نکل گئی۔ ہوسنگ بولی۔ ”میں آپ کو ایک بات کھول کر بتا دینا چاہتی ہوں۔ جو ایک بار سنگھ میں شامل ہو جاتا ہے وہ ہمیشہ کے لیے سنگھ کا ہو جاتا ہے۔ اس کا ماضی دفن ہو جاتا ہے۔ ماضی سے تعلق رکھنے والی ہر شے بھی دفن ہو جاتی ہے۔ ایسے انسان کو اس کی سکون بخش زندگی سے کھینچ کر اس کے پر درد ماضی کی طرف واپس لانے کی کوشش کرنا، اتنا بڑا گناہ ہے کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ دس زنجیریں توڑ کر نروان کی منزل کی طرف بڑھنے والے لوگ ہیں۔ اگر ہمارے پاس......“

”پلیز مس ہوسنگ!“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”میں یہ ساری باتیں سن چکا ہوں اور میں نے ان پر کافی غور بھی کیا ہے۔ میں اب آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ نے سون تک میرا پیغام پہنچایا تھا؟“

وہ بولی۔ ”سون! اس پیغام کے بارے میں بہت پہلے سے جانتی ہے۔ یہ آپ ہیں جو اس کی مجبوریاں نہیں سمجھ رہے۔ آپ بدھ مت کے ایک پیروکار کی حدود کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“

میں نے اس حوالے سے پہلی بار اپنی زبان کھولتے ہوئے کہا۔ ”مس ہوسنگ! پتہ نہیں آپ کس بدھ مت کی بات کر رہی ہیں۔ میں ایک کم علم شخص ہوں۔ آپ کے مت کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہیں لیکن کچھ نہ کچھ تو میں بھی جانتا ہوں۔ آپ سچ پوچھیں تو مجھے تو اپنے آس پاس کہیں بدھ مت اپنی معروف شکل میں دکھائی نہیں دیا۔ گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن یہاں مجھے بہت کچھ ایسا نظر آتا ہے جو کسی طور بدھ مت نہیں ہے۔“

ہوسنگ نے یکایک بہت کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر پھٹ پڑے گی اور ایک طویل بحث شروع کر دے گی لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا اور ہونٹ بھینچ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے گلے کی مالائیں آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا کر رہی تھیں، جیسے یہ مالائیں بھی طیش میں ہوں۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی لیکن ایک منٹ بعد واپس آ

گئی۔ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اگر آپ کی شرط مان لی جائے تو کیا آپ یہاں سے چلے جائیں گے؟“

”کیا مطلب......سون مجھ سے ملے گی؟“

”پہلے آپ میری بات کا جواب دیں۔ کیا آپ یہاں سے چلے جائیں گے اور واپس نہیں آئیں گے۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر سون مجھ سے تنہائی میں بات کرتی ہے تو مجھے جو وہ کہے گی میں مان لوں گا۔“

”تو چلیں آئیں۔“

”کہاں؟“

”میں آپ کو سون سے ملاتی ہوں۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”یہیں اسی گھر میں۔“ ہوسنگ نے کہا اور میرا جسم تھرا کر رہ گیا۔ مجھے گمان نہیں تھا کہ میں اتنی جلدی سون کو اپنے سامنے پاؤں گا۔ میری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

❁❁❁

سون اسی گھر میں تھی اور میرے روبرو آنے پر رضامند تھی۔ ایک ایسی لڑکی جو سنگھ میں شامل ہو کر دنیا کی رنگینیوں سے منہ موڑ چکی تھی اب میری خواہش بلکہ ضد سے مجبور ہو کر مجھ سے ہم کلام ہونے والی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ مجھے ہوسنگ پر اور اپنی سماعتوں پر شک ہونے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو، ایسی چال کہ پھر اس کے بعد میں سون کا نام تک لینا بھول جاؤں۔

خیالات کسی برق رفتار لہر کی صورت میں ذہن سے گزر رہے تھے۔ ہوسنگ نے میرے تاثرات کو بھانپتے ہوئے کہا۔ ”بے فکر رہیں۔ یہاں آپ کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔ امید ہے کہ آپ بھی ہمیں کسی مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔ ہم سب اس وقت ایک نہایت خطرناک کام کر رہے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں آپ!“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ حمزہ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اسے اشارہ کیا کہ وہ یہیں بیٹھے۔

لرزتے قدموں کے ساتھ ہوسنگ کے عقب میں چلتا ہوا میں ساتھ والے کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں میری مریضہ موجود تھی اور اس کی بڑی بہن موجود تھی۔ ہم ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے تیسرے کمرے میں پہنچے۔ میری بے تاب نظروں نے اس چھوٹے سے کمرے میں سون کو ڈھونڈا۔ مجھے وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ بید کی دو دیہاتی کرسیاں اور ٹین کی چادر کی تپائی رکھی تھی۔ طاق دان میں لیمپ روشن تھا اور تیل کی ہلکی سی بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ کمرے میں ایک پردہ کھینچا گیا ہے اور سون اس پردے کے پیچھے موجود ہے۔ ہاں وہ موجود تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ موجود ہے۔ میرے جی میں آئی کہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پردہ اٹھاؤں اور سون کے سامنے جا کھڑا ہوں مگر ہوسنگ کی آواز نے میرے قدم جکڑ لیے۔

”محترم شاداب! آپ پردے کی اس جانب سے بات کریں گے۔ آپ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لیں گے۔ میں ساتھ والے کمرے میں موجود ہوں گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ میرا جواب سنے بغیر باہر نکل گئی۔ میرے دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ میں نے بید کی کرسی پردے کی طرف کھسکائی اور بیٹھ گیا۔ سون کی جانی پہچانی آواز کانوں میں گونجی اور سماعت میں جیسے ہلچل مچ گئی۔ وہ بولی۔ ”تم اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہو شاداب! اور شاید میرے اوپر بھی۔ تم ایک ایسی کوشش کر رہے ہو جس کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں جانتی ہوں تمہارے دل میں کیا خیالات ہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے، لیکن جس طرح مرنے والوں کے لیے صبر کر لیا جاتا ہے، میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے خیالات کے لیے بھی صبر شکر کر لو۔ جس طرح دریا کا پانی واپس نہیں لوٹتا، بودھا کے راستے پر چل کر سنگھ میں داخل ہونے والا بھی واپس نہیں لوٹ سکتا اور نہ لوٹنا چاہتا ہے۔“

میں نے سون سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ میں تمہیں تمہارے راستے سے لوٹانا چاہتا ہوں، یا واپس لانے کا خواہش مند ہوں لیکن...... کیا تمہیں ایک بار دیکھنا، تم سے باتیں کرنا بھی میری قسمت میں نہیں ہے؟“

”نہیں، اب یہ ممکن نہیں۔ تم جو کچھ چاہتے ہو۔ یہ بالآخر وہی روپ دھارے گا جس کے بارے میں تم نے بات کی ہے۔ تم مجھے اپنی دنیا میں واپس کھینچنا چاہو گے، جو کہ ناممکنات میں سے ہے۔ یاد رکھو! ایک خواہش سے دوسری اور دوسری سے تیسری جنم لیتی ہے۔ انسان اس گورکھ دھندے میں الجھتا جاتا ہے اور عذابوں کی نذر ہو جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر ہوسنگ میرے سامنے آ سکتی ہے تو تم کیوں نہیں آ سکتی۔ تم نے اپنے آپ پر یہ خود ساختہ پابندیاں کیوں لگا رکھی ہیں۔“

”یہ خود ساختہ پابندیاں نہیں۔ ہوسنگ کی بات اور ہے میری بات اور...... میری ذات کا تعلق تمہارے ذہن میں اٹھنے والے غلط خیالات سے ہے۔ میرا مت مجھے اس گناہ سے روکتا ہے۔“ سون کا لہجہ اٹل تھا۔

وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کے جوان بدن کی انوکھی مہک دبیز پردے سے گزر کر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنی آواز کو حتی الامکان سپاٹ اور بے کشش رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن آواز کی کھنک اور لہجے کا لوچ پھر بھی جھلک دکھا رہے تھے۔

میں نے چند لمحے توقف کیا پھر ذرا بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سون! اگر میں

تمہارے مت (مذہب) کے بارے میں جاننا چاہوں تو؟“

دوسری طرف کچھ دیر خاموشی رہی پھر سون کی آواز آئی۔ ”اگر تم واقعی ایسا چاہتے ہو تو پھر ہوسنگ تمہیں اس بارے میں بتا سکتی ہے۔“

”لیکن میں تم سے...... تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

وہ الجھن زدہ آواز میں بولی۔ ”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”جتنا بھی وقت ہے تم مجھے کچھ نہ کچھ بتاؤ۔“

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ پھر سون نے کہا۔ ”سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مبلغ کی بات اس وقت اثر کرتی ہے جب سننے والے کا دل ہر قسم کی حرص اور دنیاوی آلائش سے پاک ہو...... اور گستاخی معاف۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔“

”تم بدگمانی کا شکار ہو رہی ہو اور بدگمانی یقیناً بدھ مت میں بھی گناہ ہی شمار ہوتی ہوگی، تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں سچے دل سے تمہارے خیالات سننا نہیں چاہتا۔“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ مالاؤں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی پھر سون نے میکانکی انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”خواہشیں انسان کو بے سکون کرتی ہیں۔ خواہشوں سے دور ہو کر انسان زندگی کے آلام اور تکالیف سے دور ہو جاتا ہے۔ اسے ایک ایسا سکون ملتا ہے جس کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اسے فقط محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بدھا کے پیروکار چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر انسان اس سکون و آشتی سے آشنا ہو۔ انسان کو اس سکون سے آشنا ہونے کے لیے لذتوں اور راحتوں سے دور ہونا پڑتا ہے۔ ایک بھکشو ہر طرح کی ناپاک سوچوں کو اپنے ذہن سے دور رکھتا ہے۔ وہ عمدہ کھانوں کی طرف سے منہ موڑتا ہے۔ کام و دہن کی لذت سے خود کو دور کر لیتا ہے۔ روکھی سوکھی کھاتا ہے اور وہ بھی صرف پیٹ بھرنے کے لیے وہ بالکل سادہ لباس پہنتا ہے۔ اپنے جسم کو موسموں کی شدت کے حوالے کرتا ہے اور جفاکشی کے ذریعے اپنے اندر کی لطافتوں کو بیدار کرتا ہے۔ وہ صرف اور صرف محبت کا پیامبر ہوتا ہے۔ غرور، غصہ، نفرت، انتقام جیسے جذبات سے ایک بھکشو کوسوں دور ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ کسی طرح کا نشہ نہیں کرتا، کسی جاندار کی جان تلف نہیں کرتا۔ کسی طرح کی بداخلاقی کے لیے اس کے جیون میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ جب بدھا کے ان احکامات پر وہ مسلسل اور پوری شدت کے ساتھ عمل کرتا ہے تو اس کے اندر کی روحانی قوتیں بیدار ہوتی ہیں جو اس کے دل و

دماغ کو ایک جاودانی سکون سے بھر دیتی ہیں۔“

میں پوری توجہ سے سون کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔

”کیا تم سنگھ میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”اگر میرا ارادہ ہو تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

وہ بولی۔ ”سب سے پہلے تو وہی کرنا ہوگا جو تمہیں شروع میں بتایا ہے۔ تمہارا دل ہر قسم کی حرص اور منافقت سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔ اس کے بعد تمہیں ایک طریقہ کار بتایا جائے گا۔ اس طریقے پر چل کر تم مرحلہ وار اپنی منزل تک پہنچ سکتے ہو یعنی سنگھ میں داخل ہو سکتے ہو۔ یہ طریقہ کار کاغذ پر بھی چھپا ہوا ہے۔ یہ کاغذ تم ہوسنگ سے حاصل کر سکتے ہو۔ میں نہیں جانتی تمہارے دل میں کیا ہے لیکن اگر تم واقعی سنگھ میں آ گئے اور بدھا کی روشنی تمہارے دل میں بھر گئی تو یقین کرو اپنے موجودہ خیالات تمہیں بالکل حقیر محسوس ہوں گے اور اپنی موجودہ خواہشات کے بارے میں سوچ سوچ کر تم خود ہنسو گے۔ یہ ایک اور ہی دنیا ہے۔ کاش تم اس دنیا کا تجربہ حاصل کر سکو۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”سون! تم نے ابھی مجھے ایک سچے بھکشو کی خصوصیات بتائی ہیں اور ان اصولوں کا ذکر کیا ہے جن پر ایک اچھا بھکشو عمل پیرا ہوتا ہے۔ گستاخی معاف اگر تمہاری باتوں کو ٹھیک مانا جائے تو پھر مجھے تو تمہارے آس پاس کوئی اچھا بھکشو نظر نہیں آتا۔ بلکہ سرے سے کوئی بھکشو ہی دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے بتایا ہے کہ اچھا بودھی جنسی معاملات سے دور رہتا ہے لیکن یہاں مجھے کچھ ایسے شواہد ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر بھکشو اور لامہ وغیرہ خفیہ طور جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔ تم نے سادہ خوراک کا ذکر کیا ہے مگر مجھے پگوڈا کی سیڑھیوں پر درجنوں ایسے بھکشو ملے ہیں جن کے فربہ جسم اور مٹکوں جیسی توندیں ان کی بے مثال خوش خوراکی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ بھکشو سادہ لباس ضرور پہنتے ہیں لیکن ان کی زندگی سادہ نہیں ہے۔ میں نے ان کے سجے سجائے گھر دیکھے ہیں۔ ان کے باغ، فوارے اور منقش چبوترے دیکھے ہیں۔ تم نے کہا ہے کہ اچھا بھکشو منافقت، جھوٹ، لالچ اور نفرت وغیرہ سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں، میں نے تمہارے چھوٹے گرو کشپال اور اس کے استاد ایلش کو دیکھا ہے۔ وہ جھوٹ اور منافقت کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ وہ ایک طرف تو اپنے مریض کو صحت اور زندگی سے محروم کرتے ہیں، دوسری طرف ان کی ہوس زر...... ان بدنصیبوں کی جیبیں بھی

خالی کرتی ہیں۔ ان کے اندر نفرت اور انتقام کے جذبوں کی گواہی تو خود میں بھی دے سکتا ہوں۔ تمہیں معصوم شیلن کی بیماری کا علم ہوگا۔ میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی لیکن تمہیں بتا رہا ہوں۔ پچھلے دنوں شیلن کی حالت اچانک بگڑ جانے کے ذمے دار گرو کشپال اور گرو ایش تھے۔ میں یہ بات پورے یقین اور ثبوت کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔"

سون اب تک تو میری بات خاموشی سے سنتی رہی تھی لیکن اب وہ مزید خاموش نہیں رہ سکتی۔ گمبھیر لہجے میں بولی۔ "تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا اس طرح کی باتیں کرنے کا۔ میرا اندازہ درست نکلا ہے۔ تمہارے اندر منافقت ہے اور میرے دھرم کے لیے زہر بھرا ہوا ہے۔"

"بالکل نہیں...... بالکل بھی نہیں......" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "میں تمہارے مذہب کو اور مذہب کی تعلیمات کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں لیکن میں ان لوگوں کو احترام کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا جو تمہارے اردگرد جمع ہیں اور جن میں سے اکثر صرف نام کے راہب ہیں۔"

وہ ایک دم تیزی سے بولی۔ "میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتی۔ میں تمہیں فقط یہ بتانے کے لیے یہاں آئی ہوں کہ تم ایک بیکار اور خطرناک کوشش میں اپنا وقت ضائع مت کرو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اگر تمہارے ارادے ظاہر ہو گئے تو یہاں تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ ماضی کا ایک حوالہ میرے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ اسی حوالے کے ناتے میں تم سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ کل شام تک یہاں سے چلے جاؤ اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

"اور اگر میں بدھ مت کے بارے میں واقعی جاننا چاہتا ہوں تو؟"

"تو بھی تم یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہیں مت کے بارے میں معلومات اور جگہ سے بھی مل سکتی ہیں مگر یہاں رہ کر تم جو نقصان اٹھاؤ گے وہ ناقابل تلافی ہوگا۔"

"ابھی تم نے ماضی کے حوالے کی بات کی ہے سون! میں بھی اسی حوالے سے بس ایک بار تم سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے ہوسنگ سے وعدہ کیا ہے کہ ایک بار تم سے مل کر تمہاری بات سنوں گا اور اگر تم کہو گی تو پھر یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔"

"تو پھر اب چلے جاؤ۔" وہ کراہ کر بولی۔

"لیکن ابھی میری شرط پوری نہیں ہوئی۔ تم مجھ سے ملی نہیں ہو سون! اس طرح پردے کے پیچھے بیٹھ کر بات کرنا۔ ملنا تو نہیں ہے۔ میں بس ایک بار تمہیں اپنے سامنے دیکھنا چاہتا

ہوں پھر تمہارا تصور آنکھوں میں محفوظ کر کے آنکھیں بند کر لینا چاہتا ہوں...... پلیز سون! ایک بار...... صرف ایک بار۔ تم جانتی ہو میں کتنی دور سے اور کتنی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب تمہیں دیکھے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا تو کبھی چین سے نہ رہ سکوں گا۔ ممکن ہے کہ میری یہ بے قراری مجھے پھر سے یہاں کھینچ لائے۔ پلیز سون!......"

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹل لہجے میں بولی۔ "میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ایک کے بعد دوسری خواہش جنم لیتی ہے۔ تم نے مجھ سے باتیں کر لی ہیں۔ اب تم مجھے دیکھنا چاہتے ہو پھر مجھے چھونا چاہو گے۔ میں یہ نہیں کر سکتی اور نہ مجھ سے اس قسم کی کوئی توقع رکھنا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اگر میرے اور تمہارے درمیان کچھ تھا تو وہ ختم ہو چکا اب اسے بھول جاؤ۔ اب میں جانا چاہتی ہوں۔"

"لیکن میں جانا نہیں چاہتا۔ میں تمہیں دیکھے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ کسی صورت نہیں جاؤں گا۔"

اچانک دروازے میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کے عقب سے ہوسنگ نکل کر سامنے آ گئی۔

وہ خشک لہجے میں بولی۔ "مسٹر شاداب! یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرو گے۔ تم نے سون سے مل لیا ہے اور اس کی باتیں بھی سن لی ہیں۔ پلیز! اب تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔"

اچانک ایک عجیب سی خودسری و بے پروائی میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس کیفیت میں ایک طرح کی کوتاہ اندیش ضد بھی شامل تھی۔ "نہیں ہوسنگ!" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ "میں سون کو دیکھے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

"تم بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے بلکہ ہم سارے پھنس جائیں گے۔ گھر کے مرد بس آنے ہی والے ہیں۔" ہوسنگ کی آواز لرز رہی تھی۔

"مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ جو ہونا ہے ہو جائے۔ زیادہ سے زیادہ میری جان ہی چلی جائے گی ناں۔ مجھے منظور ہے۔" اپنی آواز مجھے اجنبی محسوس ہو رہی تھی۔ جذبات کے بوجھ نے آواز کے آہنگ کو کیا سے کیا کر ڈالا تھا۔

ہوسنگ نے میری صورت دیکھی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ وہ ادھیڑ عمر عورت بھی ڈری سہی اندر آ گئی جو ہمیں یہاں تک لائی تھی۔ ہوسنگ نے ایک بار پھر مجھے

سمجھانے بجھانے کی کوشش کی مگر میں اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ وہ بڑے کشیدہ لمحے تھے۔ پردے کی دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔ مجھے اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں سون چلی ہی نہ گئی ہو لیکن کمرے کی ساخت بتا رہی تھی کہ یہاں کوئی اور دروازہ موجود نہیں ہے۔

جب تکرار بہت بڑھ گئی اور میں نے سون سے ملے بغیر جانے سے صاف انکار کر دیا تو پردے کے عقب سے سون کی آواز آئی۔ اس نے ہوسنگ کو اپنے پاس بلایا۔ ہوسنگ نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''تم اپنے دوست کے پاس جا کر بیٹھو۔ میں ابھی تم سے بات کرتی ہوں۔''

میں درمیانی کمرے سے گزر کر حمزہ کے پاس چلا گیا۔ تکرار کی آوازیں یقیناً اس تک بھی پہنچتی رہی تھیں۔ وہ بے قراری کے عالم میں کھڑا تھا۔ چراغ کی روشنی میں حمزہ کا طویل سایہ دیوار پر لرز رہا تھا۔ طاق دان میں بدھا کے چھوٹے چھوٹے دھاتی مجسمے پر اسرار دکھائی دیتے تھے۔ قریبی چوراہے سے بانسری کی سریلی آواز گاہے گاہے ابھرتی تھی اور اطراف میں پھیل جاتی تھی۔ یہ وہی بانسری نواز بچے تھے جو اکثر چوراہے کے چبوترے پر بیٹھے رہتے تھے۔ میرے تاثرات دیکھ کر حمزہ بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ''کیا بات ہے۔'' اس نے میرا شانہ تھام کر پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں۔ بس تھوڑی سی تکرار ہو گئی ہے۔''

''سون سے ملے ہو؟''

''ملا بھی ہوں اور نہیں بھی۔''

''یار مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟''

''تھوڑی دیر ٹھہرو پھر سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال میری گزارش ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ میں ابھی بیس پچیس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

''یار! تم کیوں میری سلامتی کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ تم جاؤ یہاں سے، تم بات مانتے کیوں نہیں ہو۔'' میں نے سخت جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرے لہجے سے حمزہ کو دھچکا لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا۔ دروازہ کھلا اور ہوسنگ اندر آ گئی۔ اس نے ایک نگاہ میرے تپے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر [illegible]

لہجے میں بولی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

میں اٹھ کر ہوسنگ کے پیچھے چل دیا۔ درمیانی کمرے میں پہنچ کر ہوسنگ بولی۔ ''مسٹر شاداب! آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ آپ نے وعدے کی خلاف ورزی کی ہے۔ بہرحال آپ سون سے مل لیں لیکن یہ ملاقات دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔'' اس نے مریضہ لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے والد اور بھائی بس ابھی پانچ دس منٹ میں پہنچنے ہی والے ہیں وہ گھر میں غیر مردوں کی موجودگی کسی طور برداشت نہیں کریں گے۔''

میں نے سون والے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ ہوسنگ نے پھر کہا۔ ''مسٹر شاداب! آپ جانتے نہیں کہ ہم سب اس وقت کتنے خطرے میں ہیں۔ آپ دو تین منٹ سے زیادہ مت لیں۔ ورنہ جو کچھ ہوگا اس کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔''

میں سنی ان سنی کرتے ہوئے سون والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے پردہ ہٹا لیا اور دوسری طرف چلا گیا۔ وہ بید کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ یہاں دو تین کرسیاں اور بھی موجود تھیں۔ سون نے وہی گیروا کپڑے پہن رکھے تھے جو وہ روز پہن کر مٹھ سے نکلتی تھی اور پگوڈا کی طرف جاتی تھی۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ وہ کچھ اور نکھر گئی تھی۔ کچھ اور اجلی ہو گئی تھی۔ ماہ و سال نے اس کے نقوش اور سراپا میں بہت معمولی تبدیلی کی تھی۔ اس کی جلد کی غیر معمولی چمک دمک میں بھی بہت تھوڑا فرق پڑا تھا۔

اس جلد کو دیکھ کر شیشے کا گمان ہوتا تھا۔ نظر اس شیشے پر ٹکتی نہیں تھی۔ پھسل جاتی تھی۔ آج پہلی بار میں اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس سادگی نے اس کے اندر کی چمک اور اجلے پن کو نمایاں کر دیا تھا۔ حیرانی کی بات تھی یہ اجلا پن اس وقت بھی سون کے چہرے پر موجود تھا جب وہ گندگی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ جب بنکاک کے عشرت کدوں میں وہ ہر رات ایک نئے بستر پر سوتی تھی۔ میں نے سینکڑوں بار سوچا تھا۔ یہ معصوم اجلا پن کس طرح اور کیونکر سون کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اندر سے ہمیشہ ''پاکباز'' ہی رہی تھی اور اب بھی پاکباز تھی۔ بنکاک کے عیاش سون کے جسم سے کھیلتے رہے تھے لیکن سون نے خود کو جسم سے بالکل الگ کیے رکھا تھا۔

چند سیکنڈ تک میری آنکھیں سون کی آنکھوں میں گڑی رہیں پھر سون نے پلکوں کی

چلمن گرالی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں کے راستے دل میں اتار رہا تھا۔ میری نگاہوں کی تپش سے بے چین ہو کر اس نے پہلو بدلا۔ میں نے عجیب لرزتی سی آواز میں کہا۔ ''سون! تم قریباً ویسی ہی ہو جیسا آج سے چار پانچ سال پہلے میں نے تمہیں چھوڑا تھا۔ وہی رخسار، وہی آنکھیں، وہی ٹھوڑی، بس تمہاری پیشانی پر اس چھوٹے سے داغ کا اضافہ ہوا ہے۔ اس چاند پر یہ داغ کیسے آیا۔''

اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ داغ چنکی کے مظالم کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔''

اس کی پلکیں پھر جھک گئیں۔ تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ میرا اندازہ درست ہے۔

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''میں نے تمہاری شرط مان لی ہے۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ ہے، اب یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ تم اس طوفان کے بارے میں نہیں جانتے جو تمہارے یہاں موجود رہنے سے ہمیں برباد کر سکتا ہے۔ میں اپنے گلے میں ذلت کے ہار برداشت نہیں کر سکتی اور نہ تمہیں زخمی یا قتل ہوتے دیکھ سکتی ہوں۔ تم یہاں کی پیچیدگیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اب زیادہ دیر مت کرو۔ ہو سکے تو آج ہی چلے جاؤ۔ میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔ تمہیں سکون ملے گا۔ تم بہت اچھی زندگی گزارو گے۔ تم بہت اچھے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی میں تمہارے ساتھ اچھا ہی ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا کروں گی۔''

''اگر مجھے دعا کے بجائے۔ دوا کی ضرورت ہو تو؟'' الفاظ آپ ہی آپ میرے ہونٹوں سے نکل گئے۔

اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا گزرا، پھر وہ بولی۔ ''دوا بھی دعا سے ہی ملتی ہے اور اصل دوا وہ ہوتی ہے جو وقتی نہیں دائمی شفا دیتی ہے۔ نفسانی خواہشیں اور ان خواہشوں کا پورا ہونا وقتی افاقہ ہے جس کے بعد درد مزید شدت سے ابھرتے ہیں۔ دائمی شفا اور سکون کا ماخذ روحانیت ہے۔ ہمیں جسم سے ناتے توڑ کر روح سے ناتے جوڑنے ہوتے ہیں۔ میں دعا کیا کروں گی کہ تم اس حقیقت کو کچھ سمجھ سکو اور جب تم سمجھ جاؤ گے تو پھر تمہیں کسی چیز کی حسرت نہیں رہے گی۔ سب کچھ بھول جاؤ گے۔''

''غلط ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ زندگی کی آخری سانس تک بھی نہیں۔''

میری نگاہ اس کے حسین سرخی مائل ہونٹوں پر تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ یہی ہونٹ تھے جو ایک جگمگاتی رات میں میرے بہت قریب آ کر بہت دور چلے گئے تھے۔ برسوں بعد میں ان ہونٹوں کو پھر دیکھ رہا تھا مگر آج یہ ہزاروں لاکھوں میل کی دوری پر محسوس ہوتے تھے۔

''وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے۔'' سون کی آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔

''مگر بگڑے ہوئے زخموں پر یہ مرہم بھی کارگر نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اب تمہیں چلے جانا چاہئے۔'' وہ بولی۔ اس کے لہجے میں ایک دردناک عجلت تھی۔ وہ جیسے جلد از جلد مجھ سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ اپنے اندر کی اتھل پتھل سے خوف زدہ ہونے لگی ہے۔

''کیا آج کے بعد ہم کبھی نہیں ملیں گے۔'' میں نے اپنے اندرونی کرب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''مگر میں اپنے دل کا کیا کروں گا۔ یہ تو ساری زندگی ہر گھڑی تمہیں یاد کرے گا۔ ہر شب، ہر صبح، ہر موسم میں، ہر موڑ پر مجھے اتنی کڑی سزا کیوں دے رہی ہو۔ اتنے سخت امتحان میں کیوں ڈال رہی ہو۔ میں یہاں سے جا کر انتظار کی ایک ایسی سولی پر لٹک جاؤں گا جو مجھے مرنے دے گی، نہ جینے دے گی۔''

اس کی پیشانی پر بیزاری کی شکنیں ابھریں۔ وہ جیسے اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ بے لچک لہجے میں بولی۔ ''جسے تم انتظار کہہ رہے ہو یہ نفسانی خواہشوں کی ہٹ دھرمی کا نام ہے تم بالکل انتظار مت کرنا۔ کسی بھی طرح کا انتظار مت کرنا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ آس امید اور انتظار تو فطرت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ انہیں جھٹلانا فطرت کو جھٹلانا ہے۔ انتظار تو...... اس پرندے نے بھی کیا تھا جو ایک بلند درخت پر بیٹھ کر دور تک دیکھتا تھا اور سوچتا تھا۔ جو اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح سمندر میں گم ہونے والی لہریں پھر پلٹ کر کنارے پر آتی ہیں۔ جس طرح رات کو تھم جانے والی ہوا صبح کے وقت پھر چلنے لگتی ہے، جس طرح گم ہونے والا سورج دوبارہ آسمان پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا ساتھی جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا ایک دن پھر آ جائے گا۔ تمہیں یاد ہے ناں؟''

سون کی نہایت شفاف پیشانی پر پسینے کی نمی نمودار ہو رہی تھی۔ لیمپ کی زرد روشنی میں

اس کا چہرہ یکسر سپاٹ دکھائی دے رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب وہ ایک لمحہ بھی یہاں رکنا نہیں چاہتی۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ بھی نہیں پوچھو گی کہ اتنا عرصہ میں کہاں رہا۔ تمہیں کیسے یاد کرتا رہا۔ تم تک کیسے پہنچا؟''

''نہیں مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ نہ ہی تم مجھے بتانے کی کوشش کرو۔ اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

اس کا لہجہ بہت حوصلہ شکن تھا۔ اس کا ہر لفظ مجھے اندر سے بجھا رہا تھا پھر بھی ان آخری لمحوں میں میرے اندر پتہ نہیں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''تم مجھے ابدی جدائی کی سولی پر لٹکا رہی ہو سون! ٹھیک ہے تمہاری دی ہوئی اس سزا کو قبول کرتا ہوں لیکن سزائے موت پانے والے کی آخری خواہش تو پوری کی جاتی ہے۔ میری یہ خواہش بھی پوری کر دو۔ بس ایک بار مجھے خود کو چھو لینے دو۔ مجھے اپنا ہاتھ تھام لینے دو۔ فقط ایک بار سون! فقط ایک بار...... اس کے بعد میں تمہاری طرف سے رخ پھیر کر چلا جاؤں گا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے......''

''نہیں ...... بالکل نہیں۔'' وہ سرتاپا کانپ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر اس کی گیروا رنگ کی چادر میں اوجھل ہو گئے تھے۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''میں ایک بھکشو ہوں...... میری حیثیت ایک راہبہ کی ہے۔ جو کچھ میں کر چکی ہوں۔ یہی بہت زیادہ ہے۔ خدا کے لیے اب مجھے اور گناہگار نہ کرو۔ پلیز چلے جاؤ یہاں سے......'' وہ بالکل روہانسا ہو رہی تھی۔

میں ہمیشہ رومان پسندی سے دور رہا تھا۔ میں ایک پریکٹیکل شخص تھا۔ جذباتیت کے لیے میرے اندر کوئی جگہ نہیں تھی لیکن پچھلے چند ہفتوں میں میرے ساتھ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے اندر انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ ایسی تبدیلیاں جو خود مجھے بھی حیران کر رہی تھیں۔ ان لمحوں میں ایک عجیب سی دلیری میرے اندر بھر گئی۔ ایک بے خوفی جو مجھے ہر اندیشے سے بے نیاز کر رہی تھی۔ میں نے سون کے چہرے پر نگاہیں گاڑے کہا۔ ''نہیں سون! میں تمہیں چھوئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ فقط ایک بار...... آخری بار۔''

اس نے نمناک آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس کی آنکھوں میں مزید اندیشے جاگ گئے۔ میں اٹل انداز میں بیٹھا رہا۔ معلوم نہیں کیا بات تھی۔ ان لمحوں

میں، میں ہر حد تک جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ حمزہ کا خیال بھی میرے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

چادر کے اندر سون اپنے ہاتھوں کو اضطراری انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا پھر ایک سسکاری لے کر اس نے اپنا سر گھٹنوں پر جھکا دیا۔ اس کا چہرہ مجھ سے چھپ گیا۔ وہ گٹھڑی سی بن کر خاموش بیٹھی تھی۔ یہ نیم رضامندی کا سا انداز تھا۔ اس انداز کو محسوس کرتے ہی میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور چادر کا کونا سرکا کر سون کا نرم ملائم ہاتھ تھام لیا۔ سون کے سراپا میں جھرجھری سی نمودار ہوئی۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ ہاتھ جو ملائمت میں شیشہ اور نرمی میں ریشم تھا۔ وہ بڑے جادوئی لمحے تھے۔ میری ہر جنبش میں بے اختیاری سرایت کر گئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اٹھایا اور میرے ہونٹوں نے اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔ ہونٹوں کے راستے ایک جاں فزا لمحہ میرے رگ و پے میں اتر گیا۔

سون تڑپ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سرتاپا کانپ رہی تھی۔ میں اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ میرے جانے کا انتظار کیے بغیر ہی مڑی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے میں بھی باہر آ گیا۔ حمزہ مجھے تعجب سے دیکھنے لگا۔

❁❁❁

وہ رات میں نے سپیدہ سحر نمودار ہونے تک آنکھوں میں ہی کاٹی تھی۔ سون کی صورت نگاہوں میں جم کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، اس کی آواز...... بس یہی کچھ ذہن میں تھا۔ باقی سب کچھ دور، بہت دور چلا گیا تھا۔ جو کچھ دور چلا گیا تھا اس میں رخشی بھی شامل تھی۔ اس کے بارے میں سوچتا تھا تو لگتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی ہے۔ پتہ نہیں کہ وہ میری زندگی میں کیسے آئی تھی اور کیونکر اتنا عرصہ موجود رہی تھی۔ وہ میری نہیں تھی۔ نہ میں اس کا تھا۔ میں تو ہمیشہ سے سون کا تھا۔ نیوٹروکیڈرو کے ڈائننگ ہال میں سون سے میری ملاقات بہت بعد میں ہوئی تھی، پتایا بیچ پر بھی ہم دونوں بہت بعد میں گئے تھے۔ اس سے بہت پہلے...... شاید کئی صدیاں پہلے ہم ایک دوجے کو جانتے تھے۔ ہمیں ایک دوجے کی تلاش تھی۔ دنیا کے دو مختلف خطوں میں پیدا ہونے کے باوجود، دو مختلف قوموں سے تعلق رکھنے کے باوجود ہم ایک تھے۔ ایک ہی گمشدہ دفینے کے نقشے کے دو ٹکڑے تھے۔ میں سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ سون کے لیے میری اتنی شدید محبت اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی۔ یہ محبت کہاں گھات لگا کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے مجھے کب شکار کیا تھا۔

اس ایک ہی رات میں سون میری نس نس میں بس گئی۔ مجھے اپنے سانسوں سے اس کی مہک آنے لگی تھی۔ مجھے ہر صدا پر اس کی صدا کا گمان ہونے لگا۔

"لگتا ہے کہ رات بھر جاگتے رہے ہو۔" حمزہ نے میری سرخ انگارا آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی انگلیوں میں گولڈ لیف کا سگریٹ تھا۔

"ابھی نہ جانے کتنی راتیں اسی طرح گزرنی ہیں۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟" حمزہ نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"تم سون سے وعدہ کر چکے ہو کہ آج یہاں سے رخصت ہو جاؤ گے۔"

"نہیں میں نے آج کی بات نہیں کی بس یہی کہا ہے کہ ایک دو دن میں چلا جاؤں گا۔"

"کیا تم واقعی چلے جاؤ گے۔" حمزہ نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہو بھی سکتا ہے...... اور نہیں بھی......"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "رات کو میں نے یہی سوچا تھا کہ اب جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں گے لیکن تم جانتے ہی ہو۔ ہم شیلن کو اس کے حال پر چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ یہ ایک طرح سے اس معصوم کا قتل ہوگا۔ شیلن کو اس وقت ایک اچھے اسپتال کی شدید ضرورت ہے۔ ہمیں شیلن کو اپنے ساتھ لے جانا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں جانے سے پہلے کم از کم ایک بار بڑے گرو واشوجت سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم بھی ضرور ملنا چاہو گے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ اگر بڑے گرو سے ملے بغیر چلے گئے تو ذہن میں ہمیشہ تجسس کی پھانس چبھی رہے گی۔"

"میں نے مکھیا کاستو سے بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ہر ماہ دو خاص دنوں میں بڑے گرو عام لوگوں سے ملتے ہیں۔ یہ خاص دن چاند کی تاریخوں کے حساب سے ہوتے ہیں۔ یہ تاریخیں آنے میں بس تین چار دن باقی ہیں۔ کاستو پرسوں پگوڈا گیا ہوا تھا۔ اس نے متعلقہ شخص سے بات کی ہے۔ امید ہے کہ ہم بڑے گرو کو دیکھ پائیں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے بات ہو سکے۔"

حمزہ گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ واپس جانے کے سلسلے میں تمہارا ارادہ ڈانواں ڈول ہو رہا ہو۔"

"تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟"

"پتہ نہیں کیوں لگ رہا ہے۔ سوچتا ہوں کہ جس طرح تم شیلن کے بارے میں سوچ رہے ہو، اسی طرح سون کے متعلق بھی سوچ سکتے ہو۔ جس طرح ہم شیلن کے لیے ہمدردی محسوس کرتے ہیں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے اسی طرح ہم سون کو بھی اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے کوفت محسوس کریں گے۔"

میں خاموش رہا، مجھے کوئی جواب ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔ حمزہ ایک ہلکا کش لے کر بولا۔

"ویسے میں تمہیں ایک بات بتا دوں شادا! مجھے نہیں امید کہ گرو کشپال اور ایش وغیرہ کے ہوتے ہوئے ہم بڑے گرو سے مل پائیں گے۔ یہ لوگ ضرور راستے میں کوئی روڑا اٹکا دیں گے۔"

ہماری باتوں کے دوران میں ہی کارینگ بھی آ گیا۔ اس کا چہرہ کچھ بجھا بجھا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کے پاس کوئی خبر ہے۔

"کیا بات ہے کارینگ! کہاں سے آ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے پہلے تھوڑی سی تمہید باندھی پھر بولا۔ "وہی ہوا ہے جناب! جس کا اندیشہ تھا۔ شیلن والی بات باہر نکل گئی ہے۔ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ شیلن کی حالت بگڑنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے کوئی شے کھلا دی گئی تھی۔ یہ کام بھکشو راہل یا اس کی بیوی نے کیا تھا۔ ادرک اور دال کی کھچڑی میں کچھ ملا دیا گیا تھا جس کے سبب شیلن کی جان لبوں پر آ گئی کچھ لوگ اس بات پر یقین کر رہے ہیں لیکن کچھ کے نزدیک یہ سراسر افواہ ہے۔"

"چھوٹے گرو اور اس کے استاد کا اس بارے میں کیا ردعمل ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان دونوں نے تو اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا...... لیکن راستے میں دو بھکشو ملے تھے انہوں نے دبے لفظوں میں ایک خطرناک بات کہی ہے۔"

"کیا بات......؟" میں نے اور حمزہ نے چونک کر ایک ساتھ پوچھا۔

"ان کا کہنا ہے کہ شاید یہ بات ڈاکٹروں کی طرف سے...... یعنی آپ کی طرف سے چلائی گئی ہے۔"

حمزہ ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ یہاں کے بھکشوؤں میں ہمارے خلاف پہلے ہی مخاصمت کے

جذبات پائے جاتے تھے یہ نیا شوشہ ان لوگوں کو مزید بھڑکا سکتا تھا۔

ہم تینوں کافی دیر اس بارے میں تبصرہ کرتے رہے۔ اکثر عورتوں کے لیے راز کی بات چھپانا بہت مشکل ہوتی ہے۔ جس عورت نے کارینگ سے بات کی تھی وہ بھی غالباً پیٹ کی ہلکی ثابت ہوئی تھی۔ اس کی وجہ سے ہماری مشکلات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میں اور حمزہ اسی وقت کھیا کاستو کے پاس پہنچے۔ کاستو گھر میں ہی تھا، وہ اپنے مکان کے سامنے اپنی بھیڑوں کی اون اتروا رہا تھا۔ ہم نے جھونپڑا نما مکان کے اندر جا کر کاستو سے بات چیت کی۔ بستی کے طول و عرض میں جو خبر گردش کر رہی تھی اس کے بارے میں کاستو بھی جانتا تھا۔ ہم نے کاستو کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کی۔ کاستو کافی حد تک قائل نظر آنے لگا تھا۔ اس نے ہمیں مترجم کارینگ کے ذریعے بتایا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں اون لے کر گروالیش کی طرف جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کرے گا۔ کھیا کاستو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں مہمان ہو اور میں جانتا ہوں، اچھے مہمان ہو۔ تمہاری ذات سے یہاں کے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچا ہے۔ وہ تمہارا نام اچھے لفظوں میں لیا کریں گے۔''

ہم تقریباً ایک گھنٹہ کاستو کے پاس بیٹھے۔ اس نے گرم دودھ اور گھر میں بنائے گئے گرم گرم بسکٹوں سے ہماری تواضع کی اور ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا۔

اپنی رہائش گاہ پر واپس لوٹ کر میں دیر تک چارپائی پر لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ کسی وقت ذہن میں آتا تھا کہ سون کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ کر چپ چاپ یہاں سے نکل جاؤں اور پھر کبھی مڑ کر بھی اس جانب نہ دیکھوں۔ کسی وقت ارادہ ڈانواں ڈول محسوس ہونے لگتا تھا۔ دل درد سے بھر گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے کانوں کے قریب نمی سی محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر چہرے کو چھوا اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ آنکھوں سے گرم گرم آنسو بہہ رہے ہیں۔

میں چور نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چہرے پر ایک میگزین رکھے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے رومال نکال کر جلدی سے آنسو پونچھے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات گئے تک دل و دماغ میں جان گسل کشمکش جاری رہی۔ دھیرے دھیرے اس سوچ کا پلڑا بھاری ہوتا جا رہا تھا کہ مجھے سون کو اس کے حال پر چھوڑ کر یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ آخری ملاقات ہو چکی اور آخری ملاقات کے بعد تو موت اور ابدی جدائی کا اندھیرا ہی ہوتا ہے۔

حمزہ ٹہلنے کے لیے نکل گیا تھا۔ رات نو بجے کے لگ بھگ وہ واپس آیا۔ اس کے چہرے پر الجھن سی تھی۔ میں جانتا تھا کہ شام سے پہلے وہ پگوڈا کی سیڑھیوں کی طرف بھی گیا ہو گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''سون نظر آئی؟''

''ہاں نظر تو آئی لیکن ذرا بدلی ہوئی تھی۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا لباس کچھ بدلا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی سفید چادر اس کے کندھوں پر نظر آ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ہوئے سیڑھیوں کے قریب سے نکل گئی۔ ابھی واپس آتے ہوئے مجھے راستے میں کارینگ ملا ہے۔ وہ ایک نوجوان بھکشو سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے کارینگ کے ذریعے بھکشو سے پوچھا کہ کندھوں پر سفید چادر کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ اس نے بتایا کہ جب کوئی بودھی طویل عرصے کا برت رکھتا ہے یا کسی اور طریقے سے اپنے جسم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ مقامی رواج کے مطابق کندھے پر سفید رومال یا چادر رکھتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ تکلیف پہنچانے سے کیا مراد ہے۔ اس نے بتایا کہ کچھ بودھی چند دنوں یا دو تین ہفتوں کے لیے اپنے جسم کو سخت سردی، سخت گرمی یا مسلسل بے آرامی کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایسا کوئی منت ماننے کے حوالے سے کیا جاتا ہے، یا کسی غلطی کے کفارے کے طور پر یا پھر کبھی ویسے ہی خود کو روحانی طور پر مضبوط بنانے کے لیے اس قسم کا عمل کیا جاتا ہے۔''

میرے ذہن میں فوراً کل رات کے مناظر گھوم گئے۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں نے سون کا ہاتھ تھاما تھا، اس کے چہرے پر کیسا زلزلہ نمودار ہوا تھا اپنے ہاتھ کی پشت سے میرے ہونٹوں کے چھوتے ہی وہ تڑپ گئی تھی اور ایک لمحہ رکے بغیر باہر نکل گئی تھی۔ اس نتیجے پر پہنچنا کچھ زیادہ دشوار نہیں تھا۔ کہ سون اس وقت اپنے دل و دماغ پر بہت بھاری بوجھ لے کر بیٹھی ہو گی۔ اگر اس کے کندھے پر نظر آنے والا سفید کپڑا واقعی کسی برت یا خود اذیتی کی علامت تھا تو پھر اس خود اذیتی کا تعلق یقیناً کل رات والے واقعات سے تھا۔ وہ جو کچھ ہوا تھا واقعی غیر معمولی تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ ہوا تھا اور میرے ہاتھوں ہوا تھا۔

حمزہ اور میں دیر تک گفتگو کرتے رہے اور سوچتے رہے۔ عجیب اندیشے میرے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے۔ وہ سر پھری لڑکی اپنی ''غلطی'' کے کفارے کے طور پر اپنے ساتھ نہ

جانے کیا کرنے والی تھی۔ وہ پہلے ہی بہت سخت اور کٹھن زندگی گزار رہی تھی۔ اب اس میں اور پتہ نہیں کہ کیا کٹھنائی شامل کرنے والی تھی۔

یہ اگلے دن کا واقعہ ہے۔ بہت صبح سویرے جب ابھی چڑیاں بھی چہکنا شروع نہیں ہوئی تھیں ہمارے جھونپڑا نما مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے شیلن کی والدہ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پہلے تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں شیلن کو کچھ ہو نہ گیا ہو پھر اچانک میری نگاہ عورت کے عقب میں گئی اور میں وہاں شیلن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے ایک ڈبی دار چادر اس طرح اوڑھ رکھی تھی کہ سر اور تین چوتھائی چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔

وہ دونوں اندر آنا چاہ رہے تھے۔ میں پہلے تو جھجکا پھر ان کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ گیا۔ شیلن نے نیکر پہن رکھی تھی۔ اس کی دبلی پتلی ٹانگیں چادر کے نیچے سے نظر آ رہی تھیں۔ وہ ہرن کے معصوم بچے کی طرح کھلی کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی والدہ مقامی زبان میں تیزی سے کچھ بولتی چلی جا رہی تھی۔ اتنے میں کارینگ بھی بیدار ہو گیا۔ اس نے عورت کی ترجمانی کرتے ہوئے مجھے بتایا۔ ”یہ شرمندگی کا اظہار کر رہی ہے اور آپ سے معافی مانگ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ وہ اور اس کا خاوند تہ دل سے آپ کی قدر کرتے ہیں۔ اس روز جب آپ دونوں کو شرمندہ ہو کر ان کے گھر سے آنا پڑا انہیں بے انتہا افسوس ہوا تھا مگر وہ گروایش اور گروکشپال کے سامنے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔

میں نے کارینگ کے ذریعے عورت سے کہا۔ ”خاتون! تمہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ تمہارا بہت شکریہ کہ تم نے ہمارے بارے میں محبت سے سوچا۔“

عورت بولی۔ ”میں آپ کی منت کرتی ہوں کہ میرے بچے کے لیے کچھ کریں۔ یہ میرے دل کی آواز ہے کہ میرے شیلن کی زندگی آپ کے وسیلے سے ہی بچ سکتی ہے۔ آپ ہمیں...... کسی طرح یہاں سے لے جائیں۔ اگر آپ ہمیں لے کر نہ گئے تو گروایش آسیب بن کر ہمارے اوپر سوار ہو جائے گا۔ وہ ہمیں کہیں جانے نہیں دے گا۔ اس نے اور گروکشپال نے ہمیشہ اپنی مرضی کی ہے۔ ان کی یہ من مانی میرے بچے کی جان نہ لے جائے۔“

ماں نے بے چین ہو کر شیلن کو سینے سے لگا لیا اور اس کے سر پر لگاتار بوسے دینے لگی۔ شیلن گم صم کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ”خاتون! تمہیں شیلن کے سامنے اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ بچے ایسی باتوں کا بہت اثر قبول کرتے ہیں۔“

میں نے شیلن کو گود میں بٹھایا۔ وہ بیماری کے سبب تنکے کی طرح ہلکا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اس کے سر پہ پیار دیا۔ وہ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی والدہ بولی۔ ”آپ دونوں کو ہر وقت یاد کرتا ہے۔ کہتا ہے بودھا نے آپ دونوں کی صورت میں آرام کے دیوتا بھیجے ہیں۔ وہ مجھے بالکل بھلا چنگا کر دیں گے۔“

حمزہ بھی اٹھ گیا تھا۔ ہم دونوں نے جلدی جلدی شیلن کا معائنہ کیا۔ اس کے سینے میں بلغم تھا اور ہلکا بخار بھی ہو رہا تھا ہم نے اسے ایماکسل اور پیراسٹامول وغیرہ دی۔

میں نے اور حمزہ نے عورت کو سمجھایا کہ وہ تسلی رکھے۔ ہم سے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بچے کے لیے کر رہے ہیں لیکن وہ دوبارہ اس طرح یہاں آنے کی کوشش نہ کرے۔ جو لوگ ہماری مخالفت میں لگے ہوئے ہیں وہ ایک دم بھڑک اٹھیں گے۔

”لیکن...... اگر شیلن کو کوئی تکلیف ہوئی...... اور اس نے آپ کے پاس آنے کی ضد کی تو؟“

”بس دو چار دن کی بات ہے۔ امید ہے کہ شیلن اس دوران ٹھیک رہے گا۔“

شیلن کو ہم نے کچھ چاکلیٹس دیں جو اس نے شرماتے ہوئے قبول کر لیں۔ اس کے بعد وہ اپنی والدہ کے ساتھ چلا گیا۔

شام تک سون کا چہرہ بار بار نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اس کے ساتھ جو چند پل میں نے گزارے تھے وہ ذہن سے چپک کر رہ گئے تھے۔ چراغ کی ٹمٹماتی لو میں اس کا آئینہ چہرہ۔ اس کے شفاف مرمریں ہاتھ پر میرے ہونٹوں کی مہر...... پھر اس کا تڑپ کر باہر نکل جانا اور اب...... اب نجانے وہ اپنے ساتھ کیا ستم کر رہی تھی۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے میں اور حمزہ حسب معمول اپنی رہائش گاہ سے نکلے اور ٹہلنے والے انداز میں پگوڈا کی سیڑھیوں کی طرف چل دیئے۔ سون کو ایک بار پھر دیکھنے کی پیاس اس بری طرح جسم میں پھیلی تھی کہ اپنا سراپا صحرا محسوس ہو رہا تھا۔

سیڑھیوں پر حسب معمول رونق تھی۔ سفید جنگلی پھولوں کے ہار گجرے اور گلدستے کثرت سے نظر آ رہے تھے۔ خبر نہیں کہ یہ خاص قسم کے سفید پھول اتنی بڑی مقدار میں ہر

روز کیسے جمع کر لیے جاتے تھے۔ ہم اس جگہ آ کر بیٹھ گئے جہاں مٹھ سے نکلنے والے راستے کا فاصلہ سیڑھیوں سے کم سے کم تھا۔ سورج ہمارے سامنے مغربی درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ دور پگڈنڈیوں پر سفر کرتے ہوئے بکریوں کے ریوڑ بستی کی جانب لوٹ رہے تھے۔ روزانہ کی طرح مٹھ سے گیروا کپڑوں والے بھکشوؤں کی قطار نکلی اور پگوڈا کی طرف چل دی۔

''میرا خیال ہے کے آج وہ قطار میں شامل نہیں۔'' حمزہ نے افسردگی سے کہا۔

وہ واقعی نہیں تھی۔ پتہ نہیں کہ مٹھ میں تھی یا پھر پگوڈا میں۔ اس کے حوالے سے ان گنت اندیشے ذہن میں سر اٹھانے لگے۔ بھکشوؤں کی طویل قطار پگوڈا میں داخل ہو گئی۔ اندر سے گھنٹیوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

''میرا اندازہ ہے کہ وہ پگوڈا میں ہو گی۔ ہم پگوڈا کے بڑے دروازے میں کھڑے ہو کر اندر جھانکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں دکھائی دے جائے یا پھر اس کے بارے میں کسی سے کچھ معلوم ہی ہو جائے۔''

''چلو آؤ۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم دھیمے قدموں سے پگوڈا کی طرف بڑھنے لگے۔ کچھ اوپر گئے تو بہت سے بھکشو سیڑھیوں پر ہی آلتی پالتی مارے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی مالائیں تھیں اور وہ کوئی جاپ وغیرہ کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی بہت سے مقامی افراد ایک طویل قطار کی شکل میں کھڑے تھے۔ ان سب کی پنڈلیاں ننگی تھیں۔ ان ننگی پنڈلیوں پر استرے سے چھوٹے چھوٹے چیرے دیئے گئے تھے۔ جہاں جہاں سے خون رس رہا تھا وہاں وہاں جو نکیں چمٹی ہوئی تھیں۔ جونکیں جب خون چوس چوس کر پھول جاتی تھیں، بھکشو انہیں تانبے اور پیتل کے برتنوں میں نچوڑ دیتے تھے۔ ایسے بیسیوں برتن سیڑھیوں پر پڑے تھے اور ان میں خون موجود تھا۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ جونکیں صرف گندا اور فاسد خون چوستی ہیں اور جونکیں لگوانے سے انسان صحت مند ہو جاتا ہے اور اس کی عمر میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی مقامی توہمات میں سے ایک وہم تھا۔)

سیڑھیوں پر قائم کیے جانے والے اس عارضی ''کلینک'' کی وجہ سے پگوڈا کی طرف جانے والا راستہ مسدود تھا اور زائرین کو آگے جانے سے منع کیا جا رہا تھا۔ ہم بھی واپس مڑ آئے۔ واپسی پر ہم سیڑھیوں سے اترنے کے بجائے ایک پگڈنڈی پر ہو لیے۔ یہ پگڈنڈی

درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نشیب میں پہنچتی تھی۔ دائیں جانب ساٹھ ستر فٹ گہری کھائی تھی جس کی تہ میں پتھر دکھائی دے رہے تھے اور وہ کاٹھ کباڑ نظر آ رہا تھا جو زائرین نے سڑھیوں پر سے پھینکا تھا۔ میں آگے جا رہا تھا اور حمزہ مجھ سے ایک قدم پیچھے تھا۔ ہم سون ہی کی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔

حمزہ کو یقین تھا کہ سون نے کوئی خاص قسم کا بھرت رکھ لیا ہے اور مٹھ یا پگوڈا کی چار دیواری تک محدود ہو گئی ہے۔ شام کا جھٹپٹا اب اندھیرے میں بدل رہا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں قدموں کی آواز سنائی دی، جیسے کوئی بھاگ کر میرے اور حمزہ کی طرف آیا، میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا لیکن کافی دیر ہو چکی تھی۔ ایک پرچھائیں سی حمزہ کی طرف جھپٹ رہی تھی۔ میں نے اضطراری طور پر حمزہ اور پرچھائیں کے درمیان آنے کی کوشش کی۔ مجھے ایک شدید دھکا لگا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا میں اچانک ہوا میں معلق ہو گیا۔ یک لخت آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ گئے۔ میں بڑی تیزی سے نیچے گر رہا تھا، پھر میں سخت زمین سے ٹکرایا۔ چند لمحوں کے لیے یہی محسوس ہوا کہ ارد گرد گہرا اندھیرا چھا گیا ہے۔ مجھے اپنی بائیں ٹانگ بالکل سن محسوس ہو رہی تھی۔ میں لڑکھڑایا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بلندی سے حمزہ کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ مجھے پکارتا ہوا تیزی سے نیچے آ رہا تھا۔

چند لمحے بعد حمزہ نیچے پہنچ گیا۔ اٹھنے کے بعد میرا دھیان سب سے پہلے اپنے بائیں بازو کی طرف گیا تھا۔ میں آستین الٹا کر بازو کو دیکھنے لگا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ شدید چوٹ آئی ہے۔ حمزہ نے پہلے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرا، پھر بازو کو ہلانے جلانے لگا۔ کندھے کے پاس سے ہڈی کے کھسکنے کی آواز آئی۔ دراصل کندھا اتر گیا تھا، حمزہ کے ہلانے جلانے سے کندھے کا گولا پھر سے ''فٹ'' بیٹھ گیا۔ میں نے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں میں ٹھیک ہوں۔''

''ٹھیک کہاں ہو۔'' حمزہ بڑے کرب سے بولا۔ ''تمہاری کہنی تو ٹوٹ گئی ہے۔''

حمزہ کے توجہ دلانے پر میں نے کہنی کو دیکھا۔ وہ سوج کر لڈو بنتی جا رہی تھی۔ واقعی مجھے سنگین چوٹ آ گئی تھی۔ حمزہ کا سہارا لیتے ہوئے میں آہستہ آہستہ نشیب سے اوپر آنے لگا۔ میرا منہ بالکل خشک ہو گیا تھا۔ سر سے بھی خون رسنے کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے گرنے کے بعد حمزہ نے کئی بار مجھے بلند آواز سے پکارا تھا۔ غالباً یہ آوازیں سن کر ہی دو تین افراد

اوپر درختوں میں نظر آنے لگے تھے۔ وہ پُرتجسس انداز میں نشیب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

حمزہ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا اور بولا۔ ''سر پر تو زیادہ چوٹ نہیں آئی لگتا ہے کہ پتھروں پر نہیں گرے ہو۔''

''کون لوگ تھے وہ؟''

''کچھ پتا نہیں چلا، دو بندوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے میں نے...... لگتا ہے کہ جلکشو تھے۔'' حمزہ نے جواب دیا اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

درختوں کے قریب نظر آنے والے دو افراد سنبھل کر نیچے اترے اور حمزہ کے ساتھ مل کر مجھے سہارا دینے لگے ان میں سے ایک شخص نے انگریزی میں پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''دو بندے دھکا دے کر بھاگ گئے ہیں۔'' حمزہ نے کانپتی آواز میں کہا۔

ٹھیک دس منٹ بعد میں کھیا کاستو کے مکان پر موجود تھا اور چٹائی پر سیدھا لیٹا تھا۔ میری بائیں کہنی بہت بُری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ یہ جوڑ کا بہت پیچیدہ اور سنگین فریکچر دکھائی دیتا تھا۔ بایاں پاؤں بھی سوجتا چلا جا رہا تھا۔ سر پر ٹانکے لگائے جانے کی ضرورت تھی۔ کھیا کے گھر سے باہر کافی لوگ جمع ہو چکے تھے اور چہ میگوئیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حمزہ اپنا میڈیکل باکس لینے گیا ہوا تھا جب کھیا کا چھوٹا بھائی ایک سیاہ رنگ کے عجیب صورت معالج کو لے کر موقع پر پہنچ گیا۔ کارینگ نے میری کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمارے علاقے میں ہڈیاں جوڑنے کا سب سے بڑا ماہر ہے۔ سمجھیں کہ ہڈیوں کے علاج میں اس کی وہی حیثیت ہے جو عام علاج میں گروایش کی ہے۔''

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم حمزہ کو آ لینے دیں۔''

کاستو نے بڑی محبت سے میرا شانہ تھپکا اور کارینگ کی وساطت سے بولا۔ ''تم بالکل فکر نہ کرو۔ یہ شخص کرچی کرچی ہڈیوں کو بھی بڑے اچھے طریقے سے ٹھیک کر لیتا ہے۔''

میرے منع کرتے کرتے بھی سیاہ فام معالج نے میرے بازو سے کھینچا تانی شروع کر دی۔ اس نے پہلے بازو پر کوئی بدبودار تیل ملا، پھر اپنی دانست میں کہنی کی ہڈیوں کو صحیح جگہ پر بٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جانتا نہیں تھا کہ میرا کتنا نقصان کر رہا ہے۔ میرے پٹھے اندر سے زخمی ہو رہے تھے۔ میں جھلا کر اپنا بازو اس سے چھڑانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میری مشکل قدرے آسان ہو گئی۔ حمزہ اپنے باکس کے ساتھ ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے سیاہ فام معالج کی حرکات دیکھ کر اسے پیچھے ہٹا دیا اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق میری

کہنی کا معائنہ کرنے لگا۔ اندر سے ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حمزہ کے چہرے پر تشویش کے سائے گہرے ہو گئے۔ اس نے پاؤں کا بھی معائنہ کیا پھر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ''کارینگ! شاداب کو فوری طور پر کسی اسپتال لے جانے کی ضرورت ہے، ورنہ سخت مشکل ہو جائے گی۔'' اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

میں خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا کہ اسپتال جائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ہم ایک دور دراز بستی میں تھے۔ اس بستی میں پہنچتے ہوئے ہم راستوں کی دشواری دیکھ ہی چکے تھے۔

کارینگ، کاستو اور حمزہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چلے گئے اور سر جوڑ کر مشورہ کرنے لگے۔ درد سے میرا برا حال تھا، آنکھوں کے سامنے گاہے گاہے تاریکی چھانے لگی تھی۔ سیاہ فام معالج نے قسائیوں کے انداز میں جس طرح بازو کو اکھاڑا پچھاڑا تھا اس نے درد کو شدید کر دیا تھا۔

حمزہ اور کاستو وغیرہ کے مشورے میں دو تین افراد مزید شامل ہو گئے۔ چار پانچ منٹ بعد حمزہ میرے پاس آیا اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ''شادا! مجھے لگ رہا ہے کہ تمہاری پنڈلی کی ایک ہڈی بھی فریکچر ہو گئی ہے۔ ہمیں فوری طور پر اسپتال پہنچنا ہوگا۔ بارش کی وجہ سے راستے بھی خراب ہیں۔ بنکاک وغیرہ پہنچنے کا تو فی الحال سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ یہاں قریب ہی کوپنا نام کا ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک اسپتال موجود ہے۔ وہاں چلے چلتے ہیں۔ پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔''

''جائیں گے کیسے؟''

''کارینا چھکڑے کا انتظام کرنے لگا ہے۔ اس پر گدا وغیرہ بچھا لیتے ہیں۔''

دس پندرہ منٹ بعد میں چھکڑے میں بانس کی پٹیوں سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے نیچے ایک نرم گدیلا تھا۔ بازو گردن میں جھول رہا تھا۔ حمزہ میرے پہلو میں بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے درد کش دوا دے دی تھی۔ حمزہ کے علاوہ کارینگ اور کھیا کاستو کا چھوٹا بھائی نوشے بھی ہمارے ساتھ تھا۔ چاندنی رات تھی پھر بھی جنگل میں بلند درختوں کی بھرمار کی وجہ سے اکثر جگہ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ چھکڑے کے دونوں گھوڑے بڑی احتیاط سے قدم اٹھا رہے تھے۔ درد کش دوا اثر کر رہی تھی۔ حمزہ نے ہلکا سا ''ٹرنکولائزر'' بھی دیا تھا۔ درد کے باوجود میری پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ اونگھتے ہوئے ذہن کے ساتھ میں مسلسل سوچ رہا تھا

کہ مجھے اور حمزہ کو اتنی بے رحمی سے نشانہ بنانے والے کون تھے؟ اس سوال کا جواب ذہن میں آتے ہی گرو ایش اور گرو کشپال کے تمتماتے ہوئے چہرے نگاہوں میں گھومنے لگتے تھے۔ اس امر کا ننانوے فیصد امکان تھا کہ تاریکی سے نکل کر ہم دونوں پر جھپٹنے والے گرو ایش یا کشپال کے چیلے تھے۔

ہم قریباً ڈھائی گھنٹے میں اسپتال پہنچ گئے۔ اسپتال کی حالت زار دیکھ کر رونا آیا۔ یہ اسپتال تین چار نیم پختہ بیرکوں کی شکل میں تھا۔ تیز بارشوں کے سبب ایک بیرک کی چھت ڈھے چکی تھی اور وہاں تین چار گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اسپتال کے احاطے میں ایک نشیبی جگہ پر پانی جمع تھا اور وہاں مچھروں کی بہتات تھی۔ تیل کے بہت سے خالی ڈرم اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ جنریٹر کی آواز آ رہی تھی اور تین چار بیمار روشنی والے بلب اسپتال کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ایک جگہ شعبہ حادثات کا زنگ آلود بورڈ لگا تھا۔ اس بورڈ کے عین نیچے ایک جاں بلب تھائی بوڑھا گھاس پر لیٹا تھا اور ایک نوجوان جو غالباً اس کا بیٹا تھا اسے پنکھا جھلنے میں مصروف تھا۔

کارینگ اور حمزہ مجھے سہارا دے کر اندر آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ تھیٹر کی حالت زار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ آپریشن ٹیبل پر ابھی ابھی کسی ملازم نے کھانا کھایا تھا اور ٹیبل پر خالی پلیٹوں کے اندر چچوڑی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں۔ حمزہ اور کارینگ نے بھاگ دوڑ کر کے ایک ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر مہیا کیا۔ رات دو بجے کے قریب میرا علاج معالجہ شروع ہوا۔

❁❁❁

میں اسپتال کے خستہ حال وارڈ میں تھا۔ میرے بازو کا آپریشن ہوئے چار دن گزر چکے تھے۔ حمزہ اور مقامی ڈاکٹر ہربنس سنگھ نے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو ٹھیک جگہ بٹھا کر پلاسٹر چڑھا دیا تھا۔ پاؤں کے فریکچر کو ایسے ہی رہنے دیا گیا تھا۔ امید تھی کہ مکمل آرام سے یہ فریکچر ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے سر میں دس ٹانکے لگے تھے۔

حمزہ دن رات میرے سرہانے موجود تھا۔ اس نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ کئی بار میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ میں ڈانٹ ڈپٹ کر اسے مجبور کرتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے آرام کر لے۔ دو بار کھیا کاستو بھی یہاں آ کر میری مزاج پرسی کر چکا تھا۔ اس اسپتال کی حالت نہایت ناگفتہ بہ تھی۔ ڈاکٹر غائب مشینری ناموجود، کوئی یہاں کا پرسان

حال نہیں تھا۔ میرے خیال میں اگر ڈاکٹر ہربنس نہ ہوتا تو یہ مضافاتی اسپتال کب کا بند ہو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر ہربنس ایک قابل قدر شخص تھا۔ عمر یہی کوئی تیس پینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ کلین شیو سکھ تھا۔ اس کے والد اور دادا بھی تھائی لینڈ میں ہی رہے تھے۔ بنکاک کی بوبے مارکیٹ میں ان کا کپڑے کا کاروبار تھا جو تین نسلوں کی محنت سے کافی پھل پھول چکا تھا۔ ہربنس کے دو بڑے بھائی اس کاروبار سے منسلک تھے جبکہ ہربنس پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن گیا تھا۔ وہ ایک نہایت نفیس اور ہمدرد شخص تھا۔ مقامی بھکشوؤں کی شرارتوں اور چیرہ دستیوں کے باوجود وہ بڑی جرات سے اس اسپتال میں اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ علاقے میں گاہے گاہے ملیریا پھیلا رہتا تھا اور بہت سے افراد جن میں اکثریت بچوں کی ہوتی تھی لقمہ اجل بن جاتے تھے۔ ایسے دنوں میں ڈاکٹر ہربنس اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اسپتال کے فرش صاف کیے تھے۔ باورچیوں کے فرائض انجام دیئے تھے اور لالٹینوں کی روشنی میں آپریشن کیے تھے۔ ان ساری مشکلات کو وہ قریباً پانچ سال سے خندہ پیشانی سے برداشت کر رہا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ ہلکی ہوا کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے جس کے سبب بارش کے چھینٹے اندر تک آنے لگے تھے۔ حمزہ نے پولیتھین کی ایک شیٹ تان کر چھینٹوں کا راستہ بند کر دیا۔ پھر وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی سبز چائے مجھے پلانے لگا۔

میں نے کہا۔ ”حمزہ! مجھے تو تم بڑے زبردست قسم کے خدمت گار لگتے ہو۔ لگتا ہے کہ معذور اور نیم معذور مریضوں کی دیکھ بھال کا باقاعدہ کورس کیا ہوا ہے تم نے۔ یار! اتنا نہ چاہو کہ میرا دم ہی نکل جائے۔ دیکھو تمہارا منہ چوسے ہوئے آم جیسا ہو گیا ہے۔“

”تم اپنی چونچ بند رکھو تو بہتر ہے۔ میں کوئی ایسا خاص احسان نہیں کر رہا ہوں تم پر۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ حملہ کرنے والا مجھ پر جھپٹا تھا۔ تم مجھے بچانے کی کوشش میں گرے ہو۔“

”اور شاید تم بھی بھول گئے ہو کہ تم یہاں کیوں ہو؟ تم یہاں میری وجہ سے رکے ہوئے ہو۔ کیونکہ تمہیں میری سلامتی کی طرف سے خطرات لاحق تھے۔

”تو کیا غلط لاحق تھے؟“ حمزہ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”تم صحیح ہو حمزہ میں غلط تھا۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ہمیشہ

محسوس کیا ہے کہ تم میں پیش بینی کی صلاحیت مجھ سے زیادہ ہے۔ تم خطرات اور حالات کو دور سے دیکھ لیتے ہو۔ اب سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں کہ اگر تم میرے ساتھ نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ میرا تو خیال ہے کہ شاید میں وہیں کھائی میں گر کر بے ہوش ہو جاتا اور رات کو جانور میرا تیا پانچہ کر جاتے یا پھر کاستو کے مکان میں وہ "سیاہ فام ہڈی جوڑ پہلوان" بازو کھینچ کھینچ کر میرا دم نکال دیتا۔"

"بس یہ قدرت کا ہی کام ہے۔ اتنی بلندی سے گر کر تمہارا بچنا معجزے سے کم نہیں۔ ایک بار تو مجھے یہی لگا تھا کہ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو چکا ہوں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کس طرح نیچے اترا اور کیسے تم تک پہنچا۔"

میں نے دائیں ہاتھ سے چائے کی پیالی تھامتے ہوئے کہا۔ "کاستو نے کیا بتایا ہے؟ حملہ آوروں کا پتہ چلا یا نہیں؟"

"پتہ چل بھی گیا تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو گا۔ پکی بات ہے کہ یہ گروایش کے چیلوں کا کام ہے لیکن ان کا نام زبان پر لا کر کوئی بھی اپنے لیے خطرہ مول نہیں لے گا۔ اتنی جرات تو کاستو میں بھی نہیں ہے کہ وہ پگوڈا کے خدائی فوجداروں پر انگلی اٹھا سکے۔"

"یار! یہ مہاتما بدھ کے کیسے پیروکار ہیں۔ بدھ کی تعلیمات کا تو محور ہی محبت اور امن ہے۔ یہ کیسے بھکشو ہیں جو بے گناہوں کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتے۔"

"یہی بات کل ڈاکٹر ہربنس بھی کہہ رہا تھا۔" حمزہ نے کہا۔ "ہربنس کا کہنا ہے کہ مقامی بودھیوں کی اکثریت خرافات کا شکار ہو چکی ہے۔ انہوں نے مذہب میں نئے نئے عقائد اور رسمیں شامل کر رکھی ہیں۔ بودھ مندروں کا انتظام کرنے والوں کے پاس کافی پیسہ بھی آ گیا ہے۔ یہ لوگ میلوں ٹھیلوں کی آڑ میں عیش و عشرت کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ اسپتال کی قریبی بستی کوپٹا کہلاتی ہے۔ یہاں بھی ایک پگوڈا موجود ہے۔ پگوڈا کی انتظامیہ ہمیشہ اسپتال کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتی ہے۔ یہ اسپتال پہلے سرکاری تھا پھر سیمی پرائیویٹ بنا، اب پرائیویٹ بن چکا ہے۔ ڈاکٹر ہربنس اور اس کے دو تین ہمدرد ساتھی ہیں جو اپنے طور پر اس جاں بلب ادارے کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حکومتی لوگ، عرصہ ہوا اس بوجھ کو سر سے اتار کر یہاں سے شفٹ ہو چکے ہیں۔"

میں اور حمزہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کارینگ کل سے اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ حمزہ نے اسے پوسٹ کرنے کے لیے دو خط بھی دیئے تھے۔ ایک خط میرے گھر کے لیے دوسرا

اپنے گھر کے لیے ان خطوط میں ہم نے اپنی طرف سے مکمل "خیر خیریت" ہی لکھی تھی۔ حمزہ نے مجھ سے کہا بھی تھا کہ میں رخشی کے خط کا جواب بھی لکھ دوں مگر میں ٹال گیا تھا۔ موجودہ صورتحال اتنی الجھی ہوئی تھی کہ میں جذباتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کیفیت میں میرے لیے رخشی کو کوئی صاف اور اجلا خط لکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے گھر والے خط میں ہی رخشی کے لیے بھی دو چار رسمی سطریں لکھ دی تھیں۔

سون کا خیال پیر تسمہ پا کی طرح میرے دماغ سے چمٹ گیا تھا۔ یوں تو یہ خیال چار پانچ سال سے میرے ذہن میں بسیرا کیے ہوئے تھا لیکن اس سے ملنے کے بعد تو کیفیت ہی کچھ اور ہو گئی تھی۔ محسوسات کو زبان مل گئی تھی اور موہوم خیالات ٹھوس حقیقت بن گئے تھے۔ ایسی حقیقت جسے میں نے چھوا تھا، چوما تھا۔ میری اور حمزہ کی گفتگو کا رخ سون کی طرف مڑ گیا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے پانچ روز ہو چلے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ مجھے پیش آنے والے حادثے سے ایک روز پہلے حمزہ نے سون کے کندھے پر سفید کپڑا دیکھا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ یہ کپڑا وہ بھکشو استعمال کرتے ہیں، جو کسی طرح کا بھرت وغیرہ رکھتے ہیں۔ خبر نہیں تھی کہ سون نے کیا بھرت رکھا تھا اور اس کی نوعیت کیا تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سون کو میرے موجودہ حالات کا علم ہے یا نہیں۔ ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ موجود ہو جہاں اسے مجھ پر گزرنے والے سانحے کی خبر ہی نہ ہوئی ہو

ہماری گفتگو کے دوران ہی ڈاکٹر ہربنس آ گیا۔ وہ حسب معمول پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں تھا۔ ہونٹوں پر ان تھک مسکراہٹ تھی۔ "کیسے ہو سجن جی!" اس نے مجھے اپنے خاص انداز میں مخاطب کیا پھر خود ہی بولا۔ "لگتا ہے آج حال چال کل سے اچھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہربنس صاحب! آپ کو دیکھ کر چہرے پر رونق آ جاتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ بھلا چنگا ہو گیا ہوں۔"

وہ بولا۔ "سجن جی! یہ تو تیمار داری کا پہلا اصول ہے کہ مریض کو مایوس نہ کیا جائے اور آپ تو خیر سے خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ باقی جہاں تک تیمار داری کا تعلق ہے، آپ کا ایک تیمار دار باہر آیا کھڑا ہے۔ ایک درمیانی عمر کی عورت ہے۔ آپ کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

"کون ہو سکتی ہے۔" میں نے سوالیہ نظروں سے حمزہ کی طرف دیکھا۔

حمزہ ڈاکٹر ہربنس کے ساتھ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جس عورت کو ساتھ لے کر آیا وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ پیاؤ تھی۔ پیاؤ رشتے میں سون کی جٹھانی اور چچکی کی بھابی تھی۔ جب میں لکشون گاؤں میں تھا۔ وہ بار بار مجھ سے التجا کرتی رہی تھی کہ میں ''بڑے پگوڈا'' میں جا کر سون سے ملنے کی کوشش کروں۔ کیونکہ میں ہی ہوں جو اسے معمول کی زندگی کی طرف لوٹانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ اس کی خواہش کے مطابق میں بڑے پگوڈا یعنی ''چاتو چانگ لے'' پہنچا تھا اور نتیجے کے طور پر یہاں کوپٹا کے کھنڈر اسپتال میں موجود تھا۔ پیاؤ کو کسی طرح میرے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر ہوئی تھی اور وہ میری مزاج پرسی کے لیے یہاں پہنچ گئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ تھائی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ڈاکٹر آختر! تمہاری تکلیف دیکھ کر میرا دل غم سے بھر گیا ہے۔ بودھا غارت کرے ان پاکھنڈیوں کو جو صرف نام کے بھکشو ہیں۔ ایسے ہی بہروپیے ہیں جو بدھ مت کی شکل بگاڑ کر اسے کیا سے کیا بنا رہے ہیں، ہم سب جانتے ہیں کہ تمہیں تکلیف پہنچانے والے گرو ایش اور کشپال کے کارندے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''عام لوگوں کا ردعمل کیا ہے؟''

''گرو ایش کا عام لوگوں پر بہت اثر و رسوخ ہے۔ وہ اس کے خلاف سوچتے اور بات کرتے ہوئے بہت ڈرتے ہیں۔ پرانی نسل کے لوگوں میں سے ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو ہر قدم اٹھانے سے پہلے گرو ایش اور کشپال سے رہنمائی مانگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ تو ان کے خلاف کوئی بات نہیں کہیں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو تمہارے اور حمزہ کے علاج معالجے سے فائدہ پہنچا ہے۔ وہ تمہیں پیش آنے والے حادثے کا سن کر سخت غم زدہ ہوئے ہیں اور دبی زبانوں میں دونوں گروؤں پر شک کا اظہار کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پچھلے دو چار دن میں سون سے ملاقات تو نہیں ہوئی۔''

''ہوئی ہے۔'' پیاؤ نے کہا۔

''وہ ٹھیک تو ہے نا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔''

''کہاں ہوئی تھی ملاقات۔''

''مٹھ میں۔''

''اس نے کوئی بھرت وغیرہ رکھا ہوا ہے؟'' حمزہ نے پوچھا۔

''ہاں تمہارا اندازہ درست ہے۔ اس کو مقامی زبان میں ہوشتو...... یعنی دو لقمے کا بھرت کہتے ہیں۔ بھرت رکھنے والا چوبیں گھنٹے میں دوپہر سے قبل صرف دو لقمے لیتا ہے یا پانی پیتا ہے۔ یہ بڑی سخت ریاضت ہوتی ہے۔ ایک دو ہفتوں میں ہی بھرت رکھنے والے کی ہڈیاں نکل آتی ہیں۔ سون آج کل یہی کر رہی ہے۔ وہ پہلے ہی کمزور تھی اب سرسوں کی طرح زرد نظر آنے لگی ہے۔''

''کسی نے اسے روکا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پہلے کسی کی کب سنتی رہی ہے جو اب سنے گی۔''

''اس سے کیا باتیں ہوئیں۔'' میں نے پوچھا۔

پیاؤ کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پھیکی سی مسکراہٹ ابھری وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔ ''وہ بھی تمہارے بارے میں ایسے ہی پوچھتی رہی ہے جیسے تم اس کے بارے میں ٹوہ لگا رہے ہو۔''

''اس نے میرے بارے میں کچھ کہا۔''

''ہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا موضوع تم ہی رہے ہو ڈاکٹر آختر!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''شاید اس نے تمہارے بارے میں بات کرنے کے لیے ہی مجھے مخاطب کرنا مناسب سمجھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ ہونٹ سی کر سامنے آتی تھی۔ دس باتوں کا جواب بس ایک لفظ سے دے دیتی تھی۔ میں پرسوں چاتو چانگ لے میں ہی تھی۔ پرسوں ہفتے کا تیسرا دن تھا۔ یہ دن مٹھ کے طالب علموں سے ملاقات کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ دوپہر سے کوئی دو گھنٹے پہلے ملاقاتیوں کے کمرے میں اس سے میری بات ہوئی، اس کے بھرت چھوڑنے کا وقت قریب آ رہا تھا اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی کمزور اور ناتواں لگ رہی تھی۔ ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ وہ پہلے مجھ سے تمہارے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کرتی رہی۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ لکشون میں تمہارے ساتھ میری ملاقات ہو چکی ہے۔ کچھ دیر بعد سون نے خود ہی مجھ پر یہ ''انکشاف'' کیا کہ تم یہاں ''چاتو چانگ لے'' میں موجود ہو اور اکیلے میں اس سے ملاقات بھی کر چکے ہو۔ اکیلے میں ہونے والی ملاقات کا ذکر میرے

لیے واقعی ''انکشاف'' تھا۔ مختصر لفظوں میں سون نے جو کچھ بتایا، اس سے پتہ چلا ہے سون کی ساتھی ہوسنگ کے ذریعے تم دونوں کی ملاقات ایک مریضہ لڑکی کے گھر پر ہوئی تھی۔ اس ملاقات کے بعد تم نے سون سے وعدہ کیا کہ ایک دو دن کے اندر یہاں سے چلے جاؤ گے اور پھر زندگی بھر ادھر کا رخ نہیں کرو گے لیکن ایک دن بعد ہی تمہارے ساتھ حادثہ پیش آ گیا۔''

حمزہ نے کہا۔ ''یعنی سون کو شادا کے زخمی ہونے کا پتہ ہے؟''

پیاؤ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اثبات میں سر ہلایا۔ ''اسے پتہ ہے اور وہ بہت فکرمند بھی ہے۔ وہ اس حادثے کا ذمے دار بھی خود کو سمجھتی ہے۔ اس کے دماغ پر بڑا بوجھ ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ اگر فاقوں سے خود کو ہلکان کر رہی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی بوجھ ہے۔''

پیاؤ کا یہ اندازہ غلط تھا۔ میں جانتا تھا کہ سون کے ''نہایت مشکل برت'' کی وجہ کیا ہے۔ یہ برت میرے زخمی ہونے سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا اور اس کی وجہ ہماری تنہائی کی ''ملاقات'' تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''سون نے مزید کیا کہا۔''

''وہ تمہاری خیریت جاننے کیلئے بے تاب تھی۔ شاید تم میری بات کو مبالغہ سمجھو لیکن یہ حقیقت ہے ڈاکٹر آختر! کہ وہ اندر سے تمہارے بارے میں بہت فکرمند ہے۔ اس نے مجھے بے حد تاکید کے ساتھ کہا کہ میں چپکے سے تمہاری خیر خیریت کے بارے میں معلوم کروں اور اگلے ہفتے مٹھ میں آ کر اسے بتاؤں مگر پھر تھوڑی دیر بعد اس نے ارادہ بدل دیا۔ کہنے لگی۔ ''نہیں مجھے آ کر بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بس خود ہی اس کی خیریت دریافت کر لیں اور کسی بھی طرح جلد سے جلد اسے یہاں سے نکال دیں۔''

حمزہ نے کہا۔ ''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم سون کے کہنے پر یہاں آئی ہو؟''

''نہیں۔ میرا ارادہ لکشون میں ہی بن گیا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ ڈاکٹر آختر! زخمی ہو کر اسپتال میں پہنچ گیا ہے۔ میرا دل ڈاکٹر کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ میں سون سے ملنے کے بہانے چاتو چانگ لے پہنچی، پھر بہت چھپتے چھپاتے یہاں تک آئی ہوں۔''

''اب تمہاری ملاقات سون سے کب ہو گی؟'' میں نے پیاؤ سے پوچھا۔

''پانچ روز بعد...... مٹھ میں۔''

''تم اس سے کیا بات کرو گی پیاؤ؟''

''جو تم کہو گے۔'' پیاؤ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کہنا، ڈاکٹر آختر! اگر چاہے بھی تو اب یہاں سے نہیں جا سکتا۔ یہاں سے چلے جانا اس کے اختیار میں ہی نہیں رہا۔ اس سے یہ بھی کہنا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، اس کا ذمے دار وہ خود ہے، تم نہیں ہو اور اسے یہ بھی بتا دینا کہ وہ اسپتال کے بستر پر دن رات تمہیں یاد کرتا ہے۔''

''تمہارے نہ جانے کا سن کر وہ اور بھی پریشان ہو جائے گی۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ ابھی تو کسی کو تمہارے یہاں آنے کے اصل مقصد کا پتہ نہیں پھر بھی تمہیں نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اگر کسی کو اصل بات کی بھنک بھی پڑ گئی تو کیا ہو گا۔''

''اب جو بھی ہو گا دیکھ لیں گے۔'' میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بس اسے اپنی طرف سے یہ باور کرا دینا کہ میں یہاں سے جانے والا نہیں ہوں۔ اب جو کچھ شروع ہوا ہے وہ اپنے انجام تک پہنچ کر ہی ختم ہو گا۔''

پیاؤ نے لرز کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''تو تم اس وعدے سے پھر رہے ہو جو تم نے سون سے کیا ہے؟''

''شاید ایسا ہی ہے۔ میرے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے اور اس ''بہت کچھ'' میں میرے ارادے بھی شامل ہیں۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ پیاؤ کے خوبصورت چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں لیکن اندر سے شاید اسے خوشی بھی ہوئی تھی۔

پیاؤ قریباً آدھ گھنٹہ میرے پاس رہی۔ لکشون گاؤں میں ایک دن پیاؤ نے بتایا تھا کہ اس کے نام کا مطلب ''خوبصورت برف'' ہے۔ آج اس کی باتوں سے واقعی میرے جھلسے ہوئے سینے کو ٹھنڈک کا احساس ہوا تھا۔ جب وہ اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی ایک عجیب واقعہ ہوا۔ پیاؤ کے چہرے پر اچانک شدید پریشانی کے آثار نظر آئے۔ میں نے واضح طور پر اس کا رنگ متغیر ہوتے دیکھا۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا لیکن مجھے کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ بس خستہ حال وارڈ کے خستہ حال کھانستے کراہتے مریض تھے۔

پیاؤ ایک دم ہی کھڑی ہو گئی۔ ''اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ اس کی رنگین ساڑھی کا پلو گھونگھٹ کی طرح اس کے چہرے پر تھا۔

"کیا بات ہے پیاؤ! تم کچھ پریشان ہو گئی ہو؟"

"نن نہیں تو...... بس دیر ہو رہی ہے۔ میں پھر آؤں گی۔"

میں نے حمزہ سے کہا۔ "حمزہ پیاؤ کو سڑک تک چھوڑ آؤ۔"

حمزہ میرے کہنے سے پہلے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ پیاؤ کے ساتھ باہر چلا گیا۔

دو چار منٹ بعد وہ پیاؤ کو چھکڑے پر سوار کر کے واپس آ گیا۔ حمزہ کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جاتے جاتے پیاؤ نے اسے کوئی خاص بات بتائی ہے۔

میرے قریب بیٹھتے ہوئے حمزہ نے کہا۔ "ایک اہم اطلاع ہے۔"

"کیا؟"

"چنکی اسی اسپتال میں موجود ہے۔"

یہ اطلاع واقعی دھماکا خیز تھی۔ میں نے ارد گرد نگاہ دوڑائی، چنکی جیسی کوئی شکل نظر نہیں آئی۔ حمزہ بولا۔ "چھکڑے میں سوار ہوتے ہوئے پیاؤ نے یہ بات بتائی ہے۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔"

"پوری بات بتاؤ ناں کیا کہا اس نے؟"

"بتانا کیا تھا۔ لفظ ہی اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ بس سرگوشی میں کہہ گئی ہے کہ چنکی یہیں موجود ہے میں نے ابھی اسے دیکھا ہے۔"

یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ سون کے جابر شوہر چنکی سے اس اسپتال میں ملاقات ہو گی۔ اس کرخت چہرہ باکسر کو میں نے قریباً چار پانچ سال پہلے بنکاک میں ہی دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ ٹیکسی چلاتا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی ذہن میں ایک شعلہ مزاج لڑاکے شخص کا تصور ابھرتا تھا۔

حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ چنکی کو ابھی تک میرے اور سون کے کسی تعلق کا علم نہیں۔ کم از کم مجھ تک تو کوئی ایسی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ بہر حال اس امکان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ چنکی کے ذہن میں کوئی شک موجود ہو۔ اس نے اکثر سون کو طعنے دیئے تھے کہ وہ کسی "گاہک" کے عشق میں گرفتار ہو کر برباد ہو گئی ہے۔ سون کے رویے میں تبدیلیاں میرے بنکاک سے جانے کے فوراً بعد رونما ہو گئی تھیں۔ یہ شک چنکی کے ذہن میں پیدا ہو سکتا تھا کہ سون کی "کایا پلٹ" کا ذمے دار میں ہوں۔

میں اور حمزہ دیر تک اس نئی صورتحال پر غور کرتے رہے۔ ساتھ ساتھ ہم ارد گرد کا جائزہ

بھی لیتے رہے۔ حمزہ نے تو خیر چنکی کو دیکھا ہی نہیں تھا لیکن میں اسے پہلی نظر میں پہچان سکتا تھا۔ دوسری طرف چنکی کے لیے بھی مجھے پہچاننا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میرے چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور بال بھی کچھ لمبے تھے۔ لیکن یہ ایسی تبدیلیاں نہیں تھیں کہ مجھے شناخت ہی نہ کیا جا سکتا۔

حمزہ سارے اسپتال کا ایک راؤنڈ لگا کر آیا لیکن اسے چنکی یا چنکی جیسا کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ اس نے واپس آ کر کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ کسی کام سے آیا ہو اور چلا گیا ہو۔"

میں صبح سویرے حمزہ کے سہارے سے تھوڑی سی چہل قدمی کرتا تھا۔ اس روز میں نے احاطے کے بجائے اسپتال کے اندر چہل قدمی کرنا مناسب سمجھا۔ اگر چنکی یہاں موجود تھا تو میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس شخص کے لیے میرے دل میں بے پناہ نفرت موجود تھی۔ اس شخص نے نوخیز کلیوں جیسی ایک ہنستی چہکتی لڑکی کو شاخ سے توڑا تھا اور پتی پتی کر دیا تھا۔ وہ ازدواجی رشتے کے نام پر ایک دھبہ تھا۔ اس شخص نے روئے زمین کا سب سے مکروہ پیشہ اپنایا تھا۔ وہ اپنی بیوی کا دلال بنا تھا۔ سون ایک بے بس چڑیا کی طرح اس شکرا صفت کے پنجوں میں پھڑپھڑاتی رہی تھی۔ سسکتی رہی تھی۔ سہاگ کی سیج ایک نوخیز لڑکی کی آنکھوں کا سب سے حسین سپنا ہوتا ہے لیکن درندہ صفت چنکی نے اس سپنے کو یوں کرچی کرچی کیا تھا کہ سون کو سہاگ اور شادی جیسے الفاظ سے ہی اختلاج قلب ہو جاتا تھا۔ مجھے بوبے مارکیٹ کی وہ نیم گرم سہ پہر آج بھی بھولی نہیں تھی، جب شاپنگ کرتے ہوئے سون نے ایک "دلہن گڑیا" کو دیکھا تھا اور اس پر دورہ پڑ گیا تھا۔ اس بد بخت شخص نے سون کے لیے زندگی کو اتنا بدصورت بنایا تھا کہ وہ شدید جذباتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی تھی اور زندگی سے ہی کوسوں دور چلی گئی تھی۔ اب وہ نشے میں غرق ہو کر اس کے ارد گرد ھنکارتا پھر رہا تھا۔ اگر وہ میرے اور سون کے بارے میں کچھ جانتا تھا تو پھر مجھے پہچان کر میرے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی اب مجھے اپنے نقصانات کی کچھ زیادہ فکر نہیں رہ گئی تھی۔

حمزہ کا کندھا میری بغل کے نیچے تھا اور میں اپنے بائیں پاؤں پر بالکل وزن ڈالے بغیر حمزہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے بستروں پر ٹوٹے پھوٹے مریض اپنے شکستہ حوصلوں کے ساتھ لیٹے تھے اور مسیحائی کے منتظر تھے۔ ایک جواں سال عورت اپنی شیر خوار بچی کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اور اس کے خشک ہونٹوں پر گیلا کپڑا پھیر رہی تھی۔ معصوم

بچی کے بازوؤں اور گلے میں کئی تعویذ اور دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان تعویذوں کے چکر میں ہی عورت نے قیمتی وقت ضائع کر ڈالا ہے، اب شدید ڈی ہائیڈریشن کے باعث بچی آخری سانس لے رہی تھی۔ اس قسم کے مناظر یہاں عام دیکھنے میں آتے تھے۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور پھر میرے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ میں نے چنگی کو دیکھا۔ چوڑا چکلا...... گرانڈیل اور کرخت چہرہ چنگی، جو ایک بھرپور مکے سے مد مقابل کو زمین چٹا دیتا تھا مگر اب وہ چوڑا چکلا تھا، گرانڈیل تھا اور نہ ہی کرخت چہرہ۔ کسی کو مکا مارنا تو دور کی بات ہے شاید اب وہ ہاتھ پاؤں بھی مشکل سے ہلاتا تھا۔ میرے سامنے بستر پر ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔ میں نے اسے بڑی دشواری سے پہچانا...... ہاں وہ چنگی تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس چکی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں جیسے کھال پھاڑ کر باہر نکلنا چاہ رہی تھیں۔ اس کے سر کے بیشتر بال جھڑ چکے تھے۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا لیکن اس کی زردی مائل آنکھوں میں شناسائی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ مگر پھر اچانک اس کے تاثرات بدل گئے۔ وہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تم یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ مجھے کہاں دیکھا ہے؟" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ میرے دل و دماغ پر حیرت کا شدید حملہ تھا۔

"ہاں...... مم...... میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ نحیف آواز میں بولا۔

"پھر کچھ یاد آیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... ابھی تو نہیں۔" اس نے کہا اور کہنیوں کے سہارے اپنے نحیف جسم کو حرکت دے کر میلے کچیلے تکیے سے ٹیک لگا لی۔

میں نے کہا۔ "ہماری آخری ملاقات قریباً پانچ سال پہلے بنکاک میں ہوئی تھی۔ ہوٹل نیو ٹروکیڈرو...... کروکو ڈائل فارم اور اسنیک ہاؤس کا ٹرپ...... کرائے پر میرے اور تمہارے درمیان تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا تھا۔ میرا نام شاداب ہے۔ ڈاکٹر شاداب!"

ایک دم چنگی کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ "اچھا...... اچھا...... تمہارے ساتھ ایک دوست بھی تھا جو ناراض ہو کر دوسرے ہوٹل میں چلا گیا تھا۔ تم ایک انڈین ہوٹل کا باسی کھانا کھا کر بیمار بھی پڑ گئے تھے۔ ہاں مجھے یاد آ گیا ہے۔"

"میں تمہیں یہاں اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں۔"

"اور میں بھی بہت حیران ہوں۔" چنگی نے کہا۔ "یہ جگہ تو بنکاک سے بہت دور ہے۔

یہاں عام ٹورسٹ بالکل بھی نہیں آتے اور...... تمہارے یہ زخم...... کیا کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"بس ایکسیڈنٹ ہی سمجھو۔ دراصل ہم یہاں ڈاکٹروں کی ایک جماعت کے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ دیہاتی علاقوں کے اسپتالوں اور کلینکوں کا دورہ کر رہے ہیں۔ ہمارے کچھ ساتھی تو واپس جا چکے ہیں لیکن ہمارا کچھ "کام" ابھی یہاں باقی ہے۔"

"لیکن یہ چوٹیں۔"

"تمہیں بتایا ہے ناں کہ ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

ایک دم چنگی کے تاثرات بدل گئے۔ اس نے دھیان سے میرے اور حمزہ کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "تم دونوں اس سے پہلے کہاں تھے؟"

"ہم بہت سے علاقوں میں گھومے ہیں۔ چند دن پہلے ہم لکشون گاؤں میں تھے۔ پھر آنگی گئے۔ وہاں سے آ کر چاتو چانگ لے میں چند روز ٹھہرے۔"

"یہ چوٹیں تمہیں چاتو چانگ لے میں لگی ہیں ناں؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

چنگی بولا۔ "میں سمجھ گیا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہارا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا ہے۔ تمہیں ان بدبخت بھکشوؤں نے زخمی کیا ہے۔ وہی جھوٹے بھکشو جو اپنے بہروپیے گرو کشپال کے گرد پروانوں کی طرح گھومتے ہیں۔ میں سب سمجھ گیا ہوں۔ مجھے پرسوں ہی ایک بندے سے پتہ چلا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ چاتو چانگ لے سے ایک ڈاکٹر زخمی ہو کر یہاں آیا ہے۔ بستی میں کسی شدید بیمار لڑکے کے علاج معالجے کا جھگڑا تھا۔ ڈاکٹر اسے بنکاک بھجوا رہا تھا۔ جبکہ بھکشو اس کا علاج اپنے طریقے سے کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بتاؤ یہی بات ہے ناں؟"

میں خاموشی سے چنگی کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ زور سے سر ہلا کر بولا۔ "میں سب سمجھ گیا ہوں۔ یہی بات ہے۔ یہ حرامی کشپال اور اس کا پلید استاد اسی طرح لوگوں پر اپنی مرضیاں ٹھونستے ہیں۔ یہ سادھوؤں کے بھیس میں شیطان ہیں۔ میری طرف دیکھو۔ میں برا تھا۔ بہت برا تھا۔ لیکن اندر باہر سے ایک جیسا تھا یہ اوپر سے سادھو ہیں اور اندر سے شیطان۔ تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن میں سب جانتا ہوں۔"

چنکی زور سے بولا تھا۔ اسے کھانسی ہونے لگی۔ کھانستے کھانستے وہ دوہرا ہو گیا۔ اس کی زبان باہر نکل آئی۔ بستر کی چادر سمٹ گئی تھی اور نیچے سے گدے کے ٹوٹے ہوئے اسپرنگ جھانک رہے تھے۔ ان اسپرنگوں کے اندر ہی چنکی نے کاغذ کی ایک پڑیا پھنسائی ہوئی تھی۔ اس نے کھانستے کھانستے انگلی سے پڑیا کی طرف اشارہ کیا۔ حمزہ نے جلدی سے پڑیا کھولی۔ اس میں سانس بحال کرنے والی گولیاں تھیں۔ حمزہ نے ایک گولی پانی کے ساتھ بمشکل چنکی کے حلق میں اتاری۔

گولی کا اثر تو خیر کچھ دیر میں ہوتا تھا لیکن دو تین منٹ بعد چنکی کی کھانسی رک گئی۔ وہ بستر پر پڑا سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کے سوکھے سیاہ ہونٹوں سے رالیں بہہ رہی تھیں۔ کھانسی کی شدت اور مثانے کی کمزوری کے سبب اس کا پاجامہ بھی گیلا ہو گیا تھا۔

میں اور حمزہ حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ انسان کو مکافات کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ یہی چنکی تھا جس کے سامنے بنکاک میں چھوٹے موٹے غنڈے دم نہیں مارتے تھے۔ وہ جس کو گھور کر دیکھتا تھا اس کے اوسان خطا کر دیتا تھا۔ وہ ہر پل لڑنے مرنے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ اس نے نرم و نازک سون کو کئی برس تک یوں اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا تھا کہ وہ تڑپ بھی نہیں سکی تھی۔ وہ اسے ہمہ وقت ذہنی اور جسمانی اذیت سے دو چار رکھتا تھا۔ سون کے لواحقین سون کی حالت زار سے بخوبی آگاہ تھے لیکن اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ یہ چنکی ہی تھا جس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں سون بڑے پگوڈا کے شیطان صفت سادھوؤں کی گرفت میں چلی گئی تھی۔ اب وہ چنگیز صفت چنکی ایک حقیر کیچوے کی طرح بستر پر اینٹھ رہا تھا اور اس کے منہ سے رالیں بہہ رہی تھیں...... ہاں یہی قدرت کا انصاف تھا۔

ہمیں اسپتال میں پانچ چھ روز مزید گزر گئے۔ چنکی سے ہماری کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ کسی وقت وہ خود ہولے ہولے چلتا میرے پاس چلا آتا تھا، کسی وقت میں حمزہ کے سہارے اس تک پہنچ جاتا تھا۔ میرے حوالے سے چنکی کے ذہن میں کسی قسم کا کوئی شک موجود نہیں تھا۔ اس نے ایک دن مجھ سے سون کے بارے میں پوچھتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہیں وہ لڑکی یاد ہے نا جو تمہارے ساتھ کمانڈو کے ہوٹل میں ٹھہری تھی۔“ (وہ ہوٹل نیو ٹروکیڈرو کو پتہ نہیں کیوں کمانڈو کا ہوٹل کہتا تھا)

”ہاں اس کا نام شاید سون تھا۔“ میں نے بھولپن کی اداکاری کی تھی۔

”شاید تمہیں یہ سن کر حیرانی ہو کہ وہ لڑکی راہبہ بن چکی ہے۔ چاتو چانگ لے کا بڑا پگوڈا دیکھا ہے تم نے؟“

”ہاں دیکھا ہے، ایک بار اندر بھی گئے ہیں۔“

”وہ سون بھی اسی پگوڈا میں رہتی ہے۔“

میں نے ایک بار پھر حیران ہونے کی اداکاری کی تھی۔ چنکی نے کہا۔ ”بدھا کے جعلی پجاریوں نے اس کا ستیاناس کر دیا ہے۔ وہ گھر کی رہی نہ گھاٹ کی...... وہ پاگل سمجھتی ہے کہ اس نے گناہ کی زندگی کو چھوڑ کر ثواب اور نیکی کا راستہ چنا ہے۔ بے وقوف کی بچی کو کیا پتہ، بس جگہ بدل گئی ہے۔ ”کام“ وہ یہاں بھی وہی کرے گی جو بنکاک میں کرتی تھی۔ یہاں بھی اس کے جسم سے کھیلا جائے گا۔ اب یہ کام مذہب کے نام پر مذہب کا ٹھیکے دار کرے گا۔ تم اس حرامی کا نام جانتے ہی ہو۔ وہ استاد گروایش ہے۔ وہ ایک نمبر کا بدمعاش اور حسن پرست شخص ہے۔ تم نے اس کی آنکھیں دیکھی ہی ہوں گی، ان میں ہر وقت ایک طرح کی بھوک رہتی ہے۔ وہ اپنے چیلے کشپال سے ملنے لکشون گاؤں جایا کرتا تھا۔ وہیں اس کی گندی نظر سون پر پڑی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے سون پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور پھر ایک دن اسے اپنے شکنجے میں جکڑ کر لے گیا۔ اب سون مٹھ میں استاد گرو کی شاگرد ہے۔ بہت جلد یہ شاگرد! شاگرد نہیں رہے گی، کچھ اور بن جائے گی۔ میری اطلاع کے مطابق گروایش اسے مسلسل اپنے جال میں جکڑتا چلا جا رہا ہے۔ چڑیا توپ کا گولا لگنے سے تو بچ سکتی ہے مگر گروایش کے نشانے پر آئی ہوئی بھکشن کا بچنا محال ہوتا ہے۔“

میں اور حمزہ سنتے رہے اور چنکی سناتا رہا۔ اس نے ہمیں گروایش اور گرو کشپال کے کئی ایک سنسنی خیز واقعات سنائے۔ اس کی باتوں اور لب و لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ جھوٹ نہیں ہے، مٹھ میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ چنکی گھر کا بھیدی تھا۔ وہ بہت اندر کی باتیں بتا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ استاد گروایش اور کشپال ایسی عورتوں اور لڑکیوں کو نشانہ بناتے ہیں جو مکمل طور پر ان کے تاثر میں آ چکی ہوتی ہیں۔ اکثر یہ عورتیں سیدھی سادھی توہم پرست دیہاتنیں ہوتی ہیں۔ یہ دونوں گروؤں کی روحانی صلاحیتوں سے اس قدر مرعوب ہوتی ہیں کہ ان کے خلاف زبان کھول ہی نہیں سکتیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ اسے مقدر کا لکھا سمجھتی ہیں یا پھر اس کا ناتا بدروحوں وغیرہ سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

چنکی نے کہا۔ ”گروؤں کا شکار ہونے والی عورت اکثر نشے میں ہوتی ہے۔ اسے ایسے

ماحول میں نشانہ بنایا جاتا ہے جو بے حد خواب ناک اور طلسمی قسم کا ہوتا ہے۔ وہ خود کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کرتی ہیں۔"

"کیا کبھی کسی نے اس زیادتی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی؟"

"دو چار مرتبہ ایسا ہوا بھی ہے لیکن گرو ایش پر اس کے عقیدت مندوں کا بھروسہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتے۔ ایسی عورتوں کو پاگل سمجھ لیا جاتا ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بدروحوں کے اثر میں آگئی ہیں۔"

اس حوالے سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں، آخر میں نے چنکی سے پوچھ ہی لیا۔ "بنکاک میں تم اور سون ساتھ ساتھ نظر آتے تھے، یہاں بھی تمہیں سون کے حالات کی ساری خبر ہے کیا سون سے تمہارا کوئی رشتہ ہے؟"

چنکی ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر سنبھل کر بولا۔ "ہے بھی اور نہیں بھی۔ یوں سمجھو کہ پرانا یارانہ ہے۔"

"یعنی پرانی دوستی ہے؟" میں نے اس کے جھوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ چنکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "اگر پرانی دوستی ہے تو پھر ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں سون کو اس جال سے نکالنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔"

وہ کچھ دیر کھانستا رہا۔ پھر بولا۔ "میں نے بہت کوشش کی ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے سون کی مصیبت کو اپنے دل سے روگ کی طرح لگا لیا تھا۔ میں نے دن رات نشہ کیا ہے اور اپنا خون جلایا ہے۔ یونہی اس جگر کا بیڑا غرق نہیں ہوا ہے۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے ڈاکٹر صاحب بڑی لمبی۔"

میں نے دل میں سوچا۔ لمبی بھی ہے اور سفاک بھی۔

تھوڑی سی بات کر کے چنکی بری طرح ہانپ جاتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پھیپھڑے بھی شدید متاثر ہو چکے ہیں۔ وہ کچھ دیر اپنا سانس درست کرنے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔ "یہ دیکھو میری ٹوٹی ہوئی کلائی۔ یہ دیکھو میرے کندھے پر گولی کا نشان۔ ہو سکے تو میری کمر بھی دیکھو وہاں جگہ جگہ سے کھال ادھڑی ہوئی ہے۔ یہ سب ان کوششوں کی نشانیاں ہیں جو میں سون کو گروؤں کے جال سے نکالنے کے لیے کرتا رہا ہوں۔ اب میں بے بس ہو گیا ہوں، بالکل ہار گیا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، سون جیسی لڑکیوں کو ان گروؤں کے چنگل سے

نکالنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ کمزور باریک آواز میں بولا۔ "گروؤں کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اگر ایسی لڑکیاں خود کوشش نہیں کریں گی تو انہیں کوئی بھی نجات نہیں دلا سکتا۔ سون بھی تب ہی اس جنجال سے نکل سکتی ہے اگر وہ خود کوشش کرے لیکن وہ نہیں کرے گی۔ شاید کرنا ہی نہیں چاہے گی۔ وہ جو کچھ مٹھ میں پڑھ رہی ہے اور سیکھ رہی ہے وہ ایک افیم کی طرح ہے۔ یہ افیم اسے دن رات ایک ترنگ میں رکھتی ہے۔ اپنے اردگرد کی ہر شے سے اس نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اس کی ماں بہنیں اس کے سامنے بلکتی رہتی ہیں لیکن اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

شاید چنکی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی کئی بار آئی تھی کہ سون صرف اس صورت میں مٹھ اور سنگھ کے چنگل سے نکل سکتی ہے اگر وہ خود نکلنا چاہے۔ مٹھ اور پگوڈا کا خوابناک ماحول اس کے لیے واقعی ایک نشے جیسا تھا۔ اس نشے میں ڈوب کر وہ خود کو سکون اور راحت کے جھولوں میں جھولتا محسوس کر رہی تھی۔ یہ زندگی نہیں تھی۔ یہ زندگی سے فرار تھا۔ یہ حقیقت سے فرار تھا۔ بھیک مانگ کر پیٹ بھر لینا۔ دو بالشت اونچی چارپائی پر سات آٹھ گھنٹے سوتے رہنا اور فارغ وقت میں گھٹنوں میں منہ دے کر مراقبے میں چلے جانا، یہ زندگی نہیں تھی۔ یہ فرار تھا۔ زندگی اس مٹھ سے باہر تھی۔ زندگی اس پگوڈے سے آگے تھی، زندگی کچھ اور جگہوں پر تھی۔ جیسے اس اسپتال میں تھی، یہاں ٹوٹے پھوٹے بستروں پر خراب پنکھوں تلے زندگی ہی سسک رہی تھی۔ یہاں بارش کے چھینٹوں میں، غیر مناسب دواؤں کے ساتھ زندگی ہی تو کراہ رہی تھی۔ یہی زندگی تھی جس کو جینے کے لیے اور جس کو سہنے کے لیے خدا نے انسان کو پیدا کیا تھا۔ یہی مشکلات تھیں جن سے ٹکرانے والے کو اشرف المخلوقات کا خطاب ملا تھا۔ اشرف المخلوقات کا خطاب گھٹنوں میں سر دے کر لمبے مراقبے کرنے والے نیم مردہ سادھوؤں کے لیے نہیں تھا۔ یہ خطاب ان جفاکش زندہ دلوں کے لیے تھا جو مصائب کی چٹانوں سے ٹکراتے ہیں اور دودھ کی نہریں نکالتے ہیں۔

میرے اندر ایک عجیب سا جوش بھر گیا تھا۔ میں سون کو اس جھوٹے خواب سے جگانا چاہتا تھا جو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے گرو ایش اور گرو کشپال جیسے بہروپیوں کے چنگل سے نکال کر زندہ انسانوں میں لانا چاہتا تھا۔

میری راتیں بڑی بے چین گزر رہی تھیں۔ سون کا تصور نگاہوں کے سامنے جم جاتا اور اردگرد کی ہر شے مجھ سے دور بہت دور چلی جاتی۔ بس سون ہوتی اور میں ہوتا ہم ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ناریل کے جھومتے درختوں کے نیچے گیلی ریت پر بہت آگے چلے جاتے۔ ہمارے عقب میں سناٹا ہوتا اور سامنے نیلگوں سمندر، سون کی بلوری جلد سورج کی شفاف روشنی میں دمکتی، اس کے ریشمی بال ساحلی ہوا میں لہراتے اور کلائی کا کنگن نگاہوں میں چاندی کے پھول کھلا دیتا۔ وہ ہنستی اور معصومانہ انداز میں باتیں کرتی چلی جاتی۔ موسیقی کی باتیں، زندگی کے خوبصورت رنگوں کی باتیں اور مستقبل کے سندر سپنوں کی باتیں، میں اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکاتا۔ وہ شرارت سے انگوٹھا دکھاتی اور بھاگ کھڑی ہوتی۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا، وہ کھلکھلاتی ہوئی دوڑتی چلی جاتی پھر اچانک اس کا سراپا دھندلا جاتا۔ اس کا ہیولا مدھم ہوتا اور پھر اوجھل ہو جاتا۔ میں خود کو تنہا کے ساحل پر تنہا کھڑا پاتا۔

یہ تصورات کا ایک ایسا گھن چکر تھا جو سینکڑوں مرتبہ میرے ذہن میں چل چکا تھا۔ خصوصاً جب سے پیاؤ یہاں سے ہو کر گئی تھی میرے اندر ایک میٹھا میٹھا سرکش چشمہ پھوٹ پڑا رہا۔ پیاؤ کے یہ الفاظ لاتعداد مرتبہ میرے کانوں میں گونج چکے تھے۔ ''وہ تمہارے بارے میں بڑی فکر مند ہے۔ وہ بھی تمہارے متعلق ایسے ہی پوچھتی رہی ہے جیسے تم اس کے بارے میں ٹوہ لگا رہے ہو۔''

پیاؤ کے یہ الفاظ ان خفتہ جذبوں کی نشاندہی کرتے تھے جو سون کے اندر میرے حوالے سے موجود تھے، میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ جذبات موجود ہیں۔ سون نے ان جذبات کو موٹے گیروا کپڑوں میں چھپایا تھا۔ ان جذبات پر سوتروں کے خول چڑھائے تھے اور ان کو مٹھ کی تاریک کوٹھڑیوں میں دفن کیا تھا لیکن یہ مرے نہیں تھے۔ یہ آج بھی زندہ تھے۔ یہ سون کی راکھ میں دبی ہوئی وہ چنگاری تھی جو کسی بھی وقت مجسم شعلہ بن سکتی تھی۔ میرے دل کی گواہی تھی کہ میں اس چنگاری کو ہوا دے سکتا ہوں، اسے شعلہ بنا سکتا ہوں۔ شاید پیاؤ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں دنیا میں واحد شخص ہوں جو سون کو نارمل زندگی کی جانب لانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ اسی طرح گزرا تھا۔ دن بہت طویل محسوس ہوتے تھے۔ بہار کی آ... تھی۔ کسی وقت ایک عجیب طرح کی اداسی حواس کو ڈھانپ لیتی تھی لیکن اس اداسی ...

ایک گداز تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن بارش ہو جاتی۔ گھنے درختوں میں پانی کی بوچھاڑیں شور مچاتیں۔ کوپنا بستی کے گول گول آنکھ والے بچے، چیختے چلاتے، بارش میں دوڑتے۔ اسپتال کی چھتیں چمکتیں...... مریض بڑبڑاتے ڈاکٹر ہربنس بلند آواز میں ہدایات جاری کرتا۔

صبح خوبصورت ہوتی تھی۔ جنگلی پھولوں کی خوشبو ہوا کے دوش پر خستہ حال وارڈوں کے اندر آ جاتی اور ہر مریض کے سرہانے جیسے کوئی چپکے سے گلدستہ رکھ دیتا۔ پرندوں کی چہکاریں دن چڑھے تک گونجتی رہتیں۔ حمزہ کسی وقت عجیب سے رومانی موڈ میں ہوتا۔ وہ کسی درخت کو ہاتھ لگاتا اور کہتا۔ ''شاد! آج ہم اس درخت کو چھو رہے ہیں۔ کچھ دن بعد ہم چلے جائیں گے اور پھر کبھی اس درخت کو نہ چھو سکیں گے۔''

حمزہ اکثر سیر کے لیے نکل جاتا۔ میں ناشتے کے لیے اس کا انتظار کرتا رہتا۔ ناشتہ اور کھانا بہت سادہ سا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ہربنس بھی اکثر ہمارے ساتھ ہی کھاتا۔ انڈہ، دودھ، ترکاری اور ہفتے میں ایک بار مرغی یا بھیڑ کا گوشت......

اسپتال سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر بارشی پانی کی قدرتی جھیل تھی اور ذرا نشیب میں ہونے کے سبب اسپتال کی کھڑکیوں میں سے نظر آتی تھی۔ جھیل کے کناروں پر شام کے وقت کوپنا کے مکین دکھائی دیتے تھے۔ کوئی گھاس پر اینٹھتا نظر آتا، کوئی پانی میں ڈوری کانٹا پھینک کر ٹرانسسٹر ریڈیو سنتا۔ بچے کنارے کے پانی میں اٹھکیلیاں کرتے۔ میں نے ڈاکٹر ہربنس سے سنا تھا کہ ایسی بارشی جھیلوں میں مگرمچھ بھی ہوتے ہیں۔ مجھے بنکاک کے کروکوڈائل فارم میں دیکھے ہوئے لاتعداد مگرمچھ یاد آ جاتے۔ میں اور حمزہ کھڑکی میں بیٹھ کر سوچتے کہ اگر یہاں بھی کوئی مگرمچھ نکل آئے تو کیا ہو لیکن یہاں کے باسی اس جھیل کو ہم سے کہیں زیادہ جانتے تھے، اس لیے کبھی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا۔

ان دنوں میں نے گھر والوں سے بذریعہ خط رابطہ رکھا اور رخشی کو بھی دو تین خط لکھے۔ میرے خطوط کے جواب میں رخشی کے بھی دو تین خط آئے۔ رخشی کوئی نادان یا کم فہم لڑکی نہیں تھی۔ وہ حالات کو تیزی سے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ بین السطور کچھ معاملات موجود ہیں۔ میں نے بھی اس احساس کی تردید کی کوشش نہیں کی۔ اپنے دوسرے جوابی خط میں اس نے ایک جگہ لکھا تھا۔ ''شاد! لوگ کہتے ہیں کہ زندگی مختصر ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ طویل بھی ہے۔ زندگی بس چار پانچ سال ہونی چاہیے تھی۔

ان پانچ سالوں میں ڈیڑھ سال جوانی کا ہوتا۔ اس ڈیڑھ سال میں بندہ کسی سے ٹوٹ کر پیار کرتا اور پھر بوڑھا ہو جاتا...... فنش! بے وفائی کے لیے وقت ہوتا، نہ کوئی بے وفا ہوتا...... نہ گلہ نہ شکوہ......"

میں نے جواب میں لکھا۔ "رخشی! ہم ڈاکٹر لوگ جتنے علاج ڈھونڈتے ہیں، اوپر والا اتنی ہی بیماریاں پیدا کر لیتا ہے۔ اس نے اپنا نظام تو برقرار رکھنا ہے۔ ہماری زندگی پانچ سال کی ہوتی تو پھر باقی سب کچھ بھی چھوٹا اور مختصر ہوتا۔"

ایک خط میں رخشی نے لکھا۔ "شادا! زندگی سیدھی سڑک کی طرح کیوں نہیں ہے۔ اس میں دوراہے کیوں آتے ہیں اور دوراہے بھی ایسے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اصل سڑک کون سی ہے۔ اور نیا راستہ کون سا ہے۔ بندہ چکرا کر رہ جاتا ہے۔"

پھر ایک خط میں اس نے لکھا۔ "شادا! کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ تم سے کچھ نہ پوچھوں، تم سے کچھ نہ کہوں۔ بس تمہیں آزاد چھوڑ دوں۔ تم کھلی ہوا میں اڑو۔ بس مجھے یہ یقین رہے کہ تم خوش ہو۔"

اسپتال کے وارڈ میں زندگی کا ایک خاص رنگ تھا۔ ہم اس رنگ سے مانوس ہوتے جا رہے تھے۔ میری کہنی کا فریکچر خاصا پیچیدہ تھا۔ ڈاکٹر ہربنس کا خیال تھا کہ مجھے معمول سے زیادہ عرصے تک پلاستر کی ضرورت ہوگی۔ پاؤں کو بھی مکمل آرام کی ضرورت تھی۔ یہ فریکچر توقع سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔

مجھے پیاؤ کا انتظار تھا...... لیکن حمزہ کا خیال تھا کہ پیاؤ اب نہیں آئے گی، کیونکہ وہ چنکی کی موجودگی سے خوف زدہ ہو کر یہاں سے گئی تھی۔

شاید وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اب میری خواہش تھی کہ میں جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکوں۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ذہن میں واضح نہیں تھا کہ کیا کرنا چاہتا ہوں لیکن یقینی بات تھی کہ میں کچھ کروں گا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی ذریعے سون سے دوبارہ ملنا تھا۔ مجھے سون کو اس کے حال پر نہیں چھوڑنا تھا۔

پچھلے چند ہفتوں میں شیلین کا خیال بھی ذہن میں کئی بار آ چکا تھا۔ سون کی طرح اس کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہے اور اس پر کیا گزر رہی ہے۔ جب پیاؤ یہاں آئی تھی میں نے اس سے بھی شیلین کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی۔ پیاؤ شیلین کے بارے میں جانتی تھی لیکن اس کی بیماری کی موجودہ کیفیت سے بے خبر

تھی۔

ایک رات ایک نامانوس شور سے میری آنکھ کھلی۔ حمزہ مجھ سے پہلے ہی جاگ چکا تھا۔ برآمدے میں شیشے ٹوٹنے کی زوردار آواز آئی۔ وارڈ میں گہری تاریکی تھی کیونکہ جنریٹر پچھلے تین چار دن سے خراب پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ پاتے دو افراد کے ہیولے دکھائی دیئے۔ وہ سیدھا میرے بستر کی طرف بڑھے۔ ان کا انداز حملہ کرنے والا تھا۔ حمزہ ان کے سامنے آ گیا۔ وہ حمزہ سے گتھم گتھا ہو گئے۔ کئی اور مریض بھی جاگ اٹھے۔ جن میں سکت تھی وہ چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکارنے لگے۔ میں نے اپنے صحت مند پاؤں پر کھڑے ہو کر ایک حملہ آور کو عقب سے دبوچا اور کھینچ کر دیوار سے دے مارا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کرتا میرے کندھے پر کسی لاٹھی نما شے کی ضرب پڑی۔ میں ڈگمگا کر گر گیا۔ پشت پر کندھوں کے درمیان تیز چبھن کا احساس ہوا۔ اچانک ڈاکٹر ہربنس سنگھ کی گرجدار آواز سنائی دی۔ وہ اپنے مریضوں کا ڈاکٹر ہی نہیں راتوں کو ان کی چوکیداری بھی کرتا تھا۔ وہ للکارتا ہوا اندر آیا۔ اس کی آمد نے حملہ آوروں کو ایک دم بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ہربنس سنگھ گالیاں دیتا ہوا ان کے پیچھے دوڑا۔ وہ تینوں آگے پیچھے دوڑتے تاریکی میں گم ہو گئے۔ اسپتال کے سست رو ملازموں میں سے بھی دو تین لاٹھیاں وغیرہ لے کر حملہ آوروں کے پیچھے بھاگے، تاہم ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ صرف خانہ پری کر رہے ہیں۔

چار پانچ منٹ بعد یہ لوگ واپس آ گئے۔ ڈاکٹر ہربنس بھی ان میں شامل تھا۔ وہ حملہ آوروں کو غائبانہ لعن طعن کر رہا تھا۔ حمزہ کے سر اور کندھوں پر کئی ضربات آئی تھیں ان میں چند ضربات تیز دھار آلے کی تھیں۔ یہ آلہ استرا تھا۔ میری پشت پر جو تیز چبھن نمودار ہوئی تھی وہ بھی دراصل استرے کا ہی کٹ تھا۔ اب وہاں سے خون رس کر میری ساری قمیض کو تربتر کر رہا تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ حمزہ کو صرف کندھے پر ایک گہرا زخم لگا تھا، اس کی چربی نظر آنے لگی تھی اور خون نے نیلی قمیض کو سرخ کر دیا تھا۔ حملے کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ حملہ آور ہمیں سنگین طور پر زخمی کرنا نہیں چاہتے تھے ان کا مقصد صرف ہمیں خوف زدہ کرنا تھا۔

استرا بھکشوؤں کے استعمال کی چیز تھا۔ وہ اس سے سر اور چہرے کے بال مونڈتے تھے میں نے اکثر بھکشوؤں کے پاس، کشکول، رومال اور استرا وغیرہ دیکھا تھا۔ ہم پر بھی استرا استعمال ہوا تھا۔ بھاگتے بھاگتے حملہ آوروں نے ایک بوڑھے ملازم کو بھی اپنے تیز دھار

آلے سے گھائل کیا تھا۔ ڈاکٹر ہربنس نے ہم تینوں کی مرہم پٹی کی۔ اس کارروائی کے دوران ہم اس واقعے پر تبصرہ بھی کرتے رہے۔ یقینی بات تھی کہ یہ ہنگامہ انہی لوگوں نے کیا ہے جو اس سے پہلے مجھے ڈھلوان سے دھکیل چکے تھے۔ اس میں سراسر گرو ایش اور گرو کشپال کا ہاتھ نظر آتا تھا۔ بہرحال اس بات کو ثابت کرنا آسان نہیں تھا۔

ڈاکٹر ہربنس کا خیال تھا کہ فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرائی جائے اور اس میں بلا جھجک گرو ایش اور گرو کشپال کا نام لیا جائے۔ اسپتال کی انتظامیہ کے چند دیگر افراد کی رائے بھی یہی تھی لیکن میں اس معاملے کو مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر ہربنس سنگھ سے کہا۔ "پلیز ڈاکٹر! مجھے اس بارے میں تھوڑا سا سوچنے کا موقع دیں۔" حمزہ نے بھی میری تائید کی۔

اس واقعے سے ایک اور Set Back بھی ہوا تھا ارو وہ یہ کہ میرے پاؤں کے فریکچر پر زد پڑی اور صبح تک میرا پاؤں سوج گیا۔ صبح تک ہم پر حملے کی خبر قرب و جوار میں پھیل گئی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ نامعلوم چور اُچکے تھے جو چوری کی نیت سے اسپتال میں داخل ہوئے، وہ اس سے پہلے بھی اسپتال سے راشن وغیرہ چرا چکے ہیں۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ حملہ آوروں کا تعلق مقامی آبادی کو پتا کے بھکشوؤں سے تھا۔ یہ لوگ اسپتال کے کام کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ غرض اس نوعیت کی تین چار تھیوریاں تھیں۔ شام کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ استاد گرو ایش میری عیادت کے لیے اسپتال آئے ہیں۔ یہ قطعی غیر متوقع صورت حال تھی۔ میں اور حمزہ حیران رہ گئے۔ استاد گرو ایش کے ساتھ دو تین معزز چیلے بھی تھے۔ گرو ایش کی طرح وہ بھی گیروا کپڑوں میں تھے۔ سب کا ایک ایک کندھا ننگا تھا۔ گرو ایش کے گلے میں تین مالائیں تھیں جبکہ چیلوں کے گلے میں ایک ایک تھی۔ انہوں نے خاص قسم کے چپل پہن رکھے تھے۔ ایسے چپلوں کے چاروں طرف ایک باریک کنارہ ہوتا تھا۔ اس کنارے کی وجہ سے چپل کا تلا زمین سے نہیں لگتا تھا۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ حشرات وغیرہ پاؤں تلے نہ آئیں۔

اسپتال کے ملازمین نے فوراً کرسیاں فراہم کیں۔ گرو ایش کے چمکیلے سر پر ابھری ہوئی رگیں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ اس نے حسب معمول بڑے ملائم لہجے میں ہم دونوں کا حال دریافت کیا۔ ایک چیلا گرو کے مترجم کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس مترجم کی زبانی ایش بولا۔ "آپ لوگ ہمارے مہمان ہو۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ کے ساتھ دو بار

تکلیف دہ واقعہ ہوا ہے۔ اس رویے کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ یہ کوئی شرارتی لوگ ہیں جو خوامخواہ آپ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ دونوں کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ بھکشو نہیں ہیں اور نہ پگوڈا سے ان کا کوئی تعلق ہے۔ ایک سچا بھکشو اس قسم کی حرکتوں کا سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "محترم گرو! سچ اور جھوٹ کا اندازہ لگانا بھی تو آسان نہیں ہے۔"

"آپ کی بات بھی ٹھیک ہے لیکن یہ کوئی بہت بڑی جگہ نہیں ہے۔ یہاں لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں، مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔"

حمزہ اندر سے کھول رہا تھا۔ مجھے لگا کہ وہ جواب میں کچھ کہنے والا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

اس دوران میں ڈاکٹر ہربنس بھی اپنے دوست ڈاکٹر میو تنگ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ گرو ایش نے اس سے بھی باتیں کیں، انداز ہمدردی کا ہی تھا۔ ڈاکٹر ہربنس بھی کچھ خاموش خاموش تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ ایش کی ہمدردی اور محبت کی حقیقت سمجھتا ہے۔ پندرہ بیس منٹ ہمارے پاس بیٹھ کر اور ہمیں اپنی دعاؤں سے "فیض یاب" کر کے گرو ایش اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا جب اچانک ایک طرف سے چیخنے کی آواز آئی۔

یہ کوئی اور نہیں چنکی تھا۔ وہ جو بڑی مشکل سے کھڑا ہو سکتا تھا اس وقت تن کر کھڑا تھا۔ اس کا استخوانی چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور چہرے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ گرو ایش کی طرف دیکھ کر مقامی زبان میں نجانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑتا محسوس ہوتا تھا پھر وہ طیش سے مغلوب ہو کر گرو ایش کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا دبلا پتلا ہاتھ گرو ایش تک پہنچتا گرو کے چیلے اس کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے چنکی کو پیچھے دھکیلا۔ چنکی کا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔ اس کا مکا ایک چیلے کی ناک پر پڑا تھا۔ یہ مکا دو ڈھائی سال پہلے چیلے کو لگا ہوتا تو وہ یقیناً ہڈی تڑوا بیٹھتا۔ اب یہ ایک بیمار ناتواں شخص کا مکا تھا۔ بہرحال یہ ایک باکسر کا مکا تھا۔ چیلا لڑکھڑا کر دواؤں کی ایک ٹرالی کے اوپر گرا۔ دیگر دو چیلوں نے چنکی کو دبوچ لیا۔ ابھی انہوں نے اسے دو چار تھپڑ ہی لگائے تھے کہ ڈاکٹر ہربنس اور دیگر افراد نے اسے چھڑا لیا۔ اس "مشقت" کے سبب چنکی کو کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا تھا اور اس کے حلق سے گیس گیس کی خوفناک آواز نکلنے لگی تھی۔ اس کا خستہ گریبان

بھی پھٹ گیا تھا اور اندر سے پسلیاں بہت نمایاں دکھائی دے رہی تھیں۔

ڈاکٹر ہربنس کے اشارے پر ملازمین چنکی کو اٹھا کر ڈریسنگ روم کی طرف لے گئے۔ ڈاکٹر ہربنس بھی ان کے پیچھے دوڑ گیا۔

گروایش بظاہر مطمئن کھڑا تھا اور اپنے مشتعل چیلوں کو پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اندر سے وہ بھی گھبرایا ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ہربنس بھی واپس آ گیا۔ وہ مقامی زبان میں گروایش سے باتیں کرنے لگا۔ انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس واقعے پر گروایش سے معذرت کر رہا تھا اور چنکی کو ایک جنونی مریض قرار دے رہا ہے۔

''کیا یہ شخص آپ کو پہلے سے جانتا ہے؟'' میں نے مترجم کے ذریعے گروایش سے پوچھا۔

''لگتا تو یہی ہے لیکن میں اسے نہیں پہچانتا۔'' ایش نے کہا پھر ذرا توقف سے اپنے ایک چیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک دو دفعہ یہ بڑے پگوڈا میں بھی ہنگامہ کر چکا ہے اور مار کھا چکا ہے۔''

صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ گروایش تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے۔ ورنہ وہ چنکی کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ قریبی کمرے سے چنکی کے چیخنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ہنگامہ ختم ہوا اور گروایش اپنے تین عدد چیلوں کے ساتھ بذریعہ چھکڑا اسپتال سے روانہ ہو گیا۔ وہ ہماری تیمارداری کے لیے آیا تھا۔ لیکن اب واپس جا رہا تھا تو اس کے ایک چیلے کی ناک پکوڑا بنی ہوئی تھی۔ ماحول میں کشیدگی سی تھی۔

ایک دو گھنٹے بعد چنکی پھر ہمارے درمیان موجود تھا۔ ڈاکٹر ہربنس نے اپنی پاکٹ سے چنکی کے لیے ''ان ہیلر'' مہیا کیا تھا۔ ''ان ہیلر'' کے استعمال سے چنکی کی سانس قدرے بحال ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ہربنس نے اسے بولنے سے منع کیا تھا مگر وہ پھر بھی بولتا جا رہا تھا۔

''یہ گروایش اور کشپال، سادھو نہیں شیطان ہیں۔ یہ اوپر سے گورے اور اندر سے کالے سیاہ ہیں۔ یہ خود ہی ظلم کرتے ہیں اور خود ہی آنسو پونچھنے کے لیے آ جاتے ہیں۔ بدبخت سمجھ رہے تھے کہ تم دونوں کی تیمارداری کر کے وہ لوگوں کی رائے بدل دیں گے۔ لوگوں کی رائے ان کے بارے میں کبھی نہیں بدل سکتی۔ جو لوگ انہیں جانتے ہیں وہ بڑی اچھی طرح

جانتے ہیں۔''

چنکی منع کرنے کے باوجود مسلسل بول رہا تھا۔ وہ خبطیوں کے انداز میں ہمیں ایک بار پھر وہی کتھا سنانے لگا جو اس سے پہلے درجنوں مرتبہ سنا چکا تھا۔ چھوٹے گروکشپال سے ملنے استاد گروایش کا گاہے گاہے لکشون گاؤں آنا۔ وہاں سون پر اس کی نظر پڑنا۔ دھیرے دھیرے اس کا سون کی طرف مائل ہو جانا۔ سون کو سنگھ میں شامل ہونے کی خصوصی ترغیب دینا۔ آخر اس کا اپنی کوشش میں کامیاب ہونا اور سون کا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چاتو چانگ لے کے مٹھ میں چلے جانا۔ وہاں اس کا دن رات گروایش کے زیر سایہ رہنا اور اس کی دسترس میں ہونا وغیرہ وغیرہ۔

چنکی اس کتھا کے حوالے سے بالکل خبطی ہو چکا تھا۔ ہر بات ہمارے سامنے اس انداز میں بیان کرتا تھا جیسے پہلی بار بیان کر رہا ہو اس کی شدید کڑھن اور اس کا خبط دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ اس کتھا میں کسی نہ کسی حد تک سچائی ضرور موجود ہے۔

میرے اندر جو ارادہ پنپ رہا تھا وہ چنکی کی باتوں سے مضبوط ہوا تھا۔ اس میں کچھ مزید مضبوطی موجودہ حالات کی وجہ سے آ رہی تھی۔ پگوڈا کے منتظم ہمیں جس طرح ڈرا کر یہاں سے بھگانے کی کوشش کر رہے تھے، وہ نظر انداز کرنے والی بات نہیں تھی۔ کان لپیٹ کر یہاں سے نکل جانا اب مجھے کسی طور بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں کوئی پھڈے باز شخص نہیں ہوں۔ لڑائی جھگڑے اور تنازعات سے ہمیشہ دور بھاگا ہوں۔ بلکہ کسی وقت تو مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی بہت توانا و مضبوط شخص نہیں ہوں۔ میری امن پسندی کبھی کبھی کمزوری کی حد کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن وہ شب و روز کچھ ایسے تھے کہ انہوں نے مجھے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ میں سون کے لیے ڈٹ گیا تھا اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میری یہ کیفیت شدید ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ جھوٹے لوگوں کے چنگل میں ہے۔ پگوڈا کے نام پر وہ ایک جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ اپنی زندگی کو...... زندگی کی خوب صورتی کو اور صلاحیتوں کو برباد کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ اس معصوم جذبے کو بھی، جو چار پانچ سال پہلے بنکاک کے کیچڑ میں ایک کنول کی طرح پھوٹا تھا اور ایک خوشبو کی طرح چپکے سے ہمارے رگ و پے میں بس گیا تھا۔

کل رات جو دھینگا مشتی ہوئی تھی اس کے سبب میرے پاؤں پر پھر سوجن ہو گئی تھی اور پاؤں پر وزن نہیں پڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر ہربنس پریشان دکھائی دیتا تھا۔ چھکڑا بان کا رنگ ابھی

تک لکشون گاؤں سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ تین چار دن کا کہہ کر گیا تھا لیکن اب دس روز ہونے کو آئے تھے۔ اس کی غیر موجودگی کے سبب ہمیں اکثر زبان سمجھنے اور سمجھانے کا مسئلہ پیش آتا تھا۔ گھر والوں کی طرف سے پھر فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ ان کا خط ملے اب تین ہفتے ہو چکے تھے۔ کارینگ کے واپس نہ آنے سے پریشانی تو تھی لیکن ایک امید بھی تھی، اور وہ یہ کہ جب وہ واپس آئے گا تو لاہور سے آنے والے ایک دو جوابی خط بھی اس کے پاس ہوں گے۔ حمزہ کا تو خیال تھا کہ وہ صرف اسی لیے لکشون میں رکا ہوا ہے کہ جوابی خط آ جائیں تو وہ لے کر یہاں پہنچے۔

تین چار دن مزید اسی طرح گزر گئے۔ میرے بازو کے پلاستر کے اندر کھجلی ہوتی رہتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کوئی سلائی یا تنکا وغیرہ ہو جسے پلاستر کے اندر گھسا کر بازو کو کھجاتا رہوں۔ فارغ وقت میں تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے بیٹھے میں نے بال پوائنٹ سے پلاستر کی ہموار سطح پر فیض، احمد فراز اور اقبال کے کئی شعر لکھ دیئے تھے۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

اور احمد فراز کا شعر

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

پلاستر کی اوپر کی جانب میں نے باریک لفظوں میں اسی دل پسند نظم کا ترجمہ لکھ رکھا تھا۔ جو جگمگاتی شام میں ایک رکشے پر سون نے مجھے سنائی تھی۔ وہ دل گداز منظوم تحریر جس میں حیران بلبل تھا۔ گم ہو جانے والے سورج کا انتظار تھا۔ سمندر میں اتر جانے والی لہر کا انتظار تھا اور اس ہوا کا انتظار تھا جو رات کے بطن میں روپوش ہو جاتی ہے۔

جسم پر چڑھنے والا پلاستر بھی عجیب شے ہوتا ہے۔ یہ آٹھ دس روز کی اجنبیت کے بعد جسم کا حصہ بن جاتا ہے اور بندہ اس کے نشیب و فراز اور پیچ و خم سے اپنے جسم ہی کی طرح آشنا ہو جاتا ہے۔ میرے بازو کو نوے درجے کے زاویے پر موڑ کر پلاستر کیا گیا تھا۔ یہ نصف ہتھیلی سے شروع ہو کر کندھے سے قریباً پانچ انچ نیچے تک جاتا تھا۔ اس پلاستر کے

اندر میرا بازو سیدھا ہونے کے لیے مچلتا رہتا تھا۔ جیسے وہ کسی تنگ کالی کوٹھڑی میں برسوں سے پڑا ہوا قیدی ہو اور تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا ہو۔ پھر کسی وقت مجھے محسوس ہوتا جیسے یہ بازو نہیں...... یہ میرے اور سون کے سینے میں پلنے والا پیار کا جذبہ ہے۔ یہ ٹوٹ پھوٹ کر حالات کے سخت خول میں بند ہو گیا ہے۔ تاریکی اور گھٹن کا اسیر ہو گیا ہے۔ یہ باہر نکلنا چاہتا ہے۔ روشنی اور تازہ ہوا کو چھونا چاہتا ہے۔ یہ خود کو زندگی کی حدتوں سے معمور کرنا چاہتا ہے۔

شب و روز زبردست یکسانیت کا شکار تھے۔ اس یکسانیت میں کئی طرح کے اندیشے بھی کلبلاتے تھے۔ ان میں یہ اندیشہ بھی تھا کہ گروایش اور کشپال کی طرف سے ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے پھر کوئی کارستانی کی جائے گی۔ جس رات ہم پر حملہ ہوا اس رات تو ڈاکٹر ہربنس بہت سیخ پا نظر آیا تھا لیکن بعد ازاں اس نے بھی حملے کی رپورٹ وغیرہ کرانے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مقامی بھکشوؤں سے مخاصمت بڑھانے کو وہ بھی مناسب نہیں سمجھتا۔ اس کا رویہ حقائق کے عین مطابق تھا۔ اسے یہاں رہنا تھا۔ اس برے بھلے اسپتال کو چلانا تھا اور مصیبت زدہ لوگوں کے دکھ بانٹنے تھے۔ بھکشو پہلے ہی اس کی یہاں موجودگی سے نالاں تھے۔ وہ انہیں مزید نالاں کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ہم دونوں نے محسوس کیا تھا کہ ڈاکٹر ہربنس اپنی مجبوریوں میں بری طرح گھرا ہوا ہے۔ انہی مجبوریوں کے سبب اب وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ ہم زیادہ دیر اسپتال میں نہ رہیں۔ ویسے ہربنس کا رویہ ہمارے ساتھ بے حد ہمدردی اور اپنائیت کا تھا۔ اسی ہمدردی کے سبب اس نے ایک دو بار دبے لہجے میں ہم سے کہا تھا کہ ہم لڑکے شیلن کے حوالے سے بھکشوؤں سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ مقامی طور پر ان لوگوں کا پورا ہولڈ ہے اور وہ اپنی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دیتے۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''جن جی! ان لوگوں نے میرے اندازے کے مطابق شیلن کو انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ شیلن اگر بنکاک جا کر صحت مند ہو جائے تو ان کی ناک نیچی ہو جائے گی۔ وہ اس سے بہتر سمجھتے ہیں کہ شیلن ''چاتو چانگ لے'' میں رہ کر مر جائے۔''

''یہ تو قتل ہے ڈاکٹر!'' حمزہ نے بھڑک کر کہا۔

''لیکن اس قتل کو یہاں کوئی قتل نہیں سمجھے گا اور نہ ثابت کر سکے گا۔ ایسے درجنوں واقعات میں یہاں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔''

تین چار دن مزید گزر گئے۔ کاریگ کے حوالے سے ہماری پریشانی گہرے اندیشوں میں بدلتی جا رہی تھی۔ پتہ نہیں تھا کہ وہ اچانک کیونکر غائب ہو گیا ہے۔ شاید وہ بھی بھکشوؤں کے خوف سے کنی کترا گیا تھا۔ پیاؤ نے بھی دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ کھیا کاستو بھی دو ہفتے سے نہیں آیا تھا، نہ ہی اس نے کسی کو بھیج کر ہماری خیر خیریت دریافت کروائی تھی۔ بہر حال مجھے یقین تھا کہ کاستو کے لیے ہماری حیثیت ابھی تک مہمانوں کی ہے۔

ایک دن دوپہر کے وقت بستر پر لیٹے لیٹے میری نظر اچانک دروازے پر پڑی اور میں ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ جو لمبا تڑنگا مضبوط شخص وارڈ کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ چوہدری جبار تھا۔ ایک جوشیلا اور دبنگ دوست، ہر مصیبت میں بلا تاخیر کود جانے والا، ہر مشکل کے سامنے سینہ سپر ہو جانے والا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے لاہور کے مضافاتی علاقے سے اتنی دور تھائی لینڈ کے اس دور افتادہ گاؤں میں دیکھ رہا ہوں۔ اسی دوران حمزہ نے بھی چوہدری جبار کو دیکھ لیا اور اس کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چوہدری جبار کا چہرہ اندرونی جذبات سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میں بستر پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ لپک کر آیا اور بستر پر بیٹھ کر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اس نے میرے سر پر اور چہرے پر کئی بوسے دیئے اور گلوگیر آواز میں بولا۔ ''ڈاکٹر باؤ! یار تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور تم کہاں ہو۔ دیکھ لو میرے اندیشے درست نکلے ہیں۔ تم یہاں اسپتال میں پڑے ہو اور وہاں ہمیں چٹھیاں لکھ رہے ہو کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو اور سیریں کر رہے ہو۔''

میرے بعد وہ حمزہ سے بغل گیر ہوا اور اس کا منہ سر بھی چوما۔ کاریگ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ وغیرہ ملایا۔ اب یہ بات سمجھنا ہمارے لیے مشکل نہیں تھی کہ جبار کاریگ کے ساتھ ہی یہاں پہنچ سکا ہے۔ ہم حیران تھے اور خوش بھی تھے۔ ایک منٹ پہلے تک ہم ہرگز توقع نہیں کر رہے تھے کہ کاریگ واپس آ جائے گا اور اس کے پاس جوابی خط کے بجائے جیتا جاگتا بندہ ہوگا۔

جبار نے میرے بازو اور پاؤں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''باؤ یار! یہ کیا چن چڑھا لیا ہے تم نے...... یہ کس نے کیا ہے تمہارے ساتھ؟ قسم خدا کی میں اسے جان سے مار دوں گا۔ کون

ہے یہ کشپال؟ تمہارا کیا جھگڑا ہے اس سے...... تمہارے جیسے بندے کے ساتھ اس نے کیوں کیا ہے ایسے؟''

اندازہ ہو رہا تھا کہ کاریگ نے بے وقوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راستے میں جبار کو یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ ''بریفنگ'' دے دی ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جبار بھائی! کیوں آتے ہی ٹھنڈے گرم ہونے لگے ہو۔ کچھ نہیں ہوا ہے یہاں ابھی ذرا سانس لے لو پھر سب تفصیل سے بتاتا ہوں تمہیں۔''

جبار نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ''دیکھو ڈاکٹر باؤ! اور ڈاکٹر حمزہ! مجھے بچوں کی طرح پرچانے کی کوشش نہ کرو۔ جو بھی معاملہ ہے یہاں مجھے سچ سچ بتاؤ۔ قسم خدا کی تمہاری حالتیں دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا ہے۔''

جبار کے آنے سے ماحول میں ایک دم تازگی اور نیا پن آ گیا تھا۔ اسپتال کا بیمار اور خستہ حال ماحول بھی قدرے خوشگوار لگنا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے دو دن تو ہم پاکستان کی باتیں ہی کرتے رہے تھے۔ ہمیں پاکستان سے آئے ہوئے چار مہینے ہی ہوئے تھے لیکن محسوس ہوتا تھا کہ کئی سال بیت گئے ہیں۔ لاہور کے گلی کوچے، لوگ اور مناظر رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ جبار اپنے ساتھ جیسے پورا لاہور ہی اٹھا لایا تھا۔ اس نے گھر والوں کی خیر خیریت سے ہمیں آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ خط ملنے کے باوجود سب کو پریشانی تھی۔ والدہ (میری والدہ) بار بار کہتی تھیں کہ وہاں کوئی گڑبڑ ہے۔ پہلا خط ملنے کے بعد سب لوگ ہماری واپسی کے منتظر تھے۔ لیکن پھر جب دوسرا خط آ گیا اور اس سے پتہ چلا کہ ابھی واپسی کے آثار نہیں تو اندیشے ایک دم حقیقت میں بدلنے لگے۔

چوہدری جبار نے بتایا۔ ''بہن رخشی! سب سے زیادہ پریشان تھی۔ اس نے کئی بار اکیلے میں مجھ سے بات کی اور کہا کہ شاداب اور حمزہ ہم سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ بنکاک میں کوئی ایسی بات ہے جس کی وجہ سے وہ دونوں ہمارے ساتھ واپس نہیں آ سکے۔ بلکہ واپسی کے وقت مل بھی نہیں سکے۔ بعد میں انہوں نے ہمیں چار پانچ دن بعد آنے کے لیے کہا۔ پھر یہ مدت ایک دو ہفتے تک بڑھ گئی اور پھر بڑھتی چلی گئی۔ رخشی کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ آج کل بہت چپ بھی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں مزید خطوں کا انتظار نہیں کروں گا اور یہاں آ کر تمہاری خبر لوں گا۔ میں نے

یہ بات سب سے چھپائے رکھی لیکن روانہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے میں نے رخشی کو سب کچھ بتا دیا۔ تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں انگریزی کے دو چار لفظ ہی بول سکتا ہوں۔ بس خط والا ایڈریس میرے پاس موجود تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ اس ایڈریس تک تو میں پہنچ ہی جاؤں گا۔ میں ایڈریس پر پہنچنے میں کامیاب ہوا اور اس سے آگے یہ چکڑا بان میرے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا۔ یہ بہت گڈ آدمی ہے۔ یہ تمہارا راز بھی رکھنا چاہتا تھا اور اسے یہ بھی منظور نہیں تھا کہ میں تم دونوں سے ملے بغیر مایوس واپس چلا جاؤں۔ میں اس کی منت سماجت کرتا رہا اور آخر کار یہ مان گیا۔''

''رخشی کیسی ہے؟'' میں نے جبار سے پوچھا۔

''تمہارے خیال میں اسے کیسا ہونا چاہیے؟'' جبار نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

''ٹھیک ہی ہونا چاہیے۔''

''تمہارے بغیر وہ کیسے ٹھیک رہ سکتی ہے ڈاکٹر باؤ!'' اس نے کہا اور ایک ہی فقرے میں اپنے اور رخشی کے سارے احساسات مجھ تک پہنچا دیئے۔ میں خاموش رہا۔

یہ شام کا وقت تھا۔ ناریل اور تاڑ کے لمبے لمبے سائے اسپتال کے نیم پختہ احاطے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہم ایک زنگ آلود اسٹریچر کے قریب گھاس پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ چوہدری جبار مجھے کندھے کا سہارا دے کر باہر لایا تھا۔ حمزہ اندر وارڈ میں سو رہا تھا۔

چوہدری جبار نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر باؤ! میں نے تو تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے اب تم بھی بتا دو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا بتانا ضروری ہے؟''

''بالکل ضروری ہے۔ نہ بتاؤ گے تو میں تم سے کشتی شروع کر دوں گا...... ہاں ایک وعدہ ہے...... تم جو کچھ بھی بتاؤ گے تحمل اور آرام سے سنوں گا اور جو تمہاری رائے ہو گی اسے دل سے مانوں گا۔''

میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''جبار بھائی! تم سے کچھ چھپایا جا ہی نہیں سکتا۔ تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ بس تھوڑا سا انتظار اور کر لو...... بس تھوڑا سا۔''

جبار نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ پھر دھیمے انداز میں بولا۔ ''کوئی کڑی شڑی کا معاملہ ہے؟''

''تمہیں کہا ہے ناں جو کچھ بھی ہوا ہے سب تمہارے علم میں لے آؤں گا۔ مجھے تمہارا

مشورہ بھی چاہئے اور مشورہ تم اسی وقت دے سکتے ہو جب تمہیں بات کا پتہ ہو گا۔''

اچانک ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے۔ اونچا لمبا ڈاکٹر ہربنس سفید شرٹ میں ملبوس تیزی سے قدم اٹھاتا ہماری طرف آ رہا تھا۔ آج پہلی بار میں نے اس کے چہرے پر ہلکی سی خوشی کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ گھاس پر اپنا سرخ رومال بچھا کر ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی پتنی اپنے پانچ سالہ بچے کے ساتھ عرصہ چار ماہ سے اپنے میکے میں تھی۔ وہ اس بات سے روٹھ کر گئی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر ہربنس اسے ٹائم نہیں دیتا اور نہ گھر میں معقول خرچ بھیجتا ہے۔ ایک حد تک وہ ٹھیک بھی تھی۔ ہربنس نے اس اسپتال کو ہی اوڑھنا بچھونا بنایا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے ڈاکٹر! کہیں ہماری بھابی سے صلح تو نہیں ہو گئی؟''

''وہ تو ہو ہی جائے گی ڈاکٹر شاداب!'' ہربنس مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آج میں کسی اور وجہ سے خوش ہوں۔

''کچھ ہمیں بھی بتائیں۔'' میں نے کہا۔

''سجن جی! کچھ گرانٹ ملی ہے اسپتال کو۔ زیادہ رقم تو نہیں مگر بلڈنگ کی تھوڑی بہت مرمت تو ہو ہی جائے گی۔ بارشوں کی وجہ سے مریض بے آرام ہوتے ہیں تو سچ مانو میرا من رونے لگتا ہے۔'' ہربنس نے جیب سے ایک چیک نکالتے ہوئے کہا۔

ہربنس کی باتوں سے پتہ چلا کہ یہ گرانٹ قریباً ہر سال دو مرتبہ علاقے میں پہنچتی ہے۔ لیکن اس کا زیادہ تر حصہ پگوڈا کے منتظمین ہڑپ کر جاتے ہیں۔ یہ گرانٹ ایک طرح سے مقامی زمینداروں کی طرف سے فصل کا صدقہ ہوتی ہے۔ مگر یہ صدقہ کچھ لالچی بھکشوؤں کی وجہ سے مستحقین تک کم ہی پہنچ پاتا تھا۔ اس مرتبہ ڈاکٹر ہربنس نے خصوصی کوشش کی تھی اور یوں چند ہزار بھات اسے حاصل ہو گئے تھے۔ وہ کافی دیر تک بیٹھا رہا اور اسپتال کے حوالے سے اپنے سنہرے خوابوں کی تفصیل بیان کرتا رہا۔ خواب بہت تھے اور رقم بہت چھوٹی تھی اور پھر ڈاکٹر ہربنس کو اس آفت کا پتہ بھی نہیں تھا جو ایک دو دن میں یہاں آنے والی تھی۔

یہ تیسرے دن صبح آٹھ بجے کی بات ہے جب اسپتال میں ہیضے کے مریض آنے شروع ہوئے۔ میں چھڑی کے سہارے چلتا ہوا ساتھ والے وارڈ میں پہنچا تو چنکی کے بیڈ کے ساتھ ہی تین چار مریض قے اور اسہال کی شکایت کے ساتھ کراہ رہے تھے۔ میں باتھ روم سے ہو کر واپس آیا تو ان مریضوں کی تعداد آٹھ سے دس ہو چکی تھی۔ کئی مریض

پیٹ کے درد کے سبب بری طرح چیخ رہے تھے۔ ڈاکٹر ہربنس ابھی وارڈ میں نہیں آیا تھا۔ اس کا ایک ملائیشین اسسٹنٹ ''مستقیم'' تندہی سے مریضوں کے ساتھ مصروف تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں یہ انکشاف ہوا کہ اردگرد کے علاقے میں حسب معمول تیز بارشوں کے بعد ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی ہے اور مریض تیزی سے اسپتال میں پہنچ رہے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اسپتال کے دونوں وارڈز بھر گئے اور پریشان حال لوگوں نے مریضوں کو فرش پر کپڑے بچھا کر لٹانا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر ہربنس بھی آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت پریشانی تھی۔ اور وہ اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور کمپاؤنڈروں کے ساتھ چاروں طرف بھاگا پھر رہا تھا۔ حمزہ بھی ہاتھ بٹانے کے لیے اس مختصر ٹیم میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن اصل مسئلہ دواؤں کا تھا...... یہاں بمشکل آٹھ دس مریضوں کے لیے ''ٹریٹ منٹ'' کا سامان موجود تھا جبکہ مریضوں کی تعداد اب کئی درجن سے تجاوز کر گئی تھی۔ انجکشنوں کے علاوہ گلوکوز ڈرپس کی بھی اشد ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ نمکول وغیرہ درکار تھا۔

دوپہر تک یہ حالت ہو گئی کہ اسپتال کے برآمدے اور احاطے میں بھی مریض نظر آنے لگے۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں سبھی شامل تھے۔ ہر طرف چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ پتہ چلا کہ نواحی علاقوں میں ہیضے کی وبا کل رات سے پھوٹی ہوئی ہے۔ حسب رواج لوگ پہلے اپنے طور پر ٹونے ٹوٹکے کرتے رہے ہیں جب حالات زیادہ خراب ہوئے ہیں تو اسپتال کی طرف بھاگنا شروع ہوئے ہیں۔

بڑے دلدوز مناظر تھے۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا اس کا معصوم بچہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی ڈاکٹر روم کی طرف دوڑی۔ فرش پر لیٹے ایک مریض سے ٹھوکر کھا کر گر گئی۔ اس کا بچہ پہلے ہی جاں بلب تھا فرش پر لڑھکنے کے چند سیکنڈ بعد ہی ایکسپائر ہو گیا۔ عورت جو خود بھی وبا کی شکار تھی گرنے کے فوراً بعد بے ہوش ہو گئی۔ ملازم اسے اٹھا کر عورتوں والے پورشن کی طرف لے گیا۔

میں نے دیکھا ایک دیہاتی عورت نے اپنے ہاتھوں میں ڈاکٹر ہربنس کا بازو جکڑا ہوا تھا اور چیخ چیخ کر اسے اپنے شوہر کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس کا شوہر فرش پر پڑا تھا۔ اور ڈی ہائیڈریشن کی شدت سے مرنے کے قریب تھا۔ وہ مقامی زبان میں ہربنس سے اپنے جاں بلب شوہر کے لیے دوا مانگ رہی تھی۔ وہ اسے کھینچ کھینچ کر اپنے شوہر کی طرف متوجہ

کر رہی تھی جبکہ ہربنس ایک مریض بچے کو انجکشن لگانے کی فکر میں تھا۔ اس کھینچا تانی میں انجکشن کی وائل ہربنس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئی۔ ہربنس نے غصے سے جلد باز عورت کی طرف دیکھا جس عورت کے بچے کو لگنے والا انجکشن جلد باز عورت کی وجہ سے ٹوٹا تھا وہ غضب سے پاگل ہو کر اس عورت پر ٹوٹ پڑی اور جوتیوں سے اس کو پیٹنے لگی۔ چیختے چلاتے ہوئے مریض ہر اخلاقی قید سے آزاد نظر آ رہے تھے۔

میں نے ہربنس سے کہا۔ ''ڈاکٹر آپ کسی طرح دواؤں کا انتظام کریں۔ ہم کوشش کر کے یہاں کا کام سنبھالتے ہیں۔''

یہ حقیقت تو ہربنس کو بھی نظر آ رہی تھی کہ دواؤں کے بغیر یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے اسی وقت اپنی جمع پونجی نکالی اور ایک ادھیڑ عمر ملازم کے ساتھ اپنی پرانی فوجی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

اس روز میرے علاوہ حمزہ اور چوہدری جبار نے بھی انسانی بے بسی اور لاچاری کے وہ وہ مناظر دیکھے کہ روح کانپ اٹھی۔ لوگ رو رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ فرش پر پچھاڑیں کھا رہے تھے اور ماتم کر رہے تھے۔ وہ دوا کے ایک ایک قطرے کو ترس کر مر رہے تھے اور کچھ دور ٹیلے پر واقع پگوڈا میں مہاتما کے جھوٹے پجاری بالکل لاتعلق بنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اسپتال کو ملنے والی رقم اپنی توندیں بڑھانے میں صرف کی تھی یا میلوں ٹھیلوں کی نذر کی تھی یا اس سے سونے کے پانی والے سنہری کلس بنائے تھے۔ اب وہ ان کلسوں کے نیچے بیٹھے آرام و سکون کی بانسری بجا رہے تھے۔ اور گھٹنوں میں سر دیے کر روحانی مراقبوں میں مصروف تھے۔ بدھا کا وہ حکم نجانے کس طاق نسیاں میں پڑا تھا جس میں انہوں نے ہدایت کی تھی کہ بھکشو فقط اپنے بارے میں ہی نہ سوچے وہ صرف اپنے سکون کی پرواہ ہی مت کرے وہ بڑے درد کے ساتھ اس بات پر غور کرے کہ وہ پوری انسانیت کے دکھ درد کا مداوا کیسے کر سکتا ہے۔ وہ لوگوں کے دکھ کیسے بانٹ سکتا ہے۔

وہ ہمیں قیامت کا دن محسوس ہو رہا تھا۔ شام تک اسپتال میں کم و بیش دو درجن افراد ہلاک ہو چکے تھے اور اتنے ہی ایسے تھے جن کی حالت نازک تھی۔ مرنے والوں میں زیادہ تر تھائی بچے تھے۔ تھائی بچے گول مٹول ہوتے ہیں لیکن آٹھ پہر تک شدید ڈی ہائیڈریشن میں مبتلا رہ کر مرنے والے بچے صحرا کے پھولوں کی طرح جھلس چکے تھے۔ ان کی آنکھیں گہرائی میں اتر گئی تھیں اور ان کے سوکھے سیاہ ہونٹ ادھ کھلے رہ گئے تھے۔ ان کی ماؤں

کے بین سنے نہیں جاتے تھے۔ یقیناً یہ بین بدھمت کے ان ناجائز ٹھیکیداروں تک بھی پہنچے ہوں گے جو شفاف فرشوں والے کمروں میں بیٹھ کر مالاؤں کو گردش دے رہے تھے اور خوشبوؤں کے گھیرے میں تھے۔ لیکن وہ تو سکون اور راحت کے متلاشی تھے۔ وہ زندگی کے اس تلخ اور کریہہ پہلو کا سامنا کیوں کرتے؟ اپنی تن آسانیوں کو اپنی "روحانی راحتوں" کے گرد لپیٹ کر وہ بالکل الگ تھلگ بیٹھے تھے پگوڈا کی کسی کھڑکی میں کوئی چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

ڈاکٹر ہربنس رات نو بجے کے قریب دوائیں اور ڈرپس وغیرہ لے کر اسپتال پہنچا۔ یہ سامان ایک چھکڑے پر لاد کر لایا گیا تھا۔ دوائیں پہنچنے کے فوراً بعد تیزی سے مریضوں کا علاج شروع ہو گیا۔ دواؤں کے علاوہ ڈاکٹر ہربنس نے غذا کا انتظام بھی کیا تھا۔ وہی چاول اور ڈبل روٹی وغیرہ کی ایک بڑی مقدار وہ دوسرے چھکڑے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

ڈاکٹر ہربنس نے کہا۔ "سجن جی! اصل مسئلہ پانی کا ہے ہمیں کافی زیادہ مقدار میں پانی ابالنا ہوگا۔"

حمزہ نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ چالیس پچاس لیٹر پانی ہم نے ابال کر ٹھنڈا کیا ہوا ہے۔ ابھی مزید ابالا جا رہا ہے۔"

"صفائی کے کام کے لیے آٹھ دس مزدوروں کا انتظام بھی ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

ہربنس کے تھکے ہوئے چہرے پر قدرے رونق نظر آنے لگی۔

اگلے دو تین روز ہم نے آٹھوں پہر کام کیا۔ ہم نے شفٹیں بنائی تھیں۔ ہر شفٹ کو آرام اور دیگر ضروریات کے لیے چھ سات گھنٹے ملتے تھے۔ ان دو تین دنوں میں، میں نے ہربنس کو مشین کی طرح کام کرتے دیکھا۔ وہ ایسے کام بھی کر گزرتا تھا جس کا کوئی عام ڈاکٹر تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اسٹریچر نہ ہونے کی صورت میں وہ مریض کو خود اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیتا تھا۔ باورچی اور چوکیدار کے فرائض انجام دے لیتا تھا۔ مریضوں کی گندگی تک صاف کر لیتا تھا۔ ان تین دنوں نے ہماری نظر میں ڈاکٹر ہربنس کی قدر و منزلت کئی گنا بڑھا دی تھی۔

تیسرے دن وبا کا زور ٹوٹ گیا۔ نئے مریض آنا بند ہو گئے اور پرانے مریض بہتر ہونے لگے۔ پہلے دن کی ہلاکتوں کے بعد صرف دو تین مریض اور مرے تھے...... یہ اسپتال اور ڈاکٹر ہربنس بہت سے مریضوں کی زندگی کا وسیلہ بن گئے تھے۔ ڈاکٹر ہربنس

نے مسلسل تین روز جو شب و روز مشقت کی تھی اس کا ایک برا نتیجہ بھی نکلا اور وہ یہ کہ ڈاکٹر ہربنس کو گردے کا درد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر کو اس درد کی شکایت ایک دو مرتبہ پہلے بھی ہو چکی تھی۔ ماہر ڈاکٹر نے طبی معائنے کے لیے شہر جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اپنی مصروفیات کے باعث ڈاکٹر ہربنس شہر نہیں جا سکا تھا۔ ہیضے کی وبا پھیلنے سے پہلے بھی ڈاکٹر کو پہلو میں بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ وبا کے دنوں میں زبردست بھاگ دوڑ سے یہ تکلیف کافی بڑھ گئی۔

دو تین دن کے اندر اسپتال میں حالات نارمل ہو گئے تو ہربنس کے ساتھی ڈاکٹروں نے کہہ سن کر اسے "بنکاک" جانے پر آمادہ کر لیا۔ اس موقع پر مجھے ڈاکٹر ہربنس کی مالی حالت کے بارے میں بھی اندازہ ہوا۔ ڈاکٹر کے پاس ذاتی طور پر اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ وہ دس بارہ روز شہر میں رہ کر علاج کرا سکے۔ اسے اسپتال کی مرمت کے لیے جو چیک ملا تھا وہ سارا ہنگامی دواؤں پر خرچ ہو گیا تھا۔ بلکہ اس میں ڈاکٹر کی تھوڑی بہت "سیونگ" بھی لگ گئی۔ اب وہ تقریباً خالی ہاتھ تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یہ درویشی اس درویشی سے ہزار درجے بہتر نظر آئی جو ہاتھ میں کشکول پکڑ کر اور ننگے پاؤں ویرانوں میں گھوم کر اختیار کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر ہربنس کو درد میں افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ایک ساتھی ڈاکٹر کے ساتھ شہر چلا گیا۔

میرے پاؤں کا درد بتدریج بہتر ہو رہا تھا۔ حمزہ کی چوٹیں بھی اب ٹھیک تھیں۔ چوہدری جبار کے آنے سے ہمیں بے حد حوصلہ ملا تھا۔ چوہدری جبار نے یہاں آ کر کچھ نہیں کیا تھا لیکن اس کی فقط موجودگی ہی بڑی حوصلہ افزا تھی۔ ایک طرح کے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ لاہور میں بھی ایک لائسنسی ریوالور ہر وقت چوہدری جبار کے پاس موجود رہتا تھا۔ یہاں بھی اس نے پتہ نہیں کہاں سے ایک ولایتی ریوالور حاصل کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا لائسنس وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے اور حمزہ نے اسے منع بھی کیا تھا لیکن ایسی باتوں سے اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ وہ رات کو وارڈ کے اندر میرے اور حمزہ کے سرہانے سوتا تھا اور لگتا تھا کہ رات کو جاگتا ہی رہتا ہے۔

رات کو کسی وقت وہ ہولے ہولے گنگنانے لگتا تھا۔ اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔ جبار جیسے دبنگ شخص کے مزاج کا یہ پہلو قدرے مختلف تھا۔ آواز کا یہ درد شاید ماضی کے اس سانحے سے تعلق رکھتا تھا جس نے چوہدری جبار کی زندگی کا رخ موڑا تھا۔ چوہدری جبار کی

محبوب بیوی زرینہ ایک معمولی تکلیف کا شکار ہوئی تھی اور دیہاتی علاقے میں بروقت مناسب علاج نہ ملنے سے عین عالم جوانی میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اس شدید جذباتی دھچکے نے چوہدری کی کایا پلٹی تھی اور وہ ڈاکٹر رخشندہ کا دست و بازو بن گیا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر رخشندہ (رخشی) نے اپنی ساری توانائیاں پس ماندہ علاقوں کے لاچار مریضوں کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ چوہدری کا یہ فیصلہ جذباتی نہیں تھا، اگر جذباتی ہوتا تو اتنے سال گزرنے کے باوجود وہ رخشی کے ساتھ دور افتادہ علاقوں میں مارا مارا نہ پھر رہا ہوتا۔

ایک رات اسپتال کے وارڈ میں گنگناتے گنگناتے وہ بولا۔ ''ویسے ڈاکٹر باؤ! مجھے لگتا ہے کہ یہاں بھی سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ادھر ہمارے گاؤں راجوالی میں تھا۔ وہاں پیر جی تھا، یہاں چھوٹا گرو ہے۔ وہاں پیر جی کا استاد وڈا سائیں تھا۔ یہاں چھوٹے گرو کا استاد گرو ایش ہے۔ وہ دونوں بھی سیدھے سادھے لوگوں کو اپنے تعویذ گنڈوں سے بے وقوف بناتے تھے، یہ دونوں بھی ہر مرض کا علاج اپنے ٹوٹکوں سے کرتے ہیں۔ وہاں بھی موت بانٹی جارہی تھی، یہاں بھی موت بانٹی جارہی ہے۔''

میں کہنا چاہ رہا تھا کہ ایک شہناز وہاں تھی...... ایک شہناز (شیلن) یہاں بھی ہے لیکن میں خاموش رہا۔

چوہدری بولا۔ ''ڈاکٹر باؤ چپ کیوں ہو گئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''جبار بھائی! یہ پیر جی اور یہ وڈے سائیں کہاں موجود نہیں ہیں۔ پچھلے چند مہینوں میں ہم بہت دور تک گئے ہیں۔ ہمیں تو ہر جگہ یہ لوگ ملے ہیں۔ بس ان کے نام بدل جاتے ہیں اور چہرے بدل جاتے ہیں۔ خصلت یہی رہتی ہے۔ ہر چھوٹا گرو اپنے گرو ایش کا خصوصی چمچہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے گرو ایش کے لیے راستے ہموار کرتا ہے اور اس کا باقاعدہ صلہ وصول کرتا ہے۔ کچھ معتبر لوگ ان کی پشت پناہی کرتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر سیدھے سادھے دیہاتی لوگوں کی زندگیوں کو کھلونا بناتے ہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہربنس فرشتہ بن کر ان لاچار لوگوں میں آتا ہے تو اس کے پر توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کی گردن کاٹ کر اس کی کھال میں بھس بھرنے کی سازشیں تیار کی جاتی ہیں۔ یہی کچھ ہر ڈاکٹر رخشی کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔''

ہم پہلے بھی اس موضوع پر بات کر چکے تھے۔ اب بھی کر رہے تھے۔ یہ موضوع ہی ایسا تھا جس پر جتنا بولا جاتا کم تھا، ہیضے کی وبا کے سبب جو سہ روزہ قیامت یہاں آئی تھی اس

کے بارے میں بھی ہم اکثر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔

تین روز بعد ''بنکاک'' سے ڈاکٹر ہربنس کے بارے میں اطلاع آئی۔ اس کی تکلیف میں کچھ افاقہ تھا۔ اس کے ٹیسٹ ہوئے تھے۔ ابھی ایک ٹیسٹ مزید ہونا تھا۔ اس کی طرف سے صورتحال اطمینان بخش تھی۔ لاہور میں اپنے اہل خانہ کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے ہم نے ایک ایک خط اپنے گھروں کو ارسال کر دیا تھا۔ میں نے ایک خط رخشی کے نام لکھا تھا۔ اس میں اسے اپنی خیر خیریت کے بارے میں یقین دلایا تھا۔ چوہدری جبار کے کہنے پر ہم نے چوہدری کے ساتھ چند تصویریں کھنچوائی تھیں۔ ان تصویروں میں میرا پلاسٹر شدہ بازو تو آ گیا تھا مگر میں نے زخمی پاؤں کو ایکسپوز نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ تصویریں یہیں ڈویلپ نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہم نے یہ کاریگ کو دے دی تھیں اور اسے کہا تھا کہ وہ انہیں پرنٹ کروا کر خطوں کے ساتھ ہی پوسٹ کر دے۔ اپنے زخمی بازو کے بارے میں، میں نے رخشی اور گھر والوں کو یہی بتایا تھا کہ ڈھلوان سے پھسل کر یہ صورتحال پیش آئی ہے۔ خط میں، میں نے اہل خانہ کو پوری تسلی دی تھی۔

جس دن کاریگ اسپتال سے ہمارے خط وغیرہ لے کر روانہ ہوا اسی شام ڈاکٹر ہربنس کا ایک تھائی کمپاؤنڈر کوئی خاص اطلاع لے کر میرے پاس آیا۔ اس وقت میں ہڈیوں کے اس پنجر کے پاس موجود تھا۔ جسے ہم چنکی کہتے تھے۔ چنکی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کھانستے ہوئے اس کے کپڑے اکثر خراب ہو جاتے تھے۔ اس کے پاس سے ہر وقت بدبو اٹھتی تھی۔ میں اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ کمپاؤنڈر نے سر کے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ میں باہر پہنچا تو اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''جناب! گرو ایش آئے ہیں۔''

''کس لیے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ڈاکٹر ہربنس جی سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا کہ وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر آپ کے بارے میں پوچھنے لگے۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ پچھلی مرتبہ گرو ایش کو دیکھ کر چنکی نے جو واویلا کیا تھا اس کے سبب گرو ایش اندر نہیں آیا اور باہر کمرے میں ہی بیٹھا ہوا ہے۔ میں کمپاؤنڈر کے ساتھ چھڑی کے سہارے چلتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گرو ایش خلاف معمول اکیلا بیٹھا تھا۔ بس لمبی سی ناک والا ایک دبلا پتلا بھکشو اس کے ساتھ تھا جو یقیناً مترجم تھا۔

ایش نے اپنے چہرے پر رعب وجلال طاری رکھنے کی مصنوعی سی کوشش کر رکھی تھی۔
رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد میں گرو ایش کے روبرو بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے اور ایش کے درمیان مترجم کے ذریعے جو رازدارانہ گفتگو ہوئی۔ وہ کچھ اس طرح تھی۔
ایش نے کہا۔ ''ڈاکٹر میں تمہیں ایک ضروری کام کے لیے ''چاتو چانگ لے'' لے جانا چاہتا ہوں، کیا تم جاسکو گے؟''
میں نے کہا۔ ''گرو صاحب! میں آپ سے کام کی نوعیت پوچھ سکتا ہوں۔''
وہ بولا۔ ''میں تمہیں بتا دوں گا لیکن اس کے لیے تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ بات صرف تم تک ہی محدود رہے گی۔ اس میں ہماری عزت اور انا کا مسئلہ ہے۔''
''میں کچھ سمجھا نہیں گرو صاحب!''
وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے میری جانب دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اپنے ایک بہت قریبی مریض کے علاج کے لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' (بات کرتے ہوئے گرو ایش کے سر کی ابھری ہوئی رگیں کچھ مزید ابھر جاتی تھیں)
میں حیران رہ گیا۔ ایک طرف یہ شعبدے باز شخص خود کو ہر درد کی دوا بتاتا تھا۔ دوسری طرف اپنے ہی کسی درد کے مداوے کے لیے خاموشی سے میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس سے بڑی منافقت اور کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے تاثرات کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں مریض کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔''
''بس یوں سمجھو کہ وہ ہمارا بہت قریبی ہے۔ میں اس کی صحت کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''
میں نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر گرو ایش کی سرخی مائل آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپ مقامی انداز میں علاج کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ پھر بھی آپ کو اپنے قریبی عزیز کیلئے میری مدد کی ضرورت ہے۔''
استاد گرو ایش نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ ایسا معاملہ ہے جو آسانی سے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ بس تم یہ سمجھو کہ ہماری صلاحیتیں زیادہ تر دوسروں کے لیے ہیں۔ اکثر یہ صلاحیتیں ہمیں خود فائدہ نہیں پہنچاتیں۔ خاص طور سے اس وقت جب ہمارے اندر فائدہ پہنچانے کی خواہش شدید ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ میرا پاؤں ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔ اگر آپ ضروری سمجھتے ہیں تو میرے ساتھی حمزہ کو لے جائیں۔''
''نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم ہی چلو۔ تم مجھے اس سے زیادہ تجربہ کار لگتے ہو۔'' گرو ایش نے کہا۔
حمزہ کو ساتھ لے جانے والی بات میں نے یونہی کہہ دی تھی۔ ورنہ میں خود بھی شدت سے چاہ رہا تھا کہ مجھے پگوڈا یا مٹھ میں جانے کا موقع ملے۔ ایسی صورت میں کہیں سون کی صورت بھی نظر آ سکتی تھی۔ تھوڑی سی ''ڈسکشن'' کے بعد میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔
گرو ایش نے کہا۔ ''ڈاکٹر! میں چاہتا ہوں کہ یہ کام بڑی رازداری سے ہو۔ میرا مطلب ہے عام لوگوں کو تمہارے مٹھ میں آنے اور جانے کا پتہ نہیں چلے...... میرا خیال ہے کہ تم میری مجبوری سمجھ رہے ہو۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں ایش کی منافقت کو کوسا۔
ایش نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہا۔ ''تم اگر چاہو تو اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنے حوالے سے اعتماد میں لے سکتے ہو۔ لیکن کسی اور کو اس بارے میں ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہئے۔ تم اپنا ضروری سامان لے کر تیار رہو۔ میرے یہاں جانے کے آدھ گھنٹے بعد ایک گھوڑا گاڑی یہاں پہنچے گی۔ لیکن وہ اسپتال تک نہیں آئے گی۔ یہاں سے ایک فرلانگ دور پل پر کھڑی ہوگی تم گاڑی میں بیٹھ کر پہنچ جانا۔ باقی باتیں وہاں ہوں گی۔''
میرے ساتھ ضروری تفصیل طے کر کے گرو ایش مترجم کے ساتھ واپس چلا گیا۔
میں نے حمزہ اور جبار کو ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ جبار ایک دم الرٹ نظر آنے لگا۔ اس کا اندیشہ تھا کہ معاملے میں کوئی چکر نہ ہو۔ وہ بضد ہو گیا کہ میرے ساتھ ہی مٹھ میں جائے گا میں نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں ٹلا۔ پھر حمزہ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ مجھے جبار کو اپنے ساتھ رکھنا چاہئے۔

❁❁❁

رات کے تقریباً دس بجے تھے جب ہم گھوڑا گاڑی پر ایک ہچکولے دار سفر کے بعد ''چاتو چانگ لے'' پہنچے۔ یہ ایک بند گھوڑا گاڑی تھی۔ میں اور جبار آمنے سامنے لچک دار نشستوں پر بیٹھے تھے۔ گاڑی بان گاڑی کے اگلے حصے میں تھا اور گاڑی کے دو گھوڑوں کو بڑی چابکدستی سے چلاتا ہوا قریباً ڈھائی گھنٹے میں یہاں پہنچا تھا۔ میں نے تھوڑا سا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ ہم مٹھ کے بلند و بالا دروازے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ بائیں طرف کچھ فاصلے پر چاتو چانگ لے کی بستی نیند کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی تھی۔ بس کسی کسی جھونپڑے میں لالٹین کی روشنی دکھائی دے دیتی تھی۔ پگوڈا کو جانے والی وسیع و عریض سیڑھیاں بھی بائیں جانب نظر آ رہی تھیں لیکن وہ ہمارے سامنے تھیں جبکہ بستی عقب میں تھی۔ ہم گھوڑا گاڑی سمیت مٹھ میں داخل ہو گئے۔ احاطہ بھی ہم نے گاڑی میں ہی طے کیا۔ عمارت کی عقبی جانب ایک تنگ راہداری کے سامنے گاڑی رکی۔ گروایش کی ہدایت کے مطابق میں اندر ہی بیٹھا رہا قریباً دس منٹ بعد وہی لمبی ناک والا ''طوطا چشم'' مترجم گاڑی کے دروازے پر نمودار ہوا اور ہمیں اپنے ساتھ لے کر ایک اندرونی کمرے میں چلا گیا۔

کمرے میں چٹائی بچھی تھی اور گیس لیمپ روشن تھا۔ ایک دیوار پر دو کشکول اور مالائیں وغیرہ آویزاں تھیں۔ الماری میں بدھ مت سے متعلق کتابیں رکھی تھیں۔ ہم دو چار منٹ اس کمرے میں رکے۔ پھر چوہدری جبار تو وہیں رہا لیکن مترجم مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا نسبتاً بہتر طریقے سے سجا ہوا تھا۔ یہاں کی چٹائی بھی نفیس تھی۔ کمرے کے وسط میں گروایش میرے استقبال کے لیے موجود تھا۔ ہم دونوں آمنے سامنے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ مترجم کی وساطت سے ہمارے درمیان گفتگو شروع ہوئی۔ میرے لیے یہ گفتگو سنسنی خیز تھی۔

گروایش نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک مریضہ کے لیے یہاں لایا ہوں۔ وہ مٹھ کی ایک

ہونہار طالبہ ہے۔ یوں سمجھو کہ میرے ہونہار شاگردوں میں سے ایک ہے۔ میں اسے ہر صورت میں صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ دنوں سے بہت سست تھی۔ اور سر درد وغیرہ کی شکایت کر رہی تھی۔ کوئی دس روز پہلے کی بات ہے کہ جب کتاب کی تعلیم کے دوران اچانک اس پر دورہ پڑا۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑنے لگے اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ کافی جتن کے بعد وہ ہوش میں تو آ گئی لیکن پوری طرح صحت مند نہیں ہوئی۔ دو دن بعد رات کے وقت اسے پھر دورہ پڑ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئی ...... پچھلے پانچ دن میں اسے وقفے وقفے سے کئی مرتبہ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کی شکایت ہو چکی ہے۔ اس کے لیے جو کچھ مٹھ میں کیا جا سکتا تھا کیا جا چکا ہے مگر بہتری کی صورت نظر نہیں آ رہی۔''

میرے ذہن میں آندھی سی چلنے لگی۔ دل کے اندر کہیں گہرائی سے آواز آنے لگی تھی کہ ہو نہ ہو گروایش جس طالبہ کا ذکر کر رہا ہے وہ سون ہی ہے اور وہ سون کے لیے ہی مجھے یہاں لے کر آیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ سون ان دنوں شدید ''ٹینشن'' میں ہو گی۔ عین ممکن تھا کہ اس کا پرانا مرض ''ٹینشن'' کی وجہ سے عود کر آیا ہو۔ میری نگاہوں میں وہ چار پانچ سال پرانا منظر گھوم گیا تھا۔ جب سون بنکاک کے بوبے مارکیٹ میں کھلونوں کی ایک دکان پر بے ہوش ہو کر گری تھی۔ معلوم ہوا تھا کہ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ اس کیفیت کا شکار ہو چکی ہے۔

میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں ہے آپ کی مریضہ......؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' ایش نے کہا اور میرے ساتھ راہداری میں آ گیا۔

مٹھ کا اندرونی ماحول بے حد گھٹن والا تھا۔ چاروں طرف پتھریلی دیواریں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے دروازے چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں۔ مہاتما بدھ کے چھوٹے بڑے مجسمے جگہ جگہ نصب تھے۔ پتھریلی کھردری دیواروں پر ناقابل فہم زبان میں لکھے ہوئے کتبے موجود تھے۔ ہم چند نیم روشن کمروں سے گزر کر ایک نسبتاً روشن کمرے میں پہنچے۔ دو سرخ پوش لڑکیوں نے زرخرید کنیزوں کی طرح رکوع کے بل جھک کر گروایش کو تعظیم پیش کی اور باہر نکل گئیں۔

میرے دل کی دھڑکنیں جیسے تھم گئیں۔ میرے اندازے ٹھوس حقیقت میں بدل گئے تھے۔ بڑا ڈرامائی سا منظر تھا۔ میرے سامنے قریباً ایک فٹ اونچے چھوٹے سے بستر پر سون گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے قریب بانس کی بنی ہوئی ایک تپائی رکھی تھی۔ تپائی پر چینی

کے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں چند ایک محلول رکھے تھے۔ ایسا ہی کوئی محلول سون کی چکیلی پیشانی پر بھی ملا گیا تھا۔ اس کے ٹخنوں اور کلائیوں پر کئی طرح کے دھاگے یا تعویذ بندھے ہوئے تھے۔ وہ نیند میں تھی پھر بھی اس کے چہرے پر سکون کی کیفیت نہیں تھی۔ اس کے چہرے کا چاند دھندلایا ہوا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ واقعات کا بہاؤ مجھے اس طرح نہ صرف مٹھ کے اندر لے آیا ہے بلکہ سون بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ سب کچھ بہت ڈرامائی تھا۔ اب مجھے سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ سون بیدار ہونے کے بعد میری طرف دیکھے گی اور اپنے تاثرات پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ وہ بدحواسی میں کچھ بول بھی دیتی۔

میں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''ابھی یہ سو رہی ہے۔ بہتر ہے کہ انہیں اپنی مرضی سے اٹھنے دیا جائے۔ اس دوران ہم دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ آپ مجھے مریضہ کی کیفیت کے بارے میں بتائیں اور تھوڑی سی وضاحت کر دیں کہ دورے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔''

میری یہ بات مترجم نے ایلش تک پہنچائی۔ چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ایلش مجھے پھر پہلے والے کمرے میں لے گیا۔ ہم تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔ اپنا وزنی میڈیکل باکس میں نے ایک گوشے میں رکھ دیا۔ ایلش مجھے سون کی کیفیات بتانے لگا۔ میں یہ کیفیات پہلے سے جانتا تھا۔ ایلش نے مجھے بتایا کہ مریضہ سون کچھ دن سے پریشان بھی تھی۔ ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھی۔ کسی وقت آنکھیں سوجی ہوتی تھیں جیسے روئی ہوئی ہو۔ وہ ایک خاص بھرت بھی رکھ رہی تھی جس میں آٹھ پہر میں فقط تین لقمے کھائے جاتے ہیں۔ اس بھرت نے اسے کافی کمزور کیا ہے۔ بیماری کے بعد اس سے یہ بھرت چھڑا دیا گیا ہے۔ میں بظاہر سن رہا تھا مگر میرا سارا دھیان صورتحال کو سلجھانے میں لگا ہوا تھا۔ ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد گرو ایلش کسی کام سے اٹھ کر باہر گیا تو میں نے مترجم سے کہا۔ ''آؤ ذرا ایک نظر مریضہ کو دیکھیں۔''

''طوطا چشم'' مترجم کے ساتھ چلتا ہوا میں پھر اس کمرے میں پہنچا جہاں سون ہزار داستان کی کسی سحر زدہ شہزادی کی طرح سو رہی تھی۔ میں چند فٹ کے فاصلے پر سون کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بڑا سنہری موقع تھا۔ میں

نے مترجم سے کہا۔ ''ذرا میرا میڈیکل باکس لے آؤ۔''

وہ باکس لینے کے لیے راہداری کی طرف مڑ گیا۔ میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ سون کا شانہ جھنجھوڑ دیا۔ وہ پہلے ہی نیم بیدار ہو چکی تھی۔ کسمسا کر جاگ گئی۔ چند سیکنڈ تک وہ خالی خالی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کے حسین زرد چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آئے اور وہ تڑپ کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں کے ساتھ اس کا منہ بھی کھلا ہوا تھا۔

میں نے انگریزی میں کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں سون! میں یہاں گرو ایلش صاحب کے ساتھ آیا ہوں۔ وہ ایک سیکنڈ کے لیے باہر گئے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی میں کچھ پیچھے ہٹ گیا۔ مبادا وہ بلند آواز میں کچھ بول دے۔

''کک...... کہاں ہے گرو ایلش!'' وہ بوکھلا کر بولی۔

''ابھی باہر گئے ہیں بس آ ہی رہے ہوں گے۔''

''تت...... تم یہاں......؟'' الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

''گرو ایلش نے مجھے تمہاری تکلیف کے سلسلے میں بلایا ہے۔ شاید میں ایک آدھ دن یہاں رہوں گا۔ گرو ایلش کے سامنے ہم دونوں بالکل اجنبی رہیں گے ورنہ سخت مشکل ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم؟''

سون نے سہمے ہوئے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نگاہ میرے زخمی پاؤں پر سے ہوتی ہوئی زخمی بازو پر آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ان ملازماؤں میں سے ایک اندر آ گئی جنہوں نے رکوع کے انداز میں جھک کر گرو ایلش کو تعظیم پیش کی تھی۔ وہ شاید کسی کام سے کمرے سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد مترجم بھی میرا باکس اٹھائے ہوئے آ گیا۔

میں نے مترجم سے کہا۔ ''گرو صاحب کو اطلاع کرو۔ مس جاگ گئی ہیں۔''

دو منٹ بعد گرو ایلش بھی کمرے میں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر سون نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ تاہم ایلش نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ مقامی زبان میں بڑی لگاوٹ کے ساتھ سون سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے بعد میرے کانوں میں قریب المرگ چنکی کے الفاظ گونجنے لگے تھے۔ اس نے کہا تھا ''گرو ایلش! سون پر بری نگاہ رکھتا ہے۔ وہ سازش کے ساتھ سون کو مٹھ میں لے کر گیا ہے۔ وہاں

سون ہر وقت اس کی دسترس میں ہے۔''

یہ ایک اتفاق تھا کہ سون کے بارے میں گروایش کے خاص قسم کے جذبات اتنی وضاحت سے میرے سامنے آ گئے تھے۔ سون کے بارے میں اس کی غیر معمولی پریشانی نظر انداز کرنے والی چیز نہیں تھی۔ وہ سون کی طرف دیکھتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک فدا ہو جانے والی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ گروایش، مترجم اور ملازمہ کے سامنے ہی میں نے سون کا معائنہ کیا۔ میں نے کوشش کی کہ میرا ہاتھ کم سے کم سون کے بدن سے چھوئے۔ پھر بھی جتنی بار اس کے جسم سے میرے ہاتھ کا تصادم ہوا، سینے میں اور پورے جسم میں شعلے سے لپکتے محسوس ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ اس روز سون کا معائنہ کر کے اور اس کی دوا وغیرہ تجویز کر کے مجھے کوپٹا واپس آ جانا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ گروایش نے مجھے مجبور کیا کہ میں تین چار دن تک مٹھ میں ہی قیام کروں۔ بلکہ اس کی خواہش تھی کہ جب تک سون کی حالت تسلی بخش نہیں ہوتی میں یہاں سے نہ جاؤں ہاں میرے کہنے پر چوہدری جبار مٹھ سے واپس جا چکا تھا۔

مٹھ میں میرا تیسرا دن تھا۔ گروایش نے مجھے ہر نگاہ سے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق گرو کے چار قریبی افراد کے علاوہ کسی کو میری مٹھ میں موجودگی کا علم نہیں تھا۔ گروایش نے دو دن پہلے کی شام مٹھ کی ایک اندرونی راہداری میں ٹہلتے ہوئے مجھے بھی خصوصی تاکید کی تھی کہ میری یہاں موجودگی ایک راز کی حیثیت رکھتی ہے اور اسے راز ہی رہنا چاہئے۔

سون سے پچھلے تین دنوں میں میری کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ ایک دو ملاقاتیں ایسی بھی تھیں جن میں میرے اور سون کے سوا کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ پتہ نہیں کہ میرے جیسے دھیمے شخص کے اندر اتنا حوصلہ کہاں سے آ گیا تھا۔ میں نے سون سے صاف کہہ ڈالا تھا کہ وہ اپنی زندگی کو جس ڈگر پر چلا رہی ہے، میں اس سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ میں اسے یہاں سے نکال کر رہوں گا۔

میرے دوٹوک الفاظ سن کر سون کا رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں لرزنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے فوری طور پر اسے دوا کھلائی تھی اور انجکشن وغیرہ دیا تھا۔ میں نے سون کے لیے کچھ دوائیں شہر سے بھی منگوائی تھیں۔ امید تھی کہ کل تک یہ دوائیں یہاں پہنچ جائیں گی۔

میں سون کو اس ''ٹرانس'' سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جس نے اس کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا تھا۔ بڑے دھیمے انداز میں لیکن مسلسل میں اسے دلائل سے قائل کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ پتہ نہیں کہ میرے پاس اتنے دلائل کہاں سے آ گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ میرے اندر آگہی کا چشمہ سا پھوٹ پڑا ہے۔

یہ چوتھے دن کی بات ہے۔ رات کے ایک بجے مجھے سون کو ایک خوراک کھلانا تھی۔ مقررہ وقت پر میں دوا اور پانی کا پیالہ لیے اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ میرے قدموں کی مدھم چاپ نے اسے غنودگی سے جگا دیا۔ اس کے قریب ہی نگران ملازمہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی اور اس کی بوجھل سانس کمرے میں گونج رہی تھی۔ چاند ایک تنگ روزن میں سے اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ دور اوپر پگوڈا کی گھنٹیاں شب کے بھیگے ہوئے سناٹے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ ایک ڈھول بج رہا تھا۔

سون نے خمار آلود آواز میں کہا۔ ''کیوں اپنے آپ کو میرے لیے ہلکان کر رہے ہو۔ میں وہ نہیں ہوں جس کی تمہیں تلاش ہے۔''

''تم وہی ہو اور جہاں تک خود کو ہلکان کرنے کی بات ہے تو تم بھی ایسا کر چکی ہو۔ تمہیں یاد ہوگا میں ہوٹل نیوٹرو کیڈرو میں بیمار ہو گیا تھا۔ ایک نرس کی حیثیت سے تم نے مسلسل کئی گھنٹے تک میری تیمارداری کی تھی۔ رات تک تم تھک کر چور ہو گئی تھیں۔''

''میں تم سے کہہ چکی ہوں۔ فارگارڈ سیک پرانی باتیں مت کرو۔ وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔''

''یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔'' میں نے ڈاکٹر کی حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہولے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ دو دن پہلے میں نے ایسا کیا تھا تو وہ بدک گئی تھی۔ اس نے سر گھما کر میرا ہاتھ ہٹا دیا تھا۔ مگر اس مرتبہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے کہا۔ ''سون! کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں کہ قدرت ہمیں ملا رہی ہے۔ ہمارے ملنے سے وہ کوئی تبدیلی چاہتی ہے۔ ذرا سوچو! وہی گروایش ہے جسے میرا اور میرے دوست کا بستی میں رہنا گوارا نہیں تھا۔ اب وہی گروایش اپنی بد باطنی کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ صرف مجھے مٹھ کے اندر لایا ہے بلکہ اس کی آشیرباد سے میں رات کے اس پہر یہاں تمہارے کمرے میں موجود ہوں۔''

"تم ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہو جو مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ گرو ایش ایسے نہیں ہیں۔"

"تم بھی جب اسے گرو کہتی ہو تو مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ گرو تو کجا عام بھکشو بھی نہیں ہے۔ میں نے اسے پر تکلف کھانے کھاتے دیکھا ہے۔ ریشمی بستر پر سوتے دیکھا ہے۔ بدھ کا سچا بھکشو تو عورت کو اپنے پاس بھی نہیں بھٹکنے دیتا جب کہ وہ ملازماؤں سے اپنے سر کی مالش کراتا ہے۔"

سون نے اپنے خوبصورت ہونٹ مضبوطی سے بند کر لیے اس کی آنکھیں بھی مضبوطی سے بند تھیں۔ اس کے اندر جیسے ایک کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ یہ کشمکش بڑھ رہی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ سکون بخش دوا کی وجہ سے اس پر نیم خوابی کی سی کیفیت تھی۔ میرا ہاتھ مسلسل اس کی گرم پیشانی پر دھرا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ "پلیز یہاں سے چلے جاؤ...... تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چلے جاؤ گے...... پلیز چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نہیں چھوڑوں گا۔"

"مجھے بڑی تکلیف دے رہے ہو ٹورسٹ! تم میری بات کیوں نہیں مانتے ہو۔" اس کی خوابیدہ آواز ابھری۔

ایک مدت بعد اس روز اس نے مجھے پھر ٹورسٹ کہا تھا۔ میرے اندر امید کی ایک اور کرن روشن ہو گئی۔ اس کی پیشانی پر مجھے اپنا ہاتھ کچھ آرام دہ محسوس ہونے لگا۔

وہ خاموش لیٹی رہی۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ خوابیدہ ملازمہ کی بوجھل سانسیں کمرے میں گونجتی رہیں۔ اوپر بلندی پر پگوڈا کی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ ہوا درختوں میں سرسراتی رہی۔

کچھ دیر بعد میں نے دیکھا سون کی خوبصورت آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ساکت نظروں سے میرے پلاستر والے ہاتھ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "یہ کیا لکھ رکھا ہے تم نے؟" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ اس کا اشارہ پلاستر پر لکھے شعروں کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ اقبال کا شعر ہے۔ شاعر مشرق اقبال کو تو تم بھی جانتی ہونا۔" اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔

میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے کہا تھا ناں کہ مسٹر اقبال بہت بڑا پوئٹ

ہے اسی اقبال کا یہ مشہور شعر ہے۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی...... یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔ اس شعر کا مطلب انسانی زندگی میں عمل اور حرکت کی کلیدی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔ شاعر مشرق کہتا ہے کہ زندگی نام ہی کوشش اور عمل کا ہے۔ اس سے زندگی کے رخ متعین ہوتے ہیں۔ تکلیفوں اور خوشیوں میں سے حصہ ملتا ہے۔"

وہ غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے بڑی نرمی سے اس کے بالوں کو سہلایا۔ ایک آوارہ لٹ کو آہستگی سے اس کے کان کے پیچھے اڑسا...... "سون! بے عمل رہنے سے زندگی میں کچھ سکون تو شاید آ جاتا ہو لیکن وہ زندگی نہیں رہتی۔ جیسے تصور کے بغیر ایک خالی فریم...... جیسے مکینوں کے بغیر ایک ذیشان عمارت، نہ کوئی مسکراہٹ نہ کوئی آنسو، بس ایک اکتا دینے والی سکون آمیز اداسی۔"

میں بولتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ اچانک کرسی پر نیم دراز ملازمہ نے کسمسا کر کروٹ بدلنے کی کوشش کی۔ سون ٹھٹک کر رہ گئی۔ میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ کمرے کا نیم روشن گوشہ تھا۔ ملازمہ نے سیدھا ہو کر ایک خوابیدہ نگاہ سون پر ڈالی پھر فوراً ہی دوبارہ کرسی پر نیچے کو کھسک گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑ سکی تھی۔ جب ایک بار پھر اس کی بوجھل سانسیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ میں احتیاط سے سون کے قریب پہنچ گیا۔ سون کی نگاہ پلاستر کی باریک تحریر پر پڑی۔ وہ بولی "یہ کیا لکھا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ ایک نظم ہے۔ بہت دن پہلے کسی نے مجھے سنائی تھی۔"

"اقبال کی ہے؟"

"نہیں یہ کسی لوک تھائی شاعر کی ہے۔"

"کیا ہے؟" وہ خمار آلود آواز میں بولی۔

"یہ اس نظم کا ترجمہ ہے۔ جو ایک پیاری سی لڑکی نے بڑے پیارے انداز میں مجھے بتایا تھا۔ یہ گیت کی سی طرز ہے۔ ایک حیران پرندہ پام کے بلند درخت پر بیٹھ کر دور تک دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے، یہ ہوا کہاں سے چلتی ہے۔ یہ سورج کی سرخ گیند کہاں اوجھل ہوتی ہے؟ وہ اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ جس طرح یہ ساری چیزیں اوجھل ہونے کے بعد پلٹ کر آتی ہیں۔ اس کا ساتھی بھی جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا ایک دن واپس آ جائے گا۔"

بولتے ہوئے میرا لہجہ بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں میں نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ میری انگلیاں سون کے ریشمی بالوں پر دھری تھیں۔ میرا دل ڈر رہا تھا۔ تاہم سون میری انگلیوں کی اس جرات کو مسلسل نظر انداز کیے ہوئے تھی۔

کچھ دیر کمرے میں گمبھیر خاموشی رہی۔ پھر سون نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بددیانتی ہے۔ گرو جی نے تمہیں یہاں میرے علاج کے لیے بلایا ہے۔ لیکن تم...... کسی اور طرف جا رہے ہو۔''

''میں بالکل صحیح سمت میں جا رہا ہوں سون!'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہارا علاج یہی ہے کہ تمہیں اس شدید حبس اور گھٹن سے نکالا جائے۔ میں کہتا ہوں سون! تمہاری بیماری جو گمبھیر نظر آتی ہے۔ درحقیقت بہت معمولی سی ہے۔ اس بیماری کی وجہ وہ جبر ہے جو شادی کے موقع پر چنکی نے تم سے کیا تھا اور اس کے علاوہ وہ جبر ہے جو تم خود اپنے آپ پر اس مٹھ میں بند رہ کر کر رہی ہو۔ اپنی آرزوؤں اور خوشیوں کو تم نے ایک اندھے کنویں میں ڈال کر اس پر مٹی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ تمہاری روح ایک دہکتے ہوئے پنجرے میں بند ہو کر پھڑپھڑا رہی ہے۔ تم اپنی فطرت کے خلاف جا رہی ہو۔ تم انسانی فطرت کے خلاف چل رہی ہو۔ روحانیت کی راہ پر چلنے کے لیے پیر کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم ایسے نوسر بازوں کے چنگل میں ہو جنہوں نے تمہیں زمین اور آسمان کے درمیان لٹکا دیا ہے۔ تمہارا علاج تمہاری آزادی ہے۔ تمہاری زندگی کا فطری بہاؤ ہے۔ وہ فطری بہاؤ جو حیات کو گلنے سڑنے سے بچا کر تر و تازہ بناتا ہے۔'' وہ آنکھیں بند کیے خاموش لیٹی رہی۔ گیس لیپ کی دودھیا روشنی میں اس کا حسین چہرہ ''ماورائی'' لگ رہا تھا۔

میں کچھ اور انتظار کرتا رہا اور پھر ہولے سے کہا۔ ''تمہیں یاد ہے بنکاک میں ایسے موقعوں پر تم کیا کہا کرتی تھیں۔ تم کہا کرتی تھیں...... ٹورسٹ! تھوڑا سا پانی پلاؤ۔ تمہارا فلسفہ میرے حلق میں اٹک گیا ہے۔''

سون کی حسین جبیں پر شکن نمودار ہوئی۔ ''پلیز! وہ باتیں مت دہراؤ۔ وہ باب بند ہو چکا ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔''

''نہیں سون! ایسا نہیں ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں۔''

اچانک ہم دونوں ٹھٹک گئے۔ کچھ فاصلے پر آہٹ ابھری اور پھر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دوسری نگران ملازمہ کمرے کی طرف آ رہی تھی۔ میں پیچھے ہٹ کر اپنے میڈیکل

باکس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

❁❁❁

مٹھ میں میرا قیام طویل ہو گیا تھا۔ میں خود بھی جلد واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ قدرتی طور پر میرے رکنے کے اسباب پیدا ہو رہے تھے۔ سون کی حالت بہتر تھی وہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ وہ سر چکرانے کی شکایت کرتی تھی۔ ایسے میں اس کا رنگ بالکل زرد ہو جاتا تھا۔ گاہے گاہے اسے بخار کی شکایت بھی ہو جاتی تھی۔ وہ کمرے میں اپنا زیادہ وقت مختلف سوتروں کے مطالعے اور مراقبے وغیرہ میں گزارتی تھی۔ مٹھ میں آ کر مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق سون نے پورے دو ماہ تک تین لقمے والا بھرت رکھا تھا۔ یقیناً اس بھرت کے دوران میں وہ شدید ذہنی کشمکش اور تناؤ کا شکار بھی رہی تھی۔ اس جسمانی اور ذہنی دباؤ نے مل کر اسے بیمار کیا تھا۔ میں نہایت راز داری سے مٹھ میں موجود تھا اور اس کا علاج کر رہا تھا اس دوران میں چوہدری جبار ایک بار پھر آ کر میری خبر گیری کر چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اسپتال میں آج کل پھر مریض کثرت سے آ رہے ہیں۔ اب زیادہ تر کیس ملیریا کے آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہربنس ٹھیک ہو کر اپنی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا اور شب و روز اپنے کام میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر حمزہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے والوں میں شامل تھا۔

ابھی تک چوہدری جبار کو سون کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ممکن ہے کہ اسے اس قسم کا کوئی شک ہو۔ لیکن یہ شک ایک بار بھی اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ اسے بس اتنا ہی معلوم تھا کہ میں مٹھ کی کسی اہم راہبہ کے علاج معالجے میں مصروف ہوں۔ اس کی خواہش تھی کہ میں جلد از جلد یہاں سے فارغ ہو جاؤں اور جو کچھ شیلن کے لیے کرنا چاہتا ہوں کر کے واپسی کے لیے رخت سفر باندھوں۔ ایک رات مٹھ میں قیام کرنے کے بعد چوہدری جبار جتنی خاموشی سے یہاں لایا گیا تھا۔ اتنی ہی خاموشی سے واپس کوٹا پہنچا دیا گیا۔

مٹھ کے شب و روز بڑے انوکھے تھے۔ مٹھ کے اکثر طلبہ طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہو جاتے تھے۔ وہ نہاتے تھے اور مرد بھکشو اپنے منڈے سروں پر مالش وغیرہ کرتے تھے۔ اس کے بعد طلبہ خود ہی مٹھ کے کمروں اور عبادت گاہوں کی صفائی کا کام انجام دیتے تھے۔ بعد ازاں وہ اپنے استعمال کے تھال، کشکول اور دیگر برتن صاف کرتے تھے۔ ہلکا پھلکا

ناشتہ مٹھ کے اندر ہی تیار کیا جاتا تھا اور کھایا جاتا تھا۔ بعد میں گیان دھیان کی کلاس ہوتی تھی اور سوتر وغیرہ پڑھے جاتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد طلبہ ٹولیوں کی صورت میں مٹھ کے احاطے میں جمع ہوتے تھے۔ کچھ ٹولیاں بھیک مانگنے کے لیے قریبی بستیوں کی طرف چلی جاتی تھیں۔ کچھ طلبہ مٹھ کے اردگرد کی ڈھلوانوں سے پھول چنتے تھے۔ اور انہیں بدھ کے مجسموں اور دیگر یادگاروں پر نچھاور کرتے تھے۔ دوپہر سے پہلے ہی بھیک مانگنے والی ٹولیاں واپس آ جاتی تھیں۔ شاگرد اپنے اساتذہ کے ہاتھ پاؤں دھلاتے تھے اور انہیں کھانا کھلاتے تھے۔ بعد میں وہ خود کھاتے تھے۔ استادوں اور گروؤں کا کھانا خاصا پر تکلیف ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد راہباؤں کی ٹولیاں برتن دھوتی تھیں اور راہب پینے کے لیے پانی کو صاف کرتے اور چھانتے تھے۔ بھکشو ٹھوس غذا صرف دوپہر تک کھاتے تھے۔ اس کے بعد رات تک وہ پینے والی چیزیں مثلاً دودھ، شربت وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد مذہبی کتابوں کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ شام کے وقت سینئر طلبہ ایک طویل قطار کی صورت میں مٹھ سے نکلتے تھے اور پگوڈا میں حاضری کے لیے روانہ ہو جاتے تھے۔ پگوڈا سے ان کی واپسی رات نو دس بجے کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ گروایش بھی اس دوران پگوڈا میں ہی رہتا تھا۔

سون آج کل پگوڈا نہیں جاتی تھی۔ شام سے رات دس بجے تک کا وقت میرے لیے بہترین ہوتا تھا۔ اس دوران میں، میں موقع ملنے پر سون سے بات چیت کر لیتا تھا۔ ہوسنگ بھی مٹھ میں ہی موجود تھی اور میں نے ایک بار اسے کھڑکی میں سے دیکھا بھی تھا۔ لیکن اس سے رابطہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ گروایش نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ میں کسی صورت کسی غیر متعلقہ شخص کے سامنے نہیں آؤں گا۔ سون کی گہری سہیلی ہونے کے باوجود ہوسنگ ایک بار بھی اس کی خبر گیری کے لیے نہیں آئی تھی۔ یقیناً یہ گروایش کی پابندی کی وجہ سے تھا۔ گروایش بظاہر ٹھنڈے مزاج کا شخص تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ اندر سے آتش فشاں ہے۔ اس کی آنکھوں کی تہ میں کوئی بجلی سی لپکتی تھی۔ یہ آنکھیں جیسے خاموشی کی زبان میں مجھے سمجھاتی تھیں۔ ڈاکٹر! میں تمہیں ایک مجبوری کے تحت یہاں لایا ہوں لیکن اپنے آدرشوں کی وجہ سے تم اب بھی ہمارے بدترین دشمن ہو۔ تم ان لوگوں میں سے ہو جو یہاں ہمارے اختیار اور اقتدار کو چیلنج کرنے کی حماقت کرتے ہیں۔ اگر تم نے کسی بھی حوالے سے اس حماقت کو مزید آگے بڑھایا تو اپنی موت کو آواز دو گے۔

ایک رات میری ایک دیرینہ خواہش بالکل غیر متوقع طور پر پوری ہو گئی۔ اپنے مترجم کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی بہت اہم شخصیت مٹھ میں موجود ہے اور گروایش گرو کشپال وغیرہ اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہیں۔ میرے مترجم کا نام بے حد مشکل تھا۔ میں نے کبھی اس کا نام لینے کی کوشش نہیں کی۔ بس میں اسے طوطا چشم کے نام سے یاد رکھتا تھا۔ شام کے وقت خلاف معمول بھکشوؤں کی طویل قطار بھی پگوڈا کی طرف روانہ نہیں ہوئی۔ شام سے تھوڑی دیر بعد طوطا چشم نے اپنے کان میں انگلی ڈال کر کھجاتے ہوئے مجھ پر انکشاف کیا کہ بڑے گرو محترم واشو جت مٹھ میں موجود ہیں۔ گروایش نے انہیں آپ کے بارے میں بتا رکھا ہے۔

طوطا چشم کی بات درست نکلی۔ رات قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ مٹھ کے کمروں میں مذہبی دعاؤں کی ہلکی سی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور پلاستر کے اندر بازو پر ہونے والی کھجلی کو برداشت کر رہا تھا۔ اچانک گروایش نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا ہیجان تھا۔ وہ بولا۔ ''ڈاکٹر! بڑے گرو تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''

میں دھڑکتے دل کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد میں گروایش کے آرام دہ سجے سجائے کمرے میں بڑے گرو کے روبرو موجود تھا۔ بڑے گرو کی عمر ستر اور اسی برس کے درمیان محسوس ہو رہی تھی۔ جسم چھریرا تھا۔ پلکیں بہت بھاری تھیں۔ اتنی بھاری کہ آنکھیں ایک لکیر کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرے کی ہر جھری پر تجربے اور گہری سنجیدگی کی تحریر تھی۔ چہرے سے ایک طرح کی نقاہت و ناتوانی جھلکتی تھی۔ پہلی نظر میں مجھے بڑا گرو اب تک ملنے والے تمام گروؤں سے مختلف نظر آیا۔

کمرے میں خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ چراغوں میں کوئی خاص قسم کا خوشبودار تیل جل رہا تھا۔ مکمل خاموشی تھی۔ بڑے گرو صاحب دو گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے۔ خاموشی میں بس ان کے مالا کے دانوں کی صدا ہی سنائی دے رہی تھی۔ بڑا مرعوب کن ماحول تھا۔ میں نے تعظیم پیش کی اور جوتی اتار کر بڑے گرو کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ بڑے گرو نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں کی باریک لکیروں کا رخ میری طرف تھا۔ پھر انہوں نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بڑے گرو کے عقب میں ان کا خادم خاص چوکس کھڑا تھا۔ اس نے بھی ہاتھ کی جنبش سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں دو زانو بیٹھ گیا۔ بڑے گرو مجھے دیکھتے جا رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا

جیسے ان کی آنکھوں سے غیر مرئی لہریں نکل کر میرے جسم میں سرایت کر رہی ہیں...... ایسی تقدیس اور سکوت کا احساس مجھے یہاں آ کر پہلی بار ہوا تھا۔ بڑے گرو نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ بس بڑے گرو اور گرو ایش میں بات ہوتی رہی۔ بڑے گرو کا لہجہ نحیف اور آواز کمزور تھی۔ گرو ایش بات غور سے سننے کے لیے بڑے گرو کی طرف جھکا ہوا تھا اور مودب انداز میں اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ یہ مقامی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آئی۔

کچھ دیر بعد گرو ایش اٹھ کر باہر گیا تو بڑے گرو نے ایک بار پھر پوری توجہ سے میری جانب دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے چند فقرے ادا کیے۔ ان کے عقب میں کھڑے خادم خاص نے میرے لیے ان فقروں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ''بیٹا! تمہاری خدمات قابل قدر ہیں۔ میں جانتا ہوں تم دونوں دوستوں کی وجہ سے یہاں بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ اور مزید پہنچ سکتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تمہاری قدر نہیں پہچانیں گے اور نہ تمہیں یہاں رہنے دیں گے۔ میں سب جانتا ہوں بیٹا کہ ان میں سے کون بدھا کا پجاری ہے اور کون اپنے نفس کا...... میں سب جانتا ہوں۔ لیکن...... میں دعا کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے اردگرد دن رات بدھا کے احکامات ٹوٹتے دیکھ رہا ہوں اور مجبور ہوں۔ سارے برے نہیں ہیں لیکن اکثریت بروں کی ہے اور یہی اکثریت میرا خون جلاتی ہے...... خوشی صرف اس بات کی ہے کہ ایسا رہے گا نہیں۔ جلد یا بدیر یہ ''نام کے پجاری، مکافات کا شکار ہوں گے یہ اور بات ہے کہ میں شاید دیکھ نہ سکوں گا۔''

بڑے گرو نے اس سے ملتی جلتی کچھ اور باتیں بھی کیں وہ رک رک کر بولتے تھے اور ان کی سانس پھول جاتی تھی۔ میں نے مترجم کے ذریعے پوچھا۔ ''محترم گرو جی! ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

''تمہارا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' بڑے گرو نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بلکہ یہ میری خواہش ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

میں بڑے گرو کے سامنے شیلن کے حوالے سے درخواست کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی میں نے شیلن کا نام لے کر چند لفظ ہی بولے تھے کہ قدموں کی چاپ ابھری اور گرو ایش اپنے ایک خادم کے ساتھ اندر آ گیا۔ میں خاموش ہو گیا۔ بڑے گرو ایش اور اس کے خادم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مجھے صاف اندازہ ہوا کہ اب بڑے گرو شیلن کے حوالے سے بات نہیں کرنا چاہتے۔

بڑے گرو جی سے میری ملاقات گو مختصر رہی لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی اس ملاقات نے مجھے توانائی اور حوصلے سے بھر دیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بڑے گرو نے بہ زبان خاموشی مجھ سے کہا ہے کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں کر گزروں۔ جو ارادہ میرے ذہن میں ہے اسے عمل کی شکل میں ڈھال دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب میرے تصورات ہی تھے لیکن ان میں بڑی قوت تھی۔ ایک اور عجیب بات جو گرو جی سے ملاقات کے بعد میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ وہ گرو جی کے خادم خاص کی صورت اور آواز تھی۔ پتہ نہیں کیوں، گرو جی سے ملاقات کے دوران میں بھی یہ بات بار بار میرے ذہن میں آتی رہی تھی کہ میں نے یہ صورت کہیں دیکھی ہے اور یہ آواز کہیں سنی ہے۔ ذہن کسی چیز پر گرفت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ناکام ہو جاتا تھا۔ بڑے گرو کا یہ خادم خاص بھی بڑے گرو ہی کی طرح نہایت نیک صورت اور سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ مسلسل ریاضت اور فاقہ کشی نے اس کے چہرے پر ایک مخصوص اجالے کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی تھا۔ بڑے گرو سے میری یہ مختصر ملاقات، طویل ترین ملاقاتوں سے بڑھ کر اثر انگیز ثابت ہوئی تھی۔

ایک دن شام کے وقت جب گرو ایش اپنے طلبہ کے ساتھ پگوڈا میں تھا۔ ایک ملازمہ کے پیٹ میں شدید درد ہونے لگا۔ یہ ان دو نگران ملازماؤں میں سے ایک تھی جو سون کی خدمت پر مامور تھیں۔ اس ملازمہ کو ایک دن پہلے درد ہوا تھا اور میں نے اس کا معائنہ کیا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ ماضی قریب میں اس لڑکی کا ''ابارشن'' ہوا تھا۔ غالباً یہ ابارشن گرو ایش کی دواؤں کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ کم از کم ملازمہ کی گفتگو سے تو میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ مٹھ میں اس قسم کے واقعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں اخلاقیات کی صورت حال کیا ہے۔ سب لوگ برے نہیں تھے لیکن چند مچھلیوں نے تالاب کو گندہ کر رکھا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ ہونے والے سلوک کا ذمے دار یقیناً مٹھ کے اندر کا ہی کوئی شخص تھا۔ اور وہ گرو ایش بھی ہو سکتا تھا۔

لڑکی کی تکلیف بڑھ گئی تو میں نے سوچا کہ اسے ''بیسکو پان'' کا انجکشن دے دوں۔ میں نے شہر سے دو تین انجکشن منگوائے تھے لیکن یہ اتفاقاً گرو ایش کی الماری میں تھے۔ ایش پگوڈا گیا ہوا تھا۔ میں طوطا چشم مترجم کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ بھی نہیں ملا۔ مجبوراً میں گرو ایش کے کمرے میں داخل ہوا۔ الماری مقفل تھی لیکن گرو ایش کے ان

دھلے کپڑوں میں سے مجھے الماری کی چابی مل گئی۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا۔ میں کچھ دیر تک تذبذب میں رہا کہ الماری کھولوں یا نہیں۔ ایک قریبی کمرے سے نوجوان ملازمہ کی دبی دبی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ آخر میں نے الماری کھول کر انجکشن نکال لیا۔ الماری کے اندر ایک چھوٹا خانہ اور موجود تھا۔ اس کی چھوٹی چابی بھی ''کی رنگ'' میں موجود تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میرے تجسس نے ایک دم مجھے جکڑ لیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ چھوٹا خانہ کھولا۔ یہاں گرو ایش کے ذاتی استعمال کی کچھ اشیا تھیں۔ اس کے علاوہ ایک اسٹل کیمرہ تھا۔ کاغذ میں لپٹا ہوا ہنٹر بیف کا ایک بڑا ٹکڑا تھا۔ مشروب کی دو بوتلیں تھیں جنہیں دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ یہ مقامی طور پر تیار کیا گیا کوئی کیف آور مشروب ہے۔ ایک لفافے میں کچھ فوٹو گراف بھی تھے۔ میں نے یہ فوٹو گراف دیکھے اور اندیشے ٹھوس حقیقتوں میں ڈھلنے لگے۔ یہ بیس پچیس فوٹو گراف تھے اور سارے مٹھ کی طالبات کے تھے۔ پتہ چلتا تھا کہ یہ تصویریں طالبات کی بے خبری میں اتاری گئی ہیں۔ کوئی کھانا کھا رہی تھی، کوئی پھول چن رہی تھی۔ کوئی سوتر پڑھ رہی تھی۔ میں نے گنتی کی ان میں پوری آٹھ تصاویر صرف سون کی تھیں۔ ان تمام تصویروں میں سون سوئی ہوئی تھی۔ ایک دو تصویریں کلوز اپ کی شکل میں تھیں۔ اور سون کے دلکش نقوش کو نمایاں کرتی تھیں۔

میں نے لرزتے ہاتھوں سے یہ ساری تصویریں واپس وہیں پر رکھ دیں۔ اب الماری سے انجکشن لینا بھی مناسب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے انجکشن بھی واپس رکھ دیا اور الماری کو پہلے کی طرح مقفل کر کے چابی گرو ایش کے ''ان دھلے'' کپڑوں میں واپس رکھ دی۔ خوش قسمتی سے ابھی تک کوئی اس کمرے کی جانب نہیں آیا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکل آیا اور ملازمہ کے لیے کوئی متبادل دوا ڈھونڈنے میں لگ گیا۔

دو روز کے افاقے کے بعد سون کو پھر ہلکا سا بخار ہو گیا۔ سون کی ناسازئ طبع گرو ایش کو ایک دم بے چین کر دیتی تھی۔ یہ بے چینی کچھ اسی نوعیت کی تھی جیسی کسی پیارے پالتو جانور کی بیماری پر اس کا مالک محسوس کرتا ہے۔ اب یہ بات میں بہت وضاحت سے محسوس کر چکا تھا کہ سون کے حوالے سے ایش کی نیت کبھی بھی اچھی نہیں رہی۔ ناریل کے پیڑ سے حاصل کیا جانے والا نشہ علاقے میں عام استعمال ہوتا تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ گرو ایش گرو کشپال اور ان کے کچھ قریبی ساتھی یہ نشہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ مختلف خرافات میں ملوث نظر آتے تھے۔ درحقیقت ان چار پانچ افراد نے مٹھ اور

پگوڈا کے سارے معاملات کا کنٹرول سنبھال رکھا تھا۔ بڑے گرو واشو جت کی حیثیت بس علامتی سربراہ کی رہ گئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ سون کی تکلیف بظاہر سنگین نظر آنے کے باوجود سنگین نہیں ہے۔ بس یہ ڈپریشن کی بگڑی ہوئی صورت تھی۔ اسباب دور ہونے کے ساتھ ہی تکلیف کو بھی اڑن چھو ہو جانا تھا۔ سون کا بخار بھی موسمی تھا۔ بہر حال گرو ایش کو یہ سب بتانا ضروری نہیں تھا۔

ایک دن گرو ایش کا موڈ اچھا دیکھ کر میں نے اس سے شیلن کی بات چھیڑ دی۔ میں نے کہا۔ ''گرو صاحب! آپ نے خود بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ مقامی اور دیسی طریقے کے مطابق تمام بیماریوں کا علاج ممکن نہیں۔ پیچیدگیوں کی صورت میں ہمیں کوئی دوسرا طریقہ علاج اپنانا پڑتا ہے۔ شیلن کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کی حالت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت وہ بظاہر ٹھیک نظر آنے لگے لیکن......''

گرو ایش نے میری بات کاٹی اور مترجم کے ذریعے بولا۔ ''جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔ اب یہ ''مت'' کی عزت اور آن کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اگر بدھا کو اس کی زندگی منظور ہو گی تو یہیں پر اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی سبب پیدا ہو جائے گا۔ میں اس سلسلے میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتا۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا اور نہ مانگوں گا۔ میں آپ سے ہاتھ باندھ کر درخواست کرتا ہوں کہ اس بارے میں انسانی ہمدردی کے ناطے غور کریں۔ آپ ہم پر بھروسہ نہ کریں۔ آپ کسی بھی بڑے ڈاکٹر کو بلا کر بچے کا معائنہ کرا لیں۔ وہی بات سامنے آئے گی جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''مجھے بہت افسوس ہے ڈاکٹر! میں تمہاری یہ بات نہیں مان سکتا۔ اس کے بدلے کچھ اور منوانا چاہو تو منوا لو۔'' اندرونی ہیجان کے سبب گرو کے سر کی رگیں مزید ابھر آئی تھیں۔

میں نے کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔

دو تین دن مزید گزر گئے۔ میں نے ابھی تک سون کو الماری سے ملنے والی تصویروں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میرے خیال میں بتانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ بہر حال میرے لئے اب یہ بات تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ سون کے حوالے سے گرو ایش کی نیت اچھی نہیں ہے اور مستقبل قریب میں سون گرو ایش کا ایک نیا روپ دیکھنے والی تھی۔ گزرنے والے دن کے ساتھ میرے اندر یہ خواہش شدید ہو رہی تھی کہ میں کسی طرح

سون کو مٹھ کی اندھیری کوٹھڑیوں سے نکالوں۔ وہ اس ماحول سے ذرا دور رہ کر سوچتی تو شاید میری باتوں کو زیادہ اچھے طریقے سے سمجھ سکتی۔ یوں لگتا تھا کہ اس تنگ گرد و پیش کی طرح سون کا ذہن بھی تنگ ہو گیا ہے۔ موثر سے موثر دلیل بھی اس کی سماعت تک محدود رہتی ہے۔ ایک دن سون پھر سر میں درد کی شکایت کر رہی تھی۔ میں نے گروایش سے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ مکمل علاج کے لیے سون کے ایک دو ٹیسٹ ہونا ضروری ہیں۔ ایکسرے وغیرہ بھی ہونا چاہئے۔ اگر ممکن ہو تو آپ سون کو کسی قریبی قصبے یا شہر تک پہنچانے کا انتظام کر دیں۔''

پہلے تو ایش کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار ابھرے، لیکن پھر گفت و شنید کے بعد وہ نیم رضا مند نظر آنے لگا۔ اس طویل گفتگو کا نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتا تھا۔ گروایش، سون کو اتنی رعایت دینے پر آمادہ ہو گیا کہ ہم اسے راز داری کے ساتھ کوپٹا کے مقامی اسپتال میں لے جائیں اور زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹے میں واپس آ جائیں۔

یہی غنیمت تھا۔ پروگرام طے ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق ایک نگران ملازمہ کے علاوہ گروایش کے ایک ذاتی محافظ کو گھوڑا گاڑی میں شام کے بعد ہمارے ساتھ کوپٹا روانہ ہونا تھا اس سارے کام میں راز داری پہلی شرط تھی۔

گروایش اور اس کے ساتھیوں کی منافقت عیاں تھی۔ ایک طرف گروایش ایک معصوم بچے کو دیسی طریقہ علاج سے مارنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا، دوسری طرف وہ سون کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ہر مشکل مطالبہ بھی مان رہا تھا۔ سون کے لیے وہ کسی طور دیسی طریقہ علاج کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ علاج ستر فیصد صرف شعبدے بازی پر مبنی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جب بھی گروایش کی اپنی جان پر بنے گی تو وہ بھی پردہ پوش ہو کر کسی ڈاکٹر یا معالج کی علاج گاہ میں داخل ہوگا۔

اگلے روز ایک کٹھن سفر کے بعد رات دس بجے کے لگ بھگ ہم کوپٹا کے اسپتال پہنچ گئے۔ مطلع ابر آلود تھا۔ گاہے گاہے پام کے بلند درختوں کے اوپر بجلی چمکتی تھی اور حد نگاہ تک گھنا سبزہ روشن ہو جاتا تھا۔

ڈاکٹر ہربنس کو اپنی آمد کی اطلاع ہم نے پہلے ہی پہنچا دی تھی۔ اسپتال کی چھت پر ایک چھوٹے وارڈ کو ڈاکٹر ہربنس نے چار چھوٹے کمروں کی شکل دے رکھی تھی۔ ان میں سے ہی ایک کمرہ سون کو دیا گیا تھا۔ سون اپنی نگران ملازمہ کے ساتھ کمرے میں چلی گئی۔ گرو کا

ذاتی محافظ ساتھ والے کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ علاقے میں ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا حفاظتی اقدام کے طور پر ہم نے ''ڈاراپرم'' کی گولیاں مٹھ سے روانہ ہونے سے پہلے استعمال کر لی تھیں۔ ڈاراپرم اور نیواکوئین کی خاصی مقدار ہم نے بنکاک سے ہی خرید کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھی ان میں سے دو درجن گولیاں میں نے لکشون گاؤں میں فربہ اندام کمپاؤنڈر لی کو دے دی تھیں۔ بعد میں لکشون کے مکھیا لان کون نے بھی پانچ چھ درجن گولیاں بلا قیمت حاصل کی تھیں۔

یہاں اسپتال پہنچتے ہی حمزہ سے تو میری ملاقات ہو گئی تھی مگر چوہدری جبار کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر حمزہ نے بتایا کہ اسپتال کے ڈاکٹر میونگ سے چوہدری جبار کی دوستی ہو گئی ہے اور وہ دونوں سیر کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ کل واپس آئیں گے۔ مجھے لگا جیسے حمزہ نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن پھر میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔

اگلے روز میں نے سون کے خون کے ٹیسٹ کروائے۔ اس کے علاوہ ایکسرے وغیرہ بھی لیے گئے (حالانکہ ان ٹیسٹوں کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں تھی) اسپتال کی حالت زار اور مریضوں کی زبوں حالی دیکھ دیکھ کر سون حیران ہو رہی تھی۔ اس نے بنکاک کے اسپتال دیکھے تھے اور چند برس پہلے ان میں بطور نرس کام بھی کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک اچھے اور برے اسپتال میں کیا فرق ہوتا ہے۔ گروایش کی ہدایات کے مطابق سون اور اس کے دونوں نگران گیروا کپڑوں کے بجائے عام لباس میں یہاں پہنچے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ پگوڈا سے ان کا تعلق سب پر عیاں نہ ہو۔ سون نے ہلکے گلابی رنگ کی لنگی پہن رکھی تھی۔ کرتہ بھی اس سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے بال ایک ڈھیلی چوٹی کی شکل میں بندھے ہوئے تھے۔ سر پر ایک ڈبی دار آنچل سا تھا۔ پگوڈا سے نکل کر اور رنگین کپڑے پہن کر وہ ایک دم مختلف اور صحت مند نظر آنے لگی تھی اگر کوئی شے اس کے حسن کو گہنا رہی تھی تو وہ اس کے چہرے کی گہری سنجیدگی تھی۔ صبح دس بجے تک ہم ٹیسٹوں سے فارغ ہو گئے۔ اب ایک اہم مرحلہ میرے سامنے تھا۔ میں نے اس سلسلے میں حمزہ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا۔

میں نے حمزہ سے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے سون کو چنکی سے ملا دینا چاہئے۔''
حمزہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''کیسے ملاؤ گے؟''
''کیا مطلب...... وہ وارڈ میں نہیں ہے۔''

"نہیں۔"

"کہاں گیا؟" میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"پرسوں رات...... وہ چلا گیا...... ختم ہو گیا۔"

"کک...... کیا مطلب؟"

"ہاں شاد! پرسوں وہ مر گیا۔ پچھلے دس پندرہ دن میں اس کی حالت بہت بری ہو گئی تھی۔ پیشاب پاخانہ سب کچھ بستر پر ہی تھا۔ رات کو رو رو کر موت کی دعائیں مانگتا تھا۔ آخر میں آواز نکلنا بھی بند ہو گئی تھی۔ پرسوں رات تکلیف سے بستر سے نیچے گر گیا۔ وارڈ میں اندھیرا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں چلا۔ وہیں دم توڑ گیا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایک بدترین شخص کا انجام میں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن کانوں سے سنا تھا۔ چنگی وہ بے رحم خوشہ چیں تھا جس نے ایک ادھ کھلی کلی کو شاخ سے نوچا تھا اور مسل کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس کی زندگی کی شکل یوں بگاڑی تھی کہ وہ خود بھی اپنا آپ پہچان نہیں سکتی تھی۔ اب وہ شخص دنیا میں نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا باب بڑی خاموشی سے بند ہو گیا تھا۔

شام کو میں نے سون کو چنگی کے بارے میں بتا دیا۔ میں نے سون کو ٹوٹے ہوئے اسپرنگوں والا وہ بستر بھی دکھایا جہاں چنگی نے زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔ سون سب کچھ خاموشی سے سنتی رہی۔ حیرت انگیز طور پر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ غم کا نہ خوشی کا، نہ سکون کا...... وہ جیسے اندر سے پتھرا چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہر بات اس کی سماعت تک محدود رہتی ہے۔ ذہن تک رسائی حاصل نہیں کرتی۔ کسی وقت اس کی یہ کیفیت مجھے شدید جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں زمین کے باسی سے نہیں، کسی اور سیارے کی مخلوق سے بات کر رہا ہوں، خالی خالی آنکھیں، کسی گہرے مراقبے میں ڈوبا ہوا ذہن، کسی سوتر (مذہبی دعا) کا ورد کرتے ہوئے متحرک ہونٹ۔

میں نے کہا۔ "مرنے والے کی راکھ دیکھنا چاہو گی؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ چنگی کے مرنے کی خبر اس نے یوں سنی تھی جیسے کسی اجنبی کی خبر سنی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ہربنس نے میرے بازو کا پلاستر کاٹ دیا۔ اندر سے ایک بدرنگ کمزور بازو برآمد ہوا جو کوشش کے باوجود سیدھا نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال یہ عارضی رکاوٹ تھی۔ اندازہ ہو رہا

تھا کہ کہنی کے معاملات نوے فیصد درست ہو گئے ہیں۔ زخمی پاؤں پر بھی اب دباؤ بڑھ رہا تھا۔ مٹھ جانے کے چند روز بعد ہی میں بغیر چھڑی کے چلنے لگا تھا۔

ملیریا کے مریض کثرت سے اسپتال آ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو بری طرح بیمار اور کمزور ہونے کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ کئی ایک کی صورت دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ مشکل سے بچیں گے...... بچے اور بوڑھے زیادہ متاثر ہو رہے تھے۔ اسپتال کے برآمدوں میں بھی مریض لیٹے اور کراہتے نظر آتے تھے۔ سون ان مناظر سے بھی لاتعلق ہی دکھائی دیتی تھی۔ دوپہر کے بعد وہ کوئی ٹھوس غذا نہیں لیتی تھی۔ بہر حال میرے کہنے سننے پر اس نے دوا (جو ٹھوس گولیوں کی شکل میں ہوتی تھی) کھانا شروع کر دی تھی۔ سہ پہر کے وقت وہ سو گئی اور دیر تک سوئی رہی۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ دو تین بار میں اس کمرے کی طرف گیا۔ ایک دفعہ وہ سوئی ہوئی ملی۔ دو دفعہ وہ اپنی کسی مذہبی رسم کی ادائیگی میں مصروف تھی۔ چوتھی مرتبہ میں رات نو بجے کے لگ بھگ گیا۔ اس وقت وہ "مراقبے" میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں جھنجلا سا گیا۔ مجھے لگتا تھا کہ مجھ سے نہ ملنے کے لیے اس نے اپنی مصروفیات کچھ بڑھا لی ہیں۔ مٹھ سے آتے ہوئے بھی وہ تذبذب کا شکار تھی۔ غالباً وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ میں اسے بلاضرورت اسپتال لے جا رہا ہوں۔

میں نے نگران ملازمہ کو اشاروں کنائیوں میں بتایا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔

ملازمہ میرا پیغام لے کر اندر چلی گئی۔ میں بے قراری سے دروازے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ سون کے ساتھ آزاد فضا میں بات چیت کرنے کے لیے میرے پاس وقت تھوڑا ہے۔ عین ممکن تھا کہ کل شام تک ہمیں مٹھ واپس جانا پڑتا۔ تین چار منٹ بعد دروازہ کھلا اور ملازمہ نے اشاروں کنائیوں کی زبان میں مجھے سمجھایا کہ مالکن ابھی مراقبے میں ہیں۔ میں تھوڑی دیر بعد آؤں۔

میں جھنجلاہٹ میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے سون موجود تھی۔ وہ بھکشوؤں کے مخصوص انداز میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی مالا گردش کر رہی تھی۔ اپنے عین سامنے اس نے سفید خوشبودار پھولوں کی چھوٹی سی ڈھیری لگا رکھی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر بھی وہ محو رہی۔ میں نے ہولے سے اس کا شانہ ہلایا۔ اس نے بڑی بڑی ناراض آنکھوں سے میری جانب دیکھا۔ کچھ دیر تک اپنے ہونٹ بھینچے رہی۔

پھر اپنا آسن توڑ کر اس نے مالا ایک طرف رکھ دی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے خواب ناک آواز میں پوچھا۔

''خدا کے لیے سون! ذرا اپنے ارد گرد بھی نگاہ رکھو۔ یہ حجرہ نشینی زندگی نہیں ہے۔ یہ زندگی سے فرار ہے۔''

''مجھے ایسی ہی زندگی چاہیے جیسی میں جی رہی ہوں۔''

''تم غلط کہہ رہی ہو سون! تم زندگی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ تم قدرت کو جھٹلا رہی ہو۔ خدا نے دنیا میں کچھ بھی بے مصرف پیدا نہیں کیا۔ تمہاری ساری ظاہری اور باطنی خوبیاں بے مصرف نہیں ہیں۔ تم یکسر بے عملی کی زندگی گزار کر ان کو بے مصرف بنا رہی ہو۔ تم قدرت کی کرم فرمائیوں کی ناشکری کر رہی ہو۔ پیٹ کی دوزخ بجھا کر سو جانا اور جاگ کر فلسفے کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانا کہاں کا جینا ہے۔ زندگی تو ان خوشبوؤں، مراقبوں اور تن آسانی سے کہیں بہت آگے تمہیں پکار رہی ہے۔''

''پلیز! پلیز تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔'' وہ کراہی۔ ''میں جتنی دور آ گئی ہوں وہاں سے پلٹنا مشکل ہے۔''

''مشکل ہو گا، ناممکن تو نہیں ہے۔ خدا کے لیے سون! آنکھیں کھولو اور حقیقتوں کی طرف دیکھو۔ دل سے نہیں دماغ سے سوچو! یاد ہے اس سے پہلے بھی تم دل سے سوچا کرتی تھیں۔ بنکاک کی ساری رنگینیوں کو تم نے اپنے اندر سمیٹا ہوا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا، سون! تم انتہا کو چھو رہی ہو۔ جو لوگ ایک انتہا کو چھوتے ہیں وہ کسی وقت یوں پلٹتے ہیں کہ دوسری انتہا کو چھو لیتے ہیں۔ نہایت دنیا دار شخص نہایت تارک الدنیا بن سکتا ہے۔ کبھی شیطان سادھو بن جاتے ہیں اور کبھی غیر معمولی قابل اور مصروف ترین لوگ یکسر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ سون! تم بھی ایک انتہا سے پلٹنے کے بعد دوسری انتہا کو چھونے لگی ہو۔ اپنا تجزیہ کرو، خود پر غور کرو۔''

''میں بہت غور کر چکی ہوں۔ اب مزید نہیں کر سکتی۔''

''نہیں سون! تم جان بوجھ کر اپنی سوچ کے دروازے بند کر رہی ہو۔ تم زندگی سے دور زندہ لوگوں سے دور جا رہی ہو۔''

''یہ غلط ہے۔ میں اپنے طریقے کے مطابق زندگی سے دور نہیں ہوں۔''

''یہی تو تمہاری بھول ہے سون! یہ ''بند خوشبو دار کمرے'' کا مراقبہ زندگی نہیں ہے۔

زندگی اس کمرے سے باہر ہے، زندہ لوگ بھی اس کمرے سے باہر ہیں۔'' میری آواز بلند ہو گئی تھی۔

''پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہو۔''

''میں زندہ لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔ ''اگر دیکھنا چاہتی ہو تو آؤ میرے ساتھ...... ہاں آؤ میرے ساتھ میں تمہیں ایک زندہ شخص دکھاؤں...... اٹھو۔'' میرا ہاتھ خود بخود سون کے بازو پر آ گیا۔ شدید جھنجلاہٹ کے زیر اثر میں نے اسے کھینچ کر فرش پر کھڑا کر دیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نگران ملازمہ کمرے کے ایک گوشے میں کھڑی تھی۔ ہماری اب تک کی گفتگو کا کوئی لفظ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟'' وہ ذرا پریشان ہو کر بولی۔

''زیادہ دور نہیں بس اس دروازے کے باہر۔'' میرا دایاں ہاتھ بدستور اس کے بازو پر تھا۔ انگلیاں اس کے گوشت میں پیوست ہو رہی تھیں۔ میں اسے اپنے ساتھ باہر لے آیا باہر بارش شروع ہو چکی تھی۔ اسپتال کے برآمدوں اور احاطے میں درجنوں مریض موجود تھے۔ اب وہ بارش سے بچنے کے لیے کونوں کھدروں میں سمٹ رہے تھے۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک یتیم خانے کے کوئی بیس عدد بچے زخمی حالت میں اسپتال پہنچے تھے۔ ان میں سے کچھ شدید زخمی تھے۔ یہ بچے چھت گرنے سے زخمی ہوئے تھے۔ وہ بھی اسپتال کے احاطے میں ہی موجود تھے۔ ان کی دردناک چیخوں نے ماحول کو سوگوار کر رکھا تھا۔

میں نے ڈاکٹر ہربنس اور حمزہ وغیرہ کو دیکھا۔ ہربنس گیس لیمپوں کی روشنی میں زخمی بچوں کی پٹیاں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اور کپڑے خون آلود ہو رہے تھے۔ اس کی عینک ناک کی چونچ پر اٹکی ہوئی تھی۔ گریبان کھلا اور بال منتشر تھے۔ لگتا تھا وہ کافی دیر سے پوری نیند نہیں لے سکا ہے۔ اس کے معاون ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر تندہی سے اس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ میں نے جذباتی انداز میں چھت پر سے ڈاکٹر ہربنس کی طرف اشارہ کیا اور سون سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''دیکھو یہ ہے ایک زندہ شخص...... اور یہ ہے اس کے آس پاس کی زندگی...... یہ زندگی جو اس اسپتال کے خستہ حال برآمدوں اور وارڈوں میں بکھری ہوئی ہے۔ جو رو رہی ہے، کراہ رہی ہے...... جو مدد مانگ رہی ہے۔ جو درد سے چیختی بھی ہے اور درد جھیلتی بھی ہے۔ یہی اصل زندگی ہے۔ اور وہ دیکھو...... وہ دائیں طرف ٹیلے پر سنہرے

کلسوں والے پگوڈے میں تمہاری ہی طرح خوشبوئیں سلگا کر کچھ لوگ سوئے ہوئے ہیں۔ یا مراقبے فرما رہے ہیں۔ وہ زندہ لوگ نہیں ہیں۔ وہ زندہ ہرگز نہیں ہیں۔" میری آواز جذبات سے کانپ رہی تھی اور انگلیاں سون کے گوشت میں پیوست ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ ہم دونوں بھیگ گئے تھے۔ ہمارے کپڑے بارش کے بوچھاڑوں سے تربتر ہو گئے تھے۔ سون کے دونوں نگران کچھ فاصلے پر شیڈ کے نیچے کھڑے تھے اور تعجب سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں شاید نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسا ڈاکٹر ہے جو اپنے بخار زدہ مریض کو اپنے ساتھ بارش میں بھگو رہا ہے۔

سون بالکل ساکت کھڑی رہی۔ اسپتال میں کراہتی چیختی اور روتی بے بس مخلوق کو دیکھتی رہی اور ان فرشتہ سیرت نوجوانوں کو بھی دیکھتی رہی جو ڈاکٹر ہربنس کے ساتھی تھے اور اس کھنڈر اسپتال میں، شہری سہولتوں سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر خلق خدا کے لیے اپنی جان مار رہے تھے۔ کسی لالچ اور کسی صلے کی خواہش کے بغیر لاچار انسانیت کے زخموں پر مرہم رکھنے کی اپنی سی کوشش کر رہے تھے بادل گرجتے رہے۔ بارش زور پکڑتی رہی۔ مریض تکلیف سے کراہتے رہے، بچے درد سے چیختے رہے۔ درد کے اس محاذ پر...... گھمسان کے اس رن میں ڈاکٹر ہربنس کی آواز ایک کمانڈر کی طرح گونجتی رہی۔ ایک ایسا کمانڈر جو چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا اور لڑ رہا تھا۔

میں نے سون سے کہا۔ "سون! نروان کی تلاش کر رہی ہو نا تم؟ نروان اس بند کمرے میں نہیں...... اس کھلے احاطے میں ہے۔ اگر تمہارے دل و دماغ کو بالکل تالے نہیں لگ گئے ہیں تو پھر سوچو کہ تمہیں اس آرام دہ اور خوشبودار کمرے میں گھسنا ہے یا ایسے ہی کسی اسپتال میں اترنا ہے۔"

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ سون ذرا سا ڈگمگائی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہے بغیر کمرے میں واپس جانے کے لیے مڑی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا "بی پی" ایک دم کم ہو گیا ہے۔ دو تین قدم چل کر وہ لڑکھڑا گئی۔ میں اسے سنبھال نہ لیتا تو وہ تیورا کر گر جاتی۔ میں نے گرنے سے پہلے اسے گود میں اٹھا لیا۔ میرا بازو کھچاؤ کے سبب جھنجھنا اٹھا مگر میں پروا کیے بغیر اسے اندر کمرے میں لے آیا۔ دونوں نگران ایک دم دہشت زدہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے سون کو بستر پر لٹا دیا۔ اس کے بھیگے گال تھپتھپائے۔ اس کی پلکوں میں جنبش نمودار ہو گئی۔ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی، اسے صرف چکر آیا تھا۔ میں نے

ملازمہ اور محافظ کو تسلی دی۔

فاقوں کے سبب وہ کافی کمزور ہو چکی تھی، اس کے باوجود اس کے سراپا کی دلکشی برقرار تھی۔ میں نے ملازمہ کو اشارہ کیا اس نے سون کے بھیگے جسم پر چادر ڈال دی اور پنکھا بند کر دیا۔ میں نے سون کی طبیعت دیکھتے ہوئے اسے ایک انجکشن دیا اور دوا بھی پلا دی۔ چند منٹ بعد اس کی پلکیں پھر بوجھل ہو گئیں اور وہ سو گئی۔

تھائی ملازمہ کو سون کا دھیان رکھنے کا کہہ کر میں باہر نکل آیا۔ اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے میں کچھ دیر برآمدے میں ہی ٹہلتا رہا۔ زیریں منزل سے زخمی بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں اب ماحول کا حصہ ہی محسوس ہونے لگی تھیں۔ ٹہلتے ٹہلتے میرا دھیان چوہدری جبار کی طرف چلا گیا۔ آج دن میں بھی دو تین بار مجھے اس کا خیال آیا تھا۔ ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے پریشانی سی ہونے لگی۔ ابھی میں اس بارے میں حمزہ سے پوچھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے سیڑھیوں سے چوہدری جبار کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ اور جیسے میری جان میں جان آ گئی۔ چوہدری جبار اپنے وزنی قدموں سے چلتا ہوا اوپر آ گیا۔ وہ حسب معمول کلف دار لٹھے کی سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں گرگابی تھی۔ بہرحال اس کے کپڑوں کا کلف بارش میں بھیگ کر بالکل برابر ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر حمزہ اور ڈاکٹر میونگ بھی اس کے ساتھ تھے۔

جبار کو ابھی تک سون وغیرہ کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے مجھ سے کوئی استفسار کیا تھا۔ وہ اور حمزہ اس وقت مجھے ایک اور کہانی سنانے کے لیے آئے تھے۔ ان کی صورتیں دیکھ کر ہی میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ان کے پاس کوئی اہم کہانی یا "بریکنگ نیوز" ٹائپ کی چیز ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ نیوز بری نہیں ہے۔

بہرحال علیک سلیک کے بعد جب میں نے چوہدری جبار کے ہاتھ میں کم سن شیلن کی تصویر دیکھی تو میں چونک سا گیا۔

"یہ تصویر تمہارے پاس کیسے جبار بھائی!" میں نے پوچھا۔

میری گھبراہٹ دیکھ کر جبار اور حمزہ کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ذرا چھری تلے سانس لو ڈاکٹر باؤ! سب کچھ بتاتے ہیں تمہیں۔" جبار نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"بچہ خیریت سے ہے تو ہے ناں؟" میں نے حمزہ سے پوچھا۔

حمزہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ حمزہ اور میونگ بھی بید کی کرسیاں میرے قریب لا کر بیٹھ گئے۔ ہم اسپتال کی برساتی میں تھے۔ چھت پر مسلسل پانی برس رہا تھا۔ تاریکی میں ناریل جھوم رہے تھے۔ اگلے آدھ پون گھنٹے میں جو کچھ بتایا گیا وہ اطمینان بخش اور خوش کن تھا۔ اس طویل گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ شیلن اب چاتو چانگ لے میں نہیں تھا۔ شیلن وہاں تھا جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔ وہ اپنے والدین اور ایک چچا کے ساتھ بذریعہ سڑک ملائیشیا کا بارڈر پار کر چکا تھا۔ شیلن کی فیملی کے ساتھ ڈاکٹر میونگ کا ایک گہرا دوست ڈاکٹر مصطفیٰ تھا۔ ڈاکٹر مصطفیٰ امیر الدین کا بیٹا اور صاحب حیثیت شخص تھا۔ اس نے ذمے داری قبول کی تھی کہ وہ شیلن کو کوالالمپور کے کسی اچھے اسپتال میں ایڈمٹ کرائے گا اور بچے کے مکمل علاج تک فیملی کو سپورٹ کرے گا۔ یہ سب کچھ چوہدری جبار اور ڈاکٹر میونگ کی ذاتی دلچسپی اور کوشش کی وجہ سے ہو سکا تھا۔ درحقیقت جس وقت سے جبار کو معلوم ہوا تھا کہ مجھے کھائی میں گرائے جانے کا واقعہ شیلن کے تنازعے کے سبب پیش آیا۔ جبار نے اس کام کو کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر میونگ کے ہمراہ بڑی راز داری کے ساتھ چاتو چانگ لے پہنچا تھا اور وہاں شیلن اور اس کے والدین سے ملاقات کی تھی۔ شیلن کے والد سے بعد میں میونگ نے دو تین ملاقاتیں مزید کی تھیں اور شیلن کو ملائیشیا بھجوانے کا فوری پروگرام ترتیب دے دیا تھا۔ یہ کام اتنی چابکدستی سے ہوا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی بلکہ آئندہ سات آٹھ روز تک بھی اس خبر کے آؤٹ ہونے کی توقع نہیں تھی۔ بستی میں سب کو یہی معلوم تھا کہ بارشوں کے سبب شیلن کا گھر خراب ہے اور شیلن کی فیملی کچھ دن گزارنے کے لیے "آنگی" گئی ہوئی ہے۔ آنگی میں شیلن کا ننھیال تھا۔ یہ "آنگی" وہی بستی تھی جہاں ہم نے پوئے نامی تماشا دیکھا تھا اور سون پر پہلی بار میری نگاہ پڑی تھی۔

میری غیر موجودگی میں حمزہ، جبار اور ڈاکٹر ہربنس وغیرہ نے مل کر یقیناً یہ ایک زبردست کارنامہ انجام دیا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ یہ کام بے حد صفائی سے کیا گیا تھا۔ جبار حمزہ یا ہربنس براہ راست اس میں ملوث نہیں ہوئے تھے۔ شیلن کے یہاں سے جانے کا پتہ چل بھی جاتا تو ہم میں سے کسی پر کوئی الزام نہیں آ سکتا تھا۔

میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل سانس نکل گئی۔ میں نے معصوم شیلن کی تصویر دیکھی اور بے اختیار اسے چوم لیا۔ مجھے لگا جیسے شیلن کی بڑی بڑی آنکھیں مجھے دیکھ رہی

ہیں اور وہ سب کے ساتھ ساتھ میرا بھی شکریہ ادا کر رہا ہے۔ شکریہ اجنبی ڈاکٹر! شکریہ میں تصویر کی طرف دیکھتا رہا پھر شیلن کی آنکھوں سے دو اور آنکھیں جھانکنے لگیں۔ یہ کم سن شہناز کی آنکھیں تھیں۔ ہاں کتنی مشابہت تھی ان دونوں آنکھوں میں...... شیلن کے چہرے پر شہناز کی آنکھیں تھیں۔ چند ہفتے پہلے ان آنکھوں نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا۔ "کیا اس بار بھی موت ہی میرا مقدر ہے؟"

آج میں اس سوال کا جواب دے سکتا تھا۔ اور جواب یہ تھا۔ "اس بار موت تمہارا مقدر نہیں ہے۔ اس بار انشاء اللہ تمہیں زندگی ملے گی۔ ہریالی کی سرزمین پر اونچے پام کے پیڑوں کے نیچے ایک پرمسرت زندگی۔"

میں نے تشکر آمیز نظروں سے چوہدری جبار اور میونگ کی طرف دیکھا مجھے اپنے ارد گرد اطمینان کی لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

رات سرکتی رہی اور بارش برستی رہی۔ میں نیچے حمزہ کے ساتھ مل کر ڈاکٹر ہرنس کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ زخمی بچوں اور دیگر مریضوں کے لیے ہم سے جو کچھ ہو سکتا تھا ہم کرتے رہے۔ شام کے وقت ایک بچہ جاں بحق ہو گیا تھا اس کے بعد سے خیریت ہی رہی تھی۔ رات تیسرے پہر میں سون کو دیکھنے کے لیے اوپر کمرے میں آیا۔ ملازمہ اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھی تھی۔ گیس لیمپس چوکور کمرے کے خدوخال کو نمایاں کر رہے تھے۔ سون کی آنکھیں بند تھیں۔ ڈھلے ڈھلے سے بال تکیے پر بکھرے تھے۔ پتہ نہیں کیا بات تھی اس میں؟ کتنا کچھ ہو چکا تھا اس کے ساتھ، حیات کے خارزار میں وہ کیسے کیسے گھسیٹی گئی تھی، پھر بھی نیند کی حالت میں ایک نوخیز کلی ہی نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی تو میرے محسوسات اس حد تک چلے جاتے تھے کہ وہ مجھے ایک کنواری کی طرح نظر آنے لگتی۔

وہ ایسی کیوں تھی؟ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں ابھرتا تھا۔ جب بھی یہ سوال ابھرا تھا اس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آیا تھا۔ وہ ایسی اس لیے تھی کہ وہ ذہنی طور پر گناہ سے آلودہ نہیں ہوئی تھی۔ جس نے اسے پورے کا پورا اپنے اندر ڈبو رکھا تھا۔ بنکاک کے عشرت کدوں میں اس کا ذہن اس کے جسم سے بہت دور...... بہت دور رہا تھا۔

میں خوابیدہ سون کو دیکھتا رہا۔ بے اختیار جی چاہا کہ اسے چھولوں۔ میں نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ اس کی انتہائی شفاف پیشانی پر رکھ دیا۔ میرا لمس پا کر اس نے آہستگی سے پلکوں کو حرکت دی۔ سوئی سوئی نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں خوف سا ابھر آیا۔ اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ وہ بڑی دھیمی آواز میں بولی۔ ''ڈاکٹر مجھے واپس چھوڑ آؤ۔ پلیز میرے ساتھ ایسا مت کرو۔''

''میں کیا کر رہا ہوں سون!'' میں نے درد میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم تم کیا کر رہے ہو۔ شاید تم اچھا کر رہے ہو۔ شاید اچھا نہیں کر رہے ہو۔ لیکن میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میں مٹھ میں واپس جانا چاہتی ہوں۔ اب اس کے

سوا میرا کوئی ٹھکانا نہیں...... خدا کے لیے ڈاکٹر! مجھے اور اپنے آپ کو دکھ کے کانٹوں میں اور مت گھسیٹو۔''

''سون! میری محبت کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ یہ برسوں پرانی کہانی ہے۔ میں بڑی خاموشی سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔ اب واپسی ممکن نہیں۔ واپس ہوا تو مر جاؤں گا۔ کیا تم مجھے مار دینا چاہتی ہو؟''

''نہیں...... کچھ نہیں ہو گا۔ تم دیکھ لینا کچھ نہیں ہو گا، تم زندہ رہو گے، تم خوش رہو گے لیکن میں ایک بار...... بھٹک گئی تو پھر کہیں کی نہیں رہوں گی...... پلیز ڈاکٹر! ملازم کو بلاؤ...... ہم واپس جائیں گے۔''

اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کوئی کرب تھا جو اس کی نازک جان کو تہ و بالا کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم کہتی ہو کہ کچھ نہیں ہو گا لیکن کچھ ہو بھی سکتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔'' میرا گلا رندھ گیا۔

میں مڑا اور کچھ دور بید کی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے جسم کی ساری رگیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہی ہیں اور سینے میں دھواں بھر رہا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سر دیوار سے ٹکا دیا۔ سون کے لیے یہ میرے دل میں کیسا جذبہ تھا۔ یہ جذبہ اب تک کہاں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اور اب کیونکر اس بے پناہ شدت سے ظاہر ہوا تھا۔

سون نے مقامی زبان میں اپنے ملازم کو پکارنا شروع کر دیا۔ اس کی تیسری چوتھی آواز پر ملازم آن حاضر ہوا۔

سون اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے ملازم سے کچھ کہا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے لیکن بات سمجھ میں آ گئی۔ سون اپنے ملازم کو اسی وقت واپس چلنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ جواباً ملازم قدرے حیران ہو گیا تھا اور کچھ پریشان بھی اس نے کھڑکیوں کی طرف اشارہ کر کے ملائی زبان میں کچھ کہا۔ کھڑکیوں سے باہر تاریکی تھی اور بارش کی بوچھاڑیں تھیں۔ ملازم غالباً یہی کہہ رہا تھا کہ رات کے اس پہر واپسی کی کوئی صورت نہیں۔ اگر انہیں جانا ہی ہے تو پھر صبح تک انتظار کرنا ہو گا۔

سون کے چہرے پر بے قراری تھی۔ ملازم کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ دل میں طوفان سا اُمڈ رہا تھا۔ یہ غم کا طوفان تھا جو آنسوؤں کے دوش پر سوار ہو کر آنکھوں سے بہہ نکلنا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میرے جسم میں گلے تک آنسو بھر گئے ہیں اور ان آنسوؤں میں غم کا مارا دل پتے کی طرح لرز رہا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔

محسوس ہوتا تھا کہ اس پل پل سرکتی رات کی منزل جدائی ہے۔ اس جدائی سے پہلے میں سون کا دامن تھام کر اتنا رونا چاہتا تھا کہ سب کچھ ایک شوریدہ سر پانی میں بہہ جائے۔ لیکن یوں رونا بھی مردانگی کے خلاف تھا۔ میں اپنی آنکھوں پر بند باندھے بیٹھا رہا۔ سون بھی بیٹھی رہی۔ اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی اور نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کے ملیح چہرے پر کرب تھا۔ وہ بے چین تھی۔ اس کے اندر تہلکہ تھا۔ اس کا ہاتھ بے خیالی میں اپنے گلے کی چوبی مالا سے اُلجھ رہا تھا۔ دائیں طرف آبنوس کی فریمنگ میں لگا ہوا پرانا کلاک ٹک ٹک کی مدھم آواز سے اپنا دائمی سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ کھڑکیوں سے باہر گاہے گاہے بجلی چمکتی تھی۔ کیلے اور پپیتے کے درخت دور تک روشن ہو جاتے تھے۔ ان درختوں کے عقب میں پگوڈا کے سنہری کلس تھے۔ اس کی دائیں جانب وہ بارشی جھیل تھی جسے چاروں طرف سے Rain Forest نے گھیر رکھا تھا۔ بجلی کی چمک کے بعد ایک مخصوص وقفہ آتا تھا اور بادل غضب ناک ہو کر گرجتے تھے۔ ان کی گرج میں نیچے اسپتال کے وارڈ سے اٹھنے والا مدھم شور بالکل معدوم ہو جاتا تھا۔ یہ ان روتے بلکتے بچوں کا شور تھا جو بادو باراں کی اس رات میں تکلیف سے بے قرار تھے اور جن کے زخم خون کے آنسو بہا رہے تھے۔

وہ عجیب رات تھی اور وہ عجیب بارش تھی۔ بارش کی بوچھاڑیں یوں رہ رہ کر کھڑکیوں پر دستک دیتی تھیں جیسے انہیں توڑ دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ بارش اور تاریکی سے گھرے ہوئے اس کمرے میں سون اور میں قریب قریب ہونے کے باوجود بہت دور تھے۔ کمرے میں دو گیس لیمپ تھے۔ ایک گیس لیمپ کی روشنی کسی وقت ماند پڑ جاتی تھی پھر خود ہی یکا یک تیز ہو جاتی تھی۔ جب وہ تیز ہوتی تھی تو یوں لگتا تھا کہ ٹیوب لائٹ روشن ہو گئی ہے۔

میں نے بظاہر آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ لیکن باریک جھری میں سے کبھی کبھی میں سون کا چہرہ دیکھ لیتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی توجہ دو اطراف میں مبذول ہے۔ کبھی وہ چپکے سے میری طرف دیکھتی ہے کبھی اس کا سارا دھیان ان آوازوں کی طرف چلا جاتا ہے

جو نیچے خستہ حال وارڈوں سے اُبھر رہی تھیں۔ وہ ایک طرف دکھی انسانیت کا درد محسوس کر رہی تھی، دوسری طرف ”دکھی انسان“ کا درد محسوس کر رہی تھی۔ یہ دونوں درد اسے مل کر گھیر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں رو نہیں رہا تھا لیکن آنسو بہہ رہے تھے۔ پتہ نہیں کہاں سے آ گیا تھا اتنا نیم گرم نمکین پانی۔ بغیر کسی آواز کے بغیر کسی تاثر کے یہ میرے رخساروں پر اور میری گردن پر بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایک خاموش سیلاب تھا جو رکاوٹیں توڑ کر نکل آیا تھا۔ میں نے نہ رونے کی قسم کھائی تھی۔ لیکن چپ چاپ، آنسوؤں کا گرتے چلے جانا رونا تو نہیں ہوتا۔

رات سرکتی رہی۔ اور سون دیکھتی رہی۔ کبھی دکھی انسانیت کی طرف، کبھی ”دکھی انسان“ کی طرف، ایک طرح یہ دونوں درد مل کر اسے گھیرتے رہے۔ شاید وہ منتظر تھی کہ میں کچھ اور بولوں لیکن مجھ میں بولنے کا چارہ نہیں تھا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک بار پھر سون کا انکار سن سکوں۔

رہ رہ کر بجلی تڑپتی تھی اور کھڑکیوں میں سے پگوڈا کے سنہری کلس چمک اٹھتے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سون گاہے گاہے ان کلسوں کی طرف بھی دیکھتی ہے۔ یہ کلس اس کے اندر کی کشمکش اور اس کے لہو کے ہیجان میں...... شاید اضافہ کر رہے تھے۔ ممکن تھا کہ اگر بچوں کی آوازیں اور میری دید، سون کو ایک طرف کھینچ رہی ہو تو یہ کلس اسے دوسری طرف کھینچ رہے ہوں۔ وہ بڑی عجیب رات تھی، ایسی ہی راتیں اور ایسے ہی مناظر، ذہن پر نقش رہ جاتے ہیں۔ مریضوں کی کراہیں۔ میرے رخساروں پر رواں آنسو۔ بجلی میں چمکتے ہوئے سنہری کلس، ایک دم تیز روشنی دینے والا گیس لیمپ، کیلے اور پپیتے کے جھومتے درخت، یہ سب اس رات کے انمٹ نقوش تھے۔

سپیدہ سحر نمودار ہونے میں اب کچھ ہی دیر تھی۔ میں نے آنکھوں کی جھری سے سون کی طرف دیکھا۔ مجھے شاک سا لگا۔ سون کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجی، سون پر پھر تشنج کی کیفیت طاری ہو سکتی تھی۔

میں اپنے ”خاموش آنسو“ پونچھتا ہوا جلدی سے اٹھا۔ ایک "SOS" انجکشن میں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا۔ میں انجکشن لے کر سون کے قریب آیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ وہ ذرا

سا کسمسائی، بہر حال میں نے اس کے بازو پر انجکشن لگا دیا۔

اس انجکشن کی وجہ سے دو چار منٹ بعد ہی وہ پر سکون ہو گئی۔ پھر اس پر بتدریج غنودگی کا غلبہ ہو گیا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

بارش مسلسل برس رہی تھی۔ میں نیچے وارڈ کا ایک راؤنڈ لگانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میں رویا نہیں تھا لیکن میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور گواہی دے رہی تھیں کہ ان میں سے بے شمار آنسو گزرے ہیں۔ ایسی آنکھوں کے ساتھ میرا، ڈاکٹر ہربنس اور حمزہ وغیرہ کے سامنے جانا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا اور اوپر ہی برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ نگران خادم دروازے کے سامنے لکڑی کے بینچ پر چوکس بیٹھا تھا۔ ملازمہ کمرے کے اندر چلی گئی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی چھ بج رہے تھے لیکن بادلوں کی وجہ سے ابھی تک اندھیرا تھا۔ قریباً آدھ گھنٹہ مزید گزر گیا۔ ملازمہ باہر آئی اس نے اشاروں کنائیوں میں مجھے بتایا کہ اندر سون مجھے بلا رہی ہے۔

مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی جاگ جائے گی۔ میں اندر گیا۔ یکدم بھڑک جانے والا گیس لیمپ اب بجھا ہوا تھا۔ تاہم کھڑکیوں سے آنے والی روشنی نے کمرے میں قدرے اجالا کر دیا تھا۔ سون بستر پر دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ ابھی تک غنودگی میں ہے۔

میں اس کے قریب جا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ میری موجودگی کا احساس کر کے اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی پلکوں پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ ایک خوابناک آواز ابھری۔ اس نے کچھ کہا لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے موتی ڈھلکے اور اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔ میرے سینے میں کرب کی لہر اٹھی۔ میں نے اپنا ہاتھ بے اختیار اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ میرے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اس کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو ڈاکٹر؟''

''میں...... تم سے...... تم ہی کو چاہتا ہوں۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

اس کی حسین آنکھیں دو تین سیکنڈ میرے چہرے پر جمی رہیں پھر وہ خوابناک آواز میں بولی۔ ''مجھے یہاں سے لے چلو ڈاکٹر...... کہیں دور لے چلو...... بہت دور۔''

یہ الفاظ نہیں تھے۔ مسرت و انبساط کے شادیانے تھے جو فلک شگاف آوازوں کے ساتھ میرے سینے میں گونج تھے۔ میں نے بڑی محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ میری آنکھوں سے دو تازہ آنسو گر کر خاموشی سے سون کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ باہر بھیگی ہوا کیلے کے جھنڈوں اور ناریل کے درختوں میں سرسرا رہی تھی۔ سون کے آخری جملے کی گونج جیسے پوری کائنات میں تھی۔

۞۞۞

گروایش نے ہمیں اڑتالیس گھنٹے کی چھٹی دی تھی لیکن اس میں تقریباً چوبیس گھنٹے کی مزید رعایت بھی موجود تھی۔ ہم نے اس رعایت کو استعمال کیا۔ اگلے روز ہم نے کوپنا سے نکل کر بنکاک پہنچنے کا پروگرام تیار کر لیا۔ اس پروگرام کی تیاری میں ڈاکٹر میونگ نے ہماری بھرپور مدد کی لیکن میری خواہش پر وہ کسی بھی مرحلے میں براہ راست اس تیاری میں ملوث نہیں ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے یہاں سے جانے کے بعد میونگ یا پھر ڈاکٹر ہربنس پر کوئی حرف آئے۔ وہ پہلے ہی گوناگوں مشکلات کا شکار تھے۔

اگلی رات بھی بادلوں کی وجہ سے تاریک تھی۔ ہم نے نو بجے کے لگ بھگ، ڈاکٹر ہربنس، کارینگ اور میونگ وغیرہ کو خدا حافظ کہا۔ میونگ خود بھی چند دن تک ملائیشیا شفٹ ہو رہا تھا اس نے ہم سے وعدہ کیا کہ شیلن کی دیکھ بھال میں وہ ڈاکٹر مصطفیٰ کی بھرپور مدد کرے گا۔ ڈاکٹر ہربنس سے رخصت ہوتے ہوئے دل بھر آیا۔ یوں لگا جیسے ہم اگلے مورچوں میں لڑنے والے ایک فرض شناس کمانڈر کو تن تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

روانگی سے پہلے ڈاکٹر میونگ نے سون کی چند پاسپورٹ سائز تصویریں کھینچیں اور ایک دو کاغذات پر اس کے دستخط بھی کرائے۔ یہ سب کچھ سون کے سفری کاغذات تیار کرنے کیلئے تھا۔ ڈاکٹر میونگ نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ چند دن کے اندر سون کے کاغذات تیار ہو جائیں گے۔ بنکاک میں اپنے جیک نامی دوست کو میونگ نے اس کام کے لیے ابھی سے متحرک کر دیا تھا۔ ایک مسئلہ نگران خادم اور خادمہ کا بھی تھا۔ ان سے چھٹکارا پانے کے کئی طریقے تھے لیکن میں کوئی ایسا طریقہ نہیں چاہتا تھا جس سے بعد میں ڈاکٹر ہربنس وغیرہ کے ''ملوث'' ہو جانے کا اندیشہ ہو...... خادم اور خادمہ کی چائے میں سلیپنگ پلز ملانے کا فیصلہ ہوا۔ یہ خواب آور چائے میں نے شام آٹھ بجے کے قریب از خود ان دونوں کو پیش کی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ دونوں بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ ہم

نیک تمناؤں کے ساتھ رخصت ہوئے اور ایک بند گھوڑا گاڑی میں لکشون گاؤں کی طرف ہمارا طویل سفر شروع ہو گیا۔ پہلے ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ ہمارا چھکڑا بان دوست کاریگ گھوڑا گاڑی فراہم کرے گا اور ہمیں لے کر لکشون اور پھر "مالم" تک جائے گا۔ مگر بعد ازاں میرے کہنے اور حمزہ کی خواہش پر پروگرام بدل دیا گیا تھا۔ ہم کاریگ کو بھی اس معاملے میں کسی طرح ملوث کرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر بھی کاریگ نے ہماری بھرپور مدد کی تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ "ڈسکشن" کے بعد لکشون تک پہنچنے کے لیے ہمارے واسطے ایک محفوظ ترین راستہ منتخب کر دیا تھا۔ اس راستے کے بارے میں اس نے ڈاکٹر میونگ وغیرہ کو تفصیلاً سمجھایا تھا اور میونگ نے گاڑی بان "شوڈی" کو بریفنگ دے دی تھی۔ ہم لکشون کے قریب سے گزرتے ہوئے ماہا کی طرف جا رہے تھے اور عام راستے سے ہٹ کر جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ یہ سفر مختصر ہونے کے ساتھ ہمارے لیے محفوظ بھی تھا۔ راستے میں کسی خطرے سے نمٹنے کے لیے جبار کے پاس ریوالور موجود تھا۔ گاڑی بان سوڈی کے پاس بھی ایک پرانی شاٹ گن تھی بہر حال ہماری خوش قسمتی کہ راستے میں ان چیزوں کی ضرورت کسی بھی حوالے سے پیش نہیں آئی۔

کوپتا سے لکشون اور لکشون سے "مالم" تک کا سفر تقریباً نو گھنٹے پر محیط تھا۔ کیچڑ آلود زمین، گھنے درختوں اور نشیب و فراز سے معمور یہ سفر ایک سنسنی خیز خواب جیسا تھا۔ سون نے یہ سفر گہری خاموشی میں کاٹا۔ وہ سر تا پا ایک چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اگر ہم کوئی بات کرتے تو مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھی۔ گمبھیر خاموشی کو توڑنے کے لیے میں حمزہ اور جبار آپس میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ اعصابی کشیدگی بہت زیادہ تھی۔ پھر ہر آن یہ دھڑکا لگا تھا کہ ہم پکڑے جائیں گے۔ گھوڑا گاڑی کے خراب ہونے کا اندیشہ بھی تھا۔ پھر ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں راستہ مسدود نہ ہو جائے۔ بارش کی وجہ سے اکثر آبی گذر گاہوں میں پانی معمول سے زیادہ تھا۔ بڑی گزرگاہوں پر تو پل بنے ہوئے تھے لیکن چھوٹی گزرگاہوں کے اندر سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ دو تین موقعوں پر ہمیں گاڑی سے اتر کر پیدل پار جانا پڑا۔ اس مشقت کے سبب میرے زخمی پاؤں میں ہلکی سی تکلیف بھی ہونے لگی تھی۔

جب ہم لکشون کے قریب سے گزرے، رات کا آخری پہر تھا۔ تقریباً دو تین فرلانگ کی دوری پر لکشون گاؤں کی مدھم روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کو دیکھ کر کمپاؤنڈر "لی پیاؤ" اور کھیالان کون وغیرہ کا خیال آیا۔ اس کے علاوہ اس دکھیاری بڑھیا کا خیال بھی آیا

جو سون کی ماں تھی اور اسے سینے سے لگانے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ وہ ایک بار..... بس ایک بار اسے منھ سے باہر دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اسے چند لقمے کھلانا چاہتی تھی۔ کاش ہم وہاں رک سکتے۔ مگر حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس کام کو بے شمار دوسرے کاموں کی طرح ہم نے کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا اور (Maha) کی طرف سفر جاری رکھا۔

دن دس بجے کے لگ بھگ جب ہم "ماہا" کی حدود میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے ہم سانپوں سے بھرے ہوئے جنگل میں سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں پہنچے ہیں۔

ماہا پہنچنے کے بعد سون کے ستے ہوئے چہرے پر تھوڑی سی رونق دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں زندگی ایک نئی ادا سے کروٹ لیتی محسوس ہوتی تھی۔ ہم نے گھوڑا گاڑی کے اندر ہی کھانا کھایا اور پھر بس اڈے پر پہنچ کر بس میں بیٹھ گئے۔ ایک چھوٹے سے چوراہے میں چند لوگ مارشل لا کے خلاف مظاہرہ کرنے میں مصروف تھے۔ بس روانہ ہونے میں تاخیر ہو رہی تھی اور ہماری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ بہر حال آدھ گھنٹے کے اندر اندر بس بنکاک کے لیے روانہ ہو گئی۔ بس کی کھڑکیوں میں ہریالی کے نظاروں نے یورش کر دی۔

اب ہم بنکاک میں تھے۔ایک بار پھر وہی بنکاک، تھائی لینڈ کا دارالحکومت روشنیوں اور رنگوں کا شہر، بے شمار خوبیوں اور خامیوں سے معمور۔اسے وینس آف دی ایسٹ کہا جاتا ہے۔سٹی آف انجلز کہا جاتا ہے۔سیاحوں کی جنت اور پتہ نہیں کیا کیا کہا جاتا ہے۔میرے لیے تو یہ صرف اور صرف سٹی آف سون تھا۔ہاں صرف سون کا شہر۔وہ سون جو کیچڑ میں اگنے والے کنول کی طرح تھی۔اور وہ سون آج بنکاک میں پھر میرے ساتھ تھی۔اپنے پروگرام کے مطابق بنکاک پہنچنے کے بعد ہم نے ایک غیر معروف علاقے میں ہوٹل لیا۔یہاں سیاح کم کم ہی آتے تھے۔یہ بنکاک کا انتہائی مشرقی کونا تھا۔سیروز نامی اس ہوٹل میں رہنے کا فیصلہ ہم نے کوپا میں ہی کر لیا تھا اور ڈاکٹر میوتنگ کو بھی اس بارے میں بتا دیا تھا۔ہوٹل میں ڈبل بیڈ کے ایک کمرے کا کرایہ فقط تین سو بھات تھا۔ہوٹل کے رجسٹر میں ہم نے فرضی نام درج کرائے تھے اور تعلق انڈیا سے ظاہر کیا تھا۔ہوٹل گو نچلے درجے کا تھا مگر صاف ستھرا تھا۔فرش خوب چمکیلے تھے۔ہم نے دو کمرے لیے۔ایک میرے اور سون کے لیے، دوسرا جبار اور حمزہ کے لیے۔میں خود بھی جبار اور حمزہ کے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر سون نے منع کر دیا۔تنہائی سے اسے وحشت ہو رہی تھی۔درحقیقت وہ ابھی تک گروایش کے خوف اور منتھ کے سحر سے آزاد نہیں ہوئی تھی۔ویسے بھی ہمیں یہ کچھ عجیب سا محسوس ہوا کہ سون اکیلی علیحدہ کمرے میں رہے۔

رات کو میں نے قالین پر گدا بچھا لیا۔کھڑکیوں سے باہر بنکاک کی روشنیاں تھیں اور بنکاک کی تیز رفتار ٹریفک کا جانا پہچانا شور تھا۔شوخ لڑکوں کی موٹر سائیکل سوار ٹولیاں فراٹے بھرتی ہوئی کشادہ سڑک پر سے گزرتی تھیں اور فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔میں نے سون کو دوا وغیرہ کھلائی اور پھر رات گئے تک اس سے باتیں کرتا رہا۔میں اس کے ذہن کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔اس کا حوصلہ بندھا رہا تھا۔اس کا بے معنی خوف دور کرنے کی سعی کر رہا تھا۔وہ کبھی رو دیتی تھی۔کبھی دھیان سے میری بات سنتی تھی،

کبھی اس کی آنکھوں میں نئے موسم کی جوت جاگ اٹھتی تھی۔ایسے میں اس کے خوبصورت ہونٹ بھی دمک اٹھتے تھے۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔کتنی دیر تک بڑے دھیان سے میرا چہرہ دیکھتی رہی۔پھر بولی۔"تم کیا ہو ڈاکٹر! تم مجھے کہاں سے کہاں لے آئے ہو۔میں نے تو کبھی واپسی کا سوچا بھی نہیں تھا۔مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں واپس آ چکی ہوں۔خدا کی قسم مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

میں نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبایا۔"تم واپس آ چکی ہو سون اور اب تم پیچھے مڑ کر نہیں دیکھو گی۔تم نے واہموں سے منہ موڑ لیا ہے۔اب تم زندگی کی طرف بڑھو گی۔زندگی جو بہت تلخ بھی ہے اور بہت شیریں بھی۔"

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔اس کی پیشانی کا نشان ٹیوب لائٹ کی روشنی میں چھوٹی سی قوس کی طرح نظر آ رہا تھا۔اس کی غیر معمولی دودھیا جلد پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔وہ بولی۔"ہم کب جا رہے ہیں پاکستان؟"

"مجھے یقین ہے کہ دس روز سے زیادہ نہیں لگیں گے۔بس تمہارا پاسپورٹ تیار ہونے کی دیر ہے۔ڈاکٹر میوتنگ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر تمہارے سفری کاغذات تیار کروا دے گا۔ڈاکٹر میوتنگ اور ہربنس کے تعاون کو میں زندگی بھر بھول نہیں سکوں گا۔"

"اتنے دن ہم یہیں رہیں گے؟"

"ہاں...... یہ ایک غیر معروف ہوٹل ہے اور ہمارے لیے محفوظ جگہ ہے۔"

"کہیں ہم...... میرا مطلب ہے کہیں...... گروجی کے لوگ......" اس نے ڈرے ڈرے انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم بالکل بے فکر رہو۔ایسا کچھ نہیں ہو گا۔"

"تم لوگ...... تم...... میرا مطلب ہے تم تینوں باہر مت نکلنا۔"

"ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں اور مجھے تو بالکل بھی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"میں یہاں تمہارے پاس بیٹھوں گا۔تم سے باتیں کروں گا۔تم کو دیکھوں گا۔"

اس کی دودھیا جلد میں ہلکی سی سرخی دوڑ گئی لیکن چہرے کی سنجیدگی برقرار رہی۔بالوں کی لٹ کو اس نے ہاتھ کی پشت سے پیچھے ہٹایا اور پلکیں جھکائے جھکائے بولی۔"مجھ سے

کوئی توقع مت رکھنا ڈاکٹر...... اور...... میں اس قابل ہوں بھی نہیں...... کہ مجھ سے کوئی توقع رکھی جائے۔"

"توقع رکھنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"مجھے کسی بھی حوالے سے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی کوشش مت کرنا...... مجھ سے کوئی ایسا سوال کرو گے تو اس کا جواب نفی میں ہوگا۔"

پتہ نہیں مجھ میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی تھی۔ میں نے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم سے سوال کرے گا کون یہ غلط فہمی دل سے نکال دو...... تمہیں زبردستی دلہن بناؤں گا۔ اگر زیادہ چیخو چلاؤ گی تو اغوا کر لوں گا...... اور یہ کام بقلم خود کروں گا۔"

اس کی شفاف جلد کے نیچے ایک بار پھر سرخی دوڑی تاہم ہونٹ مضبوطی سے بھینچے رہے۔ سنبھل کر بولی۔ "نہیں ڈاکٹر! ایسا نہیں کہو۔ بس تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دینا۔ میں ابھی بہت کچھ سوچنا چاہتی ہوں...... تم ایسا کرنا...... ایسا کرنا کہ......" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"کیسا کرنا؟"

"کیا وہاں پاکستان میں بھی کوئی ایسا اسپتال ہوگا میرا مطلب ہے جیسا اسپتال ہم نے کوپنا میں دیکھا تھا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہاں نوے فیصد اسپتال ایسے ہی ملیں گے۔"

وہ میرے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "بس مجھے کسی ایسے ہی اسپتال میں نرس کے طور پر بھرتی کروا دینا۔"

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پاکستان پہنچنے کے بعد سوچیں گے۔ فی الحال تو تم ابھی اس وقت ایک جھگڑا نمٹاؤ۔"

"جھگڑا...... کیسا جھگڑا؟" اس کے انداز میں فطری معصومیت تھی۔

"تم مجھے ٹورسٹ کہا کرتی تھیں، اب ڈاکٹر کا خطاب دے رہی ہو۔ مجھے یہ خطاب کسی صورت قبول نہیں۔ تمہیں ٹورسٹ ہی کہنا ہوگا ورنہ......"

"ورنہ کیا......"

"ورنہ تمہیں پتہ ہی ہے کہ میں ارادے کا کتنا پکا ہوں میں باقاعدہ خودکشی بھی کر سکتا ہوں۔"

اس کے ہونٹ بے اختیار مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ "نہیں وہ سب پرانی باتیں ہیں۔" وہ سنبھل کر بولی۔

"میں پرانی باتیں ہی تو دہرانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن میں نہیں۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ تمہیں شادی کے لیے اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ میرے بارے میں سوچ کر اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی میں زہر مت گھولنا۔"

"ہاں...... زندگی میں زہر گھولنے کے لیے ہی تو میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا کہاں سے کہاں تک پہنچا ہوں۔ خبردار سون! کوئی ایسی بات منہ سے مت نکالنا ورنہ جنگ ہو جائے گی۔"

قریباً دس پندرہ منٹ تک اس سلسلے میں ہماری پرزور بحث ہوئی۔ اس بحث کے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو سون کی گفتگو میں بے تکلفی آ گئی۔ دوسرے وہ مجھے ٹورسٹ کہنے پر نیم رضامند ہو گئی۔ جب میرے مجبور کرنے پر اس نے جھینپتے ہوئے انداز میں "ٹورسٹ" کہا تو یہ ادا اتنی پیاری تھی کہ اس کی مٹھاس میرے رگ و پے میں دور تک سرائیت کر گئی۔

❀❀❀

ہم بڑے صوفے پر بیٹھے تھے۔ یہ دوسری منزل کا کمرہ تھا۔ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی ہمارے بائیں جانب تھی۔ یہاں سے جگمگاتے بنکاک کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ سون نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ "کیا ہم...... پگوڈا کے غضب سے بچ سکیں گے؟"

"کیا کہنا چاہتی ہو سون...... میں سمجھا نہیں۔"

وہ بدستور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مٹھ میں پہنچ کر وہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ شاید میں پہلی لڑکی ہوں جس نے ایسا کیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔"

"سون! ہم ان لوگوں کی دسترس سے دور نکل آئے ہیں۔ تم اپنے ننھے سے ذہن کو خوامخواہ پریشان مت کرو۔" میں نے اس کی پیشانی پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔

اس کا موڈ برقرار رہا۔ بولی۔ "مجھے اپنے سے زیادہ تمہاری اور تمہارے دونوں دوستوں کی فکر ہے۔ تم دو طرح سے سنگھ کے مجرم ہو۔ تمہارا پہلا "جرم" یہ ہے کہ تم نے تمام تر مخالفت کے باوجود لڑکے شیلن کو علاج کے لیے باہر بھجوایا ہے اور میرے خیال میں یہ

"جرم" ہی کچھ کم نہیں ہے۔ جب مٹھ میں پتہ چلا ہوگا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے کر فرار ہو گئے ہو تو وہاں قیامت ہی آگئی ہو گی۔ ڈاکٹر ہرنس تو شاید اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بچ جائیں لیکن اگر ہوسنگ اس چکر میں آگئی تو اس پر بڑی سختی ہو گی۔"

"ہوسنگ نے وہاں سے نکلنے میں کوئی مدد نہیں کی۔"

"لیکن وہ جانتی تھی کہ تم کس چکر میں چاتو چانگ لے آئے ہو۔ وہ پھر بھی خاموش رہی۔ نہ صرف خاموش رہی بلکہ پیغام رسانی کرتی رہی اور اس نے ہمیں اپنی سہیلی کے گھر ملایا بھی...... میں...... سچ کہتی ہوں ٹورسٹ! مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ بہت ڈر لگتا ہے۔"

میں نے ایک بار پھر ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "جو پیار کرتے ہیں وہ ڈرتے نہیں۔ اس کا مطلب ہے تم پیار نہیں کرتی ہو۔"

اس نے ایک دم عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ ناقابل فراموش نگاہیں تھیں۔ شفاف آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور ایک حسین شکوہ تھا ایک نہایت دلگداز شکایت تھی۔ برسوں پرانے دکھڑے تھے۔ جو خاموشی کی زبان میں بے پناہ اثر انگیزی کے ساتھ بیان ہو رہے تھے۔ اس کے لب ہلے۔ "تمہیں کیا پتہ ٹورسٹ! تمہیں کچھ پتہ نہیں...... تم کچھ نہیں جانتے۔"

پھر اسے نجانے کیا ہوا اس نے بیٹھے بیٹھے خود کو پہلو کی طرف جھکایا اور اچانک اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔ اس کے ریشمی بال میرے گھٹنوں پر بکھر گئے۔ وہ رونے لگی۔ اس کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں۔ میں نے اسے پیچھے ہٹانا چاہا لیکن وہ نہیں ہٹی۔ بس روتی رہی۔ ان لمحوں میں وہ کسی بچی کی طرح لگ رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں دلاسا دینے والے انداز میں اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ کھڑکیوں سے باہر بنکاک کی پر فسوں رات جگمگاتی رہی۔ گاڑیوں کے ہارن سنائی دیتے رہے۔ ساحلی ہوا کے دوش پر موسیقی کی آواز ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہی۔ معروف گلوکارہ میڈونا اپنا مشہور نغمہ Like A Virgin (ایک کنواری کی مانند) گا رہی تھی۔ اس کی باغی آواز باغی فضاؤں میں گونج رہی تھی...... دلہن کی عصمت کیا ہے...... بس ایک فرسودہ خیال ہے۔

میں بنکاک میں تھا۔ میں سون کے ساتھ گھومنا چاہتا تھا۔ پرانی یادیں تازہ کرنا چاہتا تھا۔ سوئی وانگ روڈ کی گہما گہمی رابنس اسٹور کی رونق، پتایا کا ساحل، بوبے کی مارکیٹ لیکن سون کے ہمراہ یہ یادیں تازہ کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اگلے تین چار دن ہم نے

مکمل طور پر ہوٹل میں بند رہ کر گزارے۔ یہاں کا کھانا بھی بہت اچھا نہیں تھا۔ ہمیں مسلسل ڈبل روٹی انڈے کھانا پڑے تھے یا پھر ایک موٹی بھدی تھائی عورت کے ہاتھ کے بنے ہوئے پیزا تھے۔ ہمیں ڈاکٹر میونگ کی طرف سے رابطے کا شدت سے انتظار تھا۔ یہ بات واضح نہیں تھی کہ ڈاکٹر خود رابطہ کرے گا یا اس کا کوئی دوست ہوگا۔ ان دنوں میں کئی بار میرے ذہن میں مٹھ کے شب و روز کا تصور آیا تھا۔ بنکاک میں آ کر وہ سب کچھ خواب و خیال کی بات لگتی تھی۔ کئی بار میرے ذہن میں بڑے گرو کی شبیہہ بھی آئی، ان کا اجلا چہرہ جیسے، مجھے ڈھارس بندھاتا ہوا محسوس ہوتا۔ جب بھی بڑے گرو کی شبیہہ میرے ذہن میں آتی تھی۔ ان کے خادم خاص کا تصور بھی ذہن میں آ جاتا تھا۔ اس شخص کو میں نے کہیں دیکھا تھا اور ایک بار نہیں کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ذہن پر گرفت نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں خادم خاص کی صورت یاد کر کر کے کئی بار بری طرح الجھ گیا تھا۔

ہمارے کمروں کے ساتھ ہی ایک انگریزی ٹولی کا کمرہ تھا۔ دو عورتیں تھیں دو مرد۔ چاروں ایک ہی کمرہ شیئر کرتے تھے اور قہقہے بکھیرتے تھے۔ دن کے وقت وہ ہمیں اکثر بالکونی میں بیٹھے نظر آتے۔ ان کے لباس نہایت مختصر ہوتے تھے۔ وہ ہر وقت آپس میں بحث کرتے رہتے تھے۔ بحث کرتے وقت ان کے سامنے کوئی نقشہ یا کتاب وغیرہ ہوتی تھی۔ وہ پرفیوم وغیرہ بہت فراوانی سے استعمال کرتے تھے۔ ان کی مصروفیات دیکھ کر چوہدری جبار اکثر ناک بھوں چڑھاتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا۔ "ڈاکٹر باؤ! خشبوئیں لگانے سے کوئی اندر کی بو تھوڑا چلی جاتی ہے۔ کوڑے کرکٹ پر عطر چھڑک دو تو بھی وہ کوڑا ہی رہتا ہے۔"

ایک دن شام کو میں اور سون ہوٹل کی بالکونی میں کھڑے تھے۔ میری رسٹ واچ ساڑھے چھ کا وقت بتا رہی تھی۔ نیچے سڑک پر گاڑیاں خاموشی سے پھسلتی چلی جا رہی تھیں۔ ہمارے سامنے سے دو یورپین گزرے۔ سون کے چہرے پر ان کی نگاہ پڑی۔ سون کو دیکھنے والی نگاہ چند لمحے کے لیے اس کے چہرے پر جم سی جاتی تھی۔ یہ اس کی دلنواز رنگت کا کرشمہ تھا۔

میں نے سون کے چہرے کو محویت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں آنگی بستی میں بوئے کی تقریب یاد ہے ناں؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تم نے مجھے وہاں دیکھا تھا ناں؟" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ "میں کئی دن شب و روز اس الجھن میں مبتلا رہا کہ پتہ نہیں تم نے مجھے دیکھا تھا یا نہیں...... اور یہ کوئی ایک الجھن نہیں تھی سون...... ایسی کئی الجھنیں تھیں...... چار پانچ سال سے میں ایسی ہی الجھنوں میں گرفتار رہا ہوں۔" وہ خاموش رہی اس کے بال لہرا لہرا کر اس کے رخساروں کو چھوتے رہے۔ میں نے کہا۔ "آنگی میں مجھے دیکھنے کے بعد تمہارے دل نے نہیں چاہا کہ میرے بارے میں معلوم کرو؟"

"اوں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ انداز میں ہلکی سی شرارت بھی تھی۔

"اور پھر دوسری مرتبہ تم نے پگوڈا کی سیڑھیوں پر دیکھا تھا۔ بھکشو کی قطار میں چلتے چلتے تم چند سیکنڈ کے لیے رک گئی تھیں۔ یاد ہے ناں؟"

"اوں ہوں۔" اس نے ایک بار پھر انکار میں سر ہلایا۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔

"دیکھو تم نے مجھ سے سچ بولنے کا وعدہ کیا ہے سون!"

"لیکن تم سچ سنو گے تو بولوں گی ناں۔"

"اور سچ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے دو گہری سانسیں لیں پھر ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکا کر بولی۔ "پلیز ٹورسٹ! کچھ عرصے کے لیے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ پلیز...... فی الوقت میرے دل میں بس ایک ہی خواہش ہے۔ یہ خواہش مجھے بڑی پیاری ہو گئی ہے، شاید اس لیے کہ یہ تمہیں بھی پیاری ہے۔ میں وہی کرنا چاہتی ہوں جو تم کر رہے ہو...... اور جو ڈاکٹر ہرنس کوپتا میں کر رہے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کوئی کوپتا جیسا اسپتال ہو جہاں میں دوسروں کے دکھ درد دور کرنے کے لیے دن رات مشقت کروں۔ اتنی مشقت جتنی کسی انسان کے بس میں ہو سکتی ہے۔"

"دیکھو! تم ایک بار پھر انتہا پسندی کا شکار ہو رہی ہو۔ اور اس مرتبہ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ اور اگر کرو گی تو پھر......" میں نے گلا گھونٹنے والے انداز میں دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ وہ مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

اگلے روز دوپہر کے بعد حمزہ اور چوہدری جبار لمبی تان کر سو گئے۔ ہلکے بادل چھائے تھے۔ کہیں قریب ہی بطخیں روسٹ ہو رہی تھیں۔ ان کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سون کچھ اداس، اداس سی بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ "چلو آؤ تمہیں بنکاک کی سیر کراؤں۔"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ہم تو ہوٹل کے مین دروازے تک بھی نہیں جاتے تھے۔ سیر سپاٹا تو دور کی بات تھی۔ میں نے سون کی حیرت دور کرنے کے لیے کہا۔ "ہم یہ سیر باہر نکل کر نہیں کمرے میں بیٹھ کر ہی کریں گے۔"

"وہ کیسے؟" اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ "ایسے۔" میں نے کہتے ہوئے ٹی وی آن کر دیا۔ یہاں "وڈیو کیسٹ پلیئر" موجود تھا اور کچھ کیسٹیں بھی تھیں۔ کل ان میں سے ہی مجھے ایک کیسٹ میں "ڈاکومینٹری" طرز کی ایک فلم ملی تھی۔ یہ فلم غالباً کسی ٹورازم کے ادارے نے بنائی تھی اور بنکاک کے بارے میں تھی۔ میں نے فلم پلے کر دی۔ سون اور میں پاس پاس ہی نیلے قالین پر بیٹھ گئے اور فلم دیکھنے لگے۔ یہ فلم ایک طرح سے سیاحوں کے لیے گائیڈ کا کام بھی کرتی تھی۔ بنکاک کے مختلف مناظر اسکرین پر ابھرنے اور غائب ہونے لگے۔ ہماری کئی بھولی بسری یادیں تازہ ہونے لگیں۔ ساتھ ساتھ تبصرہ کرنے والے کی آواز کانوں میں گونج رہی تھی۔ "تھائی لینڈ کا پہلا نام سیام تھا۔ یہ 1939ء میں تھائی لینڈ کہلایا۔ بنکاک تھائی لینڈ کا دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ہے۔ یہاں ملک کی دس فیصد آبادی رہتی ہے۔ بنکاک سلک اور جم اسٹونز کی خرید و فروخت کے لیے مشہور ہے۔ یہاں نوادرات کے بڑے بڑے تاجر بھی اپنا کاروبار پھیلائے ہوئے ہیں۔"

تبصرہ کرنے والے کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی مگر میں اس آواز سے بیگانہ ہو کر بھولے بسرے مناظر میں اپنی یادیں تلاش کر رہا تھا...... اور شاید...... سون کی بھی یہی کیفیت تھی۔ ہم پتایا کے ساحل پر تھے۔ دور تک گیلی ریت تھی اور لہروں کا مدھم شور تھا...... ہر رنگ و نسل کے سیاح ساحل پر موجود تھے۔ میں سون کا ہاتھ پکڑے ان سیاحوں کے درمیان گھوم رہا تھا اور اپنے قدموں کے نشان تلاش کر رہا تھا۔

پھر ٹی وی اسکرین پر فلوٹنگ مارکیٹ کے مناظر ابھرے...... تقریباً سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا پانچ سال پہلے تھا۔ ایک بے فکرا سفید فام سیاح ناریل کے اندر اسٹرا ڈال کر ناریل کا پانی پی رہا تھا، ایک ٹولی کیلے کھا رہی تھی اور چھلکے ایک دوسرے پر پھینکے جا رہے تھے۔ مجھے اپنا پانچ سال پہلے کا ٹور یاد آ گیا اور چنکی بھی یاد آ گیا جو اس ٹور میں سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہا تھا۔

میں نے ٹی وی دیکھتے دیکھتے کہا۔ "سون! مجھے لگ رہا ہے جیسے چنکی آج بھی یہاں کسی موٹر بوٹ میں موجود ہوگا۔ یہ سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہم نے دیکھا تھا۔"

چنکی کا نام سن کر سون کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہتا تھا اور اگر سپاٹ نہیں ہوتا تھا تو ہو جاتا تھا۔ ایسا دکھائی دینے لگتا تھا کہ وہ اس نام کے کسی شخص کو جانتی ہی نہیں۔ اب بھی چنکی کے نام پر اس کا چہرہ بالکل بے تاثر ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ چنکی کو اور اس سے وابستہ اپنی تمام اذیت کو ذہن سے کھرچ کر پھینک چکی ہے۔ میں نے کہا۔ ''سون! تم نے چنکی کے بارے میں کوئی ایک بات بھی مجھ سے نہیں کی۔''

وہ اسکرین پر نگاہیں جمائے جمائے بولی۔ ''پلیز! تم بھی نہ کرو...... اسے مرے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے میں اسے بھول چکی ہوں۔''

''بہت عرصہ تو نہیں ہوا...... ابھی......''

''نہیں وہ میرے لیے بہت پہلے مر گیا تھا۔'' سون نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''جس دن میں اس کے گھر سے نکل کر مٹھ پہنچی تھی وہ اسی روز مر گیا تھا۔''

اسکرین پر شہر کے خوبصورت مناظر ابھر رہے تھے۔ جلد ہی ان مناظر نے ایک بار پھر ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ شاہ اور ملکہ کا محل دکھایا جا رہا تھا۔ کوئی پرانی فلم تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ شاہی جوڑے کی مصروفیات اسکرین پر ابھر رہی تھیں۔ کمنٹیٹر سیاحوں کے لیے ہدایات جاری کر رہا تھا۔ ''ٹورسٹ کو شاہ معظم اور ملکہ عالیہ کے لیے اچھے خیالات رکھنے چاہئیں۔ اور اسی طرح ان کی اولاد کے بارے میں بھی۔ بدھا کے ٹمپل کا احترام کرنا چاہئے اور بدھا کے مجسمے کا بھی......''

پھر اسکرین پر تھائی لینڈ کے سجے سجائے ہاتھیوں کی قطار نظر آنے لگی۔ یہ ہاتھیوں کا روایتی ڈانس تھا۔ شاہ اور ملکہ بڑی دلچسپی سے یہ ڈانس دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں اٹھے اور بڑے پر وقار انداز میں چلتے ہوئے اسٹیج کی طرف آئے۔ شاہ نے تقریر شروع کی۔ ابھی دو چار الفاظ ہی بولے تھے کہ وڈیو میں خرابی پیدا ہو گئی۔ یہ ریکارڈنگ کی خرابی تھی۔ شاہ کی آواز ایک دم بالکل باریک...... بچے جیسی ہو گئی اور حرکات و سکنات میں بلا کی تیزی آ گئی۔ یہ منظر اتنا مضحکہ خیز تھا کہ نہ چاہنے کے باوجود سون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''سون! تمہارے شاہ تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ رعایا کو خوش رکھنا بہت بڑی نیکی ہے۔''

''دیکھو مذاق مت کرو۔ تم نے ابھی سنا نہیں کہ ٹورسٹ کو شاہ اور ملکہ کے لیے دل میں

احترام رکھنا چاہئے۔''

''میرے خیال میں یہ بات اس شخص کو سمجھائی جانی چاہئے جس نے یہ فلم ریکارڈ کی ہے۔''

فلم چلتی رہی کچھ دیر بعد سینٹر اسٹور کے مناظر اسکرین پر دکھائی دیئے۔ کئی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں۔ کیمرے نے پین کرتے ہوئے ایک چوراہا دکھایا تو سون غیر ارادی طور پر بول اٹھی۔ ''تمہیں یاد ہے ایک رات...... تم اس سڑک پر رکشا سے اترے تھے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اب تو تمہیں بنکاک کے راستوں کی اچھی خاصی پہچان ہو گئی ہے۔''

''ہاں...... ہاں یاد ہے۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے وہ فراڈ بھی یاد آ گیا جو تھائی رکشا والے نے مجھ سے کیا تھا۔ مجھے ایک ہی جگہ پر گھما پھرا کر اس نے سینٹر اسٹور کے سامنے اتار دیا تھا اور ''الو بنانے'' کا معاوضہ کئی بھات وصول کر لیا تھا۔

وہ اسکرین کی طرف پھر انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''اور دیکھو یہ ہے بوبے مارکیٹ اس وقت ہم نے دن کے ٹائم دیکھی تھی، یہ رات کا وقت ہے۔ کتنی بڑی بڑی دکانیں ہیں تمہیں یاد ہے ناں؟''

''ہاں مجھے تو سب کچھ یاد ہے۔ شاید تم کہیں کہیں سے بھولی ہوئی ہو۔'' میں نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے ذرا چونک کر میری طرف دیکھا اور تب اسے احساس ہوا کہ اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اس نے ذرا سا کسمسا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''کیوں کرتی ہو ایسا؟''

''میں نہیں کرتی، تم کرتے ہو۔'' وہ سمٹتے ہوئے بولی۔

''اچھا...... ہاتھ میرے ہاتھ میں رہنے دو۔'' میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پھر تھام لیا۔

اس نے ہاتھ چھڑانے کی ادھوری سی کوشش کی پھر خود کو اسکرین کی طرف متوجہ کر لیا۔ کیمرہ ایک گاڑی میں رکھا تھا۔ جنوبی بنکاک کی ایک صاف ستھری سڑک اسکرین پر تھی۔ کیمرے نے گریٹ بیلٹ پر سیبوں کے بہت سے درخت دکھائے اور پھر پین کرتا ہوا سفید گلابوں سے بھری ہوئی ایک پھلواری پر آ گیا۔ پھلواری کے عقب میں خوبصورت اسٹوپا نظر آ رہا تھا۔ کمنٹری کرنے والا کہہ رہا تھا۔ ''اسٹوپا ایسی جگہوں کو کہا جاتا ہے جہاں بدھا کی راکھ دفن کی گئی ہو۔ پگوڈا اور اسٹوپا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ......'' وہ کمنٹری جاری رکھے

ہوئے تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن ذہن کہیں اور پرواز کر رہا تھا۔ مجھے اسکرین پر نظر آنے والے صرف ان مناظر میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی جن کا تعلق کسی طور پانچ سال پہلے والے ٹور سے تھا۔ سون کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں اس ہاتھ کے لمس کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہا تھا۔ ہاتھ کی ملائمت اس کی حرارت اس کے نشیب و فراز...... اس کا گریز اور پھر ایک دلنواز ڈھیلا پن...... یہ ہاتھ جیسے پورا جسم تھا اور یہ "پورا جسم" میرے پورے جسم سے ہم کلام تھا۔

فلم ختم ہوئی تو سون نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ وہ اٹھ کر دھاری دار نشستوں والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے دودھیا پاؤں نیلے قالین پر دو سفید پرندوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ میں نے کشن سے ٹیک لگاتے ہوئے خود کو نیم دراز کیا اور محویت سے سون کو دیکھنے لگا۔ میری نگاہوں کی تپش محسوس کر کے اس کے چہرے پر رنگ سا گزر جاتا تھا لیکن اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ "گاؤں بہت یاد آتا ہے مجھے۔"

"ہاں...... گاؤں بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہے۔ میں وہاں جتنے دن رہا ہوں مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ تم گاؤں میں نہ ہونے کے باوجود وہاں موجود ہو۔ وہاں کے لوگ تمہاری باتیں کرتے ہیں، تمہیں یاد کرتے ہیں...... اور لوگ ہی نہیں، مجھے تو لگتا ہے کہ وہاں کی گلیاں، درخت اور چشمے بھی تمہیں یاد کرتے ہیں۔ وہاں کی ہر شے پر تمہارا انمٹ نقش ہے۔ تم وہاں اپنی بے شمار ہنستی مسکراتی یادیں چھوڑ آئی ہو۔ گاؤں والے سوچتے ہیں کیا وہ دوبارہ اپنی چہکتی، گنگناتی سون کو دیکھ سکیں گے۔"

"میرا دل بھی بہت چاہتا ہے۔ میں ایک ایک کو دیکھنا چاہتی ہوں، ایک ایک سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ اپنی شادی کے بعد سے میں کبھی لکشون گئی ہی نہیں۔ میں اور لکشون شاید اسی دن بچھڑ گئے تھے جب میری شادی ہوئی تھی۔"

"تم گاؤں میں ایک ایک کو دیکھنا چاہتی ہو۔ ایک ایک سے ملنا چاہتی ہو۔ میں حسرت سے سوچ رہا ہوں کہ کاش میں بھی گاؤں کا باشندہ ہوتا۔"

اس کے آئینہ چہرے پر گلابی رنگ لہرا گیا۔ تاہم اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے بولی۔ "ٹورسٹ! کیا کسی طرح ہم ایک بار گاؤں نہیں جا سکتے اور کچھ نہیں تو میں اپنی امی اور بھابی سے مل لوں۔"

"تم جانتی ہو سون! ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

اس نے تفہیمی انداز میں سر جھکا لیا۔ ایک اداسی سی اس کے خوبرو چہرے پر پھیل گئی کچھ دیر تک کمرے میں بوجھل خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا۔ "سون! ہم پھر آئیں گے ضرور آئیں گے جب بھی حالات بہتر ہوئے ہم رخت سفر باندھ کر یہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر ہم ہر جگہ جائیں گے بلکہ ہم ایک اور کام کریں گے...... ہم ایسا کریں گے کہ انہی دنوں میں آئیں گے جن دنوں میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نومبر کے آخری دن تھے۔ غالباً 26 نومبر تھا...... ہاں ٹھیک ہے، ہم ٹھیک 26 نومبر کو ہی یہاں پہنچیں گے۔ اسی نیوٹروکیڈرو ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ عصمت ہوٹل کے عین سامنے کیا خیال ہے؟"

اس کے ہونٹوں پر غیر محسوس مسکراہٹ کھیل گئی۔

"ایک اور آئیڈیا ذہن میں آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم 26 نومبر کو یہاں پہنچیں گے اور انہی تاریخوں میں انہیں جگہوں پر جائیں گے جہاں 93ء میں گئے تھے۔ مجھے وہ تاریخیں یاد ہیں۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے بھی یاد ہیں۔"

"کیا...... کیا ہے؟" میں نے اسے غیر یقینی نظروں سے دیکھا۔

"سب کچھ یاد ہے۔ 8 دسمبر کو ہم پتایا گئے تھے۔ 9 دسمبر کو فلوٹنگ مارکیٹ...... اور کروکوڈائل فارم...... اگلے دن شام 11 دسمبر کو بوبے مارکیٹ کا چکر لگا تھا۔" اس نے ایک ایک کر کے ساری مصروفیات مجھے گنوا دیں۔

میں سنتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ نجانے کیوں ان لمحوں میں مجھے ایک پنجابی شعر یاد آ رہا تھا۔

لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے
روئے تسی وی او روئے اسی وی ہاں

یعنی آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ تم بھی روتے رہے ہو اور میں بھی روتا رہا ہوں۔

وہ ساری تاریخوں کی ساری تفصیل بتا کر نمناک آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

میرا جی چاہ رہا تھا، اس پاگل سی لڑکی کو اپنے سینے میں چھپا لوں۔ اسے دنیا کے آلام سے چھڑا کر اتنی دور لے جاؤں جہاں میرے اور اس کے سوا اور کوئی نہ ہو۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے، آج یہ طے ہے کہ جب ہم دوبارہ بنکاک میں اتریں گے تو وہ 26 نومبر کا دن ہوگا۔ وہی موسم، وہی دھوپ چھاؤں، وہی راستے۔''

''تم کچھ زیادہ ہی تصورات میں نہیں کھو رہے...... میرا خیال ہے کہ ہمیں کچھ حقیقت پسندی کا ثبوت دینا چاہئے۔''

''اور حقیقت کیا ہے؟''

''دو حقیقتیں ہیں......'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''پہلی تو یہ کہ میں پچھلے پانچ سال کی سب باتیں بھول جانا چاہتی ہوں۔''

''اور یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' میں نے شتابی سے اس کی بات کاٹی۔ ''تم بھولو گی اور نہ میں تمہیں بھولنے دوں گا۔''

وہ میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ''اور دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی تک خطرے سے پوری طرح باہر نہیں آئے ہیں۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ یہ تاخیر ہمارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

''تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوئی جلدی نہیں ہے؟ بھئی ہم تم سے زیادہ عجلت میں ہیں۔ بس ڈاکٹر میونگ سے رابطے کی دیر ہے، جونہی رابطہ ہوا ہم بستر بوریا باندھ کر ''انشا جی اٹھو'' کا الاپ کرنے لگیں گے۔''

''متھ کے لوگ بہت سخت ہیں ٹورسٹ! تم یہاں واپس آنے کی بات کرتے ہو تو مجھے یہ خواب وخیال کی باتیں لگتی ہیں۔ ہمیں...... اتنی جلدی معاف نہیں کیا جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ...... ہم دونوں کی کہانی کی گونج بڑی دور تک جائے گی اور بڑی دیر تک رہے گی۔''

''متھ کی راہبہ اور ایک ٹورسٹ کی کہانی۔'' میں نے کہا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں...... متھ کی راہبہ اور ایک ٹورسٹ کی کہانی۔''

ٹی وی کے درجنوں چینلز میں سے کسی چینل پر کینیا کی موسیقی پیش کی جارہی تھی۔ وہی افریقی موسیقی جس میں تاریک صحرا کی وسعت، ویرانوں کی اداسی اور طلسمات کا لمس محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے، پھر میں نے کہا۔ ''سون! میرے تحفے کہاں ہیں؟''

وہ ایک دم چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کک...... کون سے تحفے؟''

''جو سیام انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر مجھ تک پہنچتے پہنچتے رہ گئے تھے۔''

شکوے کے گہرے سائے نے اس کے نقوش کو ڈھانپ لیا۔ اس نے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانتوں میں دبا کر اپنے کرب کا اظہار کیا۔ ''وہ پیکٹ بڑا عرصہ میرے پاس پڑا رہا۔'' وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''اس میں تمہارے لیے گھڑی تھی، ایک قلم تھا، تمہاری مدر اور فادر کے لیے کپڑے تھے اور اسی طرح کی دو چار چیزیں تھیں بہت عرصہ وہ پیکٹ مجھے رلاتا رہا۔ میرے دل کو کچوکے لگاتا رہا...... پھر......''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر ایک شام جب میں لکشون والے گھر میں اکیلی تھی اور بادل گھر کر آئے ہوئے تھے...... اور...... میری طرف آنے والا رستہ ہزاروں میل تک خالی تھا۔ میں نے...... میں نے وہ سب کچھ جلا دیا...... اور پتہ ہے اس سے اگلے روز کیا ہوا؟'' وہ اشک بار لہجے میں بولی۔

''کیا ہوا؟''

''اس سے اگلے روز میں سب کچھ چھوڑ کر متھ میں چلی گئی۔''

کمرے میں کچھ دیر تک گمبھیر خاموشی رہی اس خاموشی میں بس مدھم آواز میں ایک نغمہ صحرا گونجتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''سون! تم نے متھ کا انتخاب کیوں کیا؟''

''مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس بارے میں، میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔''

میرا جی چاہا کہ اس موقع پر میں سون سے اس واقعے کا ذکر کروں جب میں نے بہروپیے گروایش کی الماری اتفاقاً کھولی تھی۔ اس میں موجود خرافات نے ایش کو منافق اعظم ثابت کیا تھا۔ اور میرے اپنے خیال میں ان خرافات سے بھی بڑا ثبوت گروایش کا وہ دوغلا پن تھا جو سون کے حوالے سے میرے سامنے آیا تھا۔ وہ بدبخت ''عملیات'' اور مقامی طریقہ علاج کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ اپنے طبی نظریات کے خلاف وہ معمولی سے معمولی بات سننا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن اپنی منظور نظر سون کی صحت یابی میں وہ چونکہ مجرمانہ دلچسپی لیتا تھا لہٰذا اس کے لیے وہ چل کر میرے پاس آیا تھا اور بڑی راز داری سے مجھے متھ میں لے گیا تھا۔ اس کی یہی منافقت بعدازاں مکافات کی زد میں آئی تھی اور سون کو اس کی دسترس سے دور لے گئی تھی۔

میں نے یہ بات کہنے کے لیے ہونٹ کھولے لیکن پھر اس کام کو کسی اور وقت کے لیے

چھوڑ دیا۔ میں دکھی سون کو مزید دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جوں جوں دن گزر رہے تھے بھکشوؤں کے حوالے سے ہمارا خوف کم ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارے دل گواہی دینے لگے تھے کہ ہم اس چنگل سے بچ کر نکل جائیں گے۔ ان دنوں میں اس کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہوئی کہ چوہدری جبار ایک قریبی دکان سے سودا سلف لینے گیا اور "سٹریل" دکان دار سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ بہر حال جھگڑے نے سنگین صورتحال اختیار نہیں کی اور وہاں موجود لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ سون میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اس گھٹی گھٹی بھکشن کے اندر سے ایک نئی سون برآمد ہونے لگی تھی۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے رات کا کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ گوشت چھوڑ چکی تھی لیکن ایک روز میں نے اور حمزہ نے بڑے پیار اور اصرار کے ساتھ اسے چکن سوپ پلا دیا۔ بعد میں جب ہم اکیلے تھے وہ روہانسا ہو کر بولی۔ "تم میری ساری قسمیں توڑتے جا رہے ہو ٹورسٹ! پتہ نہیں تم میرے ساتھ کیا کرنے والے ہو۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ اب کسی وقت تھوڑی سی شوخ ہو جاتی تھی۔ اس کی شوخی چونکہ گہری سنجیدگی کے اندر سے پھوٹتی تھی اس لیے بڑی دلنشیں لگتی تھی۔

چوہدری جبار کو وہ "جے بار" یا "مسٹر جے بار" کہہ کر بلاتی تھی۔ اس کا تلفظ ہمیں مسکرانے پر مجبور کر دیتا تھا۔

جے بار یعنی جبار پر اب سب کچھ عیاں ہو چکا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہاں تھائی لینڈ میں صرف شیلین کا معاملہ ہی الجھا ہوا نہیں تھا، کچھ اور "معاملات" بھی حل طلب تھے۔ میرے اور سون کے بارے میں جبار کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ جو معلوم نہیں ہوا تھا وہ میں نے خود بتا دیا تھا۔

جبار نے سب کچھ بڑے تحمل اور ہمدردی سے سنا تھا۔ جبار کے ظرف کی داد دینا پڑتی تھی۔ وہ رخشی کو بہن کہتا تھا۔ وہ میرے اور رخشی کے تعلق کو منطقی انجام تک پہنچتے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب میں پاکستان میں تھا وہ اکثر مجھے اور رخشی کو ہماری متوقع شادی کے حوالے سے چھیڑتا رہتا تھا اور چھیڑ کر بہت خوش بھی ہوتا تھا...... اب وہ مجھے کسی اور ہی رنگ میں رنگا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ سب کچھ بڑی کشادہ دلی اور جرات سے برداشت کیا تھا اور اپنی رائے میری رائے کے ساتھ یوں ملا لی تھی کہ وہ ہماری رائے بن گئی تھی۔ رخشی کے حوالے

سے اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ "ڈاکٹر باؤ! وہ دکھی تو ہو گی لیکن بڑی جلدی سنبھل بھی جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بہت بڑے دل کی مالک ہے۔"

یہ میں بھی جانتا تھا کہ وہ بہت بڑے دل کی مالک ہے لیکن یہ صدمہ بھی تو چھوٹا نہیں تھا...... میں اب تک تصور میں سینکڑوں بار اس کا سامنا کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ چکا تھا۔ ہوٹل میں قیام کے دوران ہی میں نے رخشی کے نام ایک چھوٹا سا خط لکھ دیا تھا۔ اس خط میں، میں نے اسے آنے والے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار کیا تھا۔ میرے دل کے ساتھ جو واردات ہوئی تھی اس کے بارے میں کچھ اشارے میں نے پہلے ہی پوری سچائی کے ساتھ رخشی کو دے دیئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ان اشاروں سے ہی بہت کچھ جان چکی ہو گی۔ اس کے باوجود میں اس کا قصور وار تھا اور اپنے قصور کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے ایک بات خود بخود میرے ذہن میں آ جاتی تھی۔ دو ڈھائی سال پہلے میرے ساتھ رخشی کی منگنی ہوئی تھی۔ منگنی کے بعد بھی ہم معمول کے مطابق ملتے تھے۔ ان دنوں ایک دو بار رخشی نے عجیب سے موڈ میں مجھ سے ایک عجیب سی بات کہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "شاذ! اگر کبھی کسی وجہ سے تم اپنا راستہ بدلنا چاہو تو دل پر کوئی بوجھ لیے بغیر بدل لینا۔ بس مجھے ایک فون کر دینا یا چند سطریں ہی لکھ دینا...... فنش۔"

میں نے کئی بار سوچا تھا۔ رخشی نے یہ بات کیوں کہی تھی؟ شاید اس کے اندر کی کسی حس نے اسے مطلع کر دیا تھا کہ میں مکمل طور پر اس کا نہیں ہوں۔ میرے دل کے نہاں خانوں میں کوئی چور کھڑکی ہے جو کسی انجانی سمت میں کھلتی ہے۔

میں جانتا تھا رخشی نے یہ بات یونہی نہیں کہہ دی تھی اس بات کے پیچھے اس کا تفکر اور اس کا مضبوط ارادہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میرے دل کو کسی حد تک تسلی تھی۔ میرے دل کی آواز تھی کہ رخشی میرے دیئے ہوئے صدمے کو سہہ جائے گی۔ بلکہ وہ کسی حد تک سہہ بھی چکی تھی۔ اس صدمے کو سہنے کے لیے رخشی کے پاس ایک مضبوط سہارا تھا۔ یہ سہارا ایک غیر معمولی "کمٹ منٹ" اور زبردست مصروفیت کی شکل میں تھا۔ وہ دیہی صحت کے حوالے سے اپنی آرگنائزیشن کے کاموں میں اتنی مصروف ہو چکی تھی کہ حالات اور واقعات تا دیر اس کے ذہن میں جکڑ نہیں سکتے تھے۔

سون کے حوالے سے جو دوسری بات ذہن میں آتی تھی وہ "گھر والوں کا ردِ عمل" تھا۔ مجھے اس بات کی کچھ زیادہ فکر نہیں تھی۔ امی کو تو میں نے جو کچھ کہہ دینا تھا۔ انہوں نے آنکھ

بند کر کے مان لینا تھا۔ ابا جان کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ ایک روشن خیال اور انتہائی حساس انسان تھے۔ میں ان کے نظریات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ مجھے کامل یقین تھا کہ پہلی نشست میں ہی انہیں سون کے حوالے سے قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ممکن تھا کہ بھابی جان کو شاک لگتا تاہم بھائی جان کے ذریعے میں بھابی کو بھی منا سکتا تھا......وہ تادیر مجھ سے روٹھی نہیں رہ سکتی تھیں۔

اپنے حالات کے متعلق سوچتے ہوئے قدرت کی نیرنگی کی طرف بھی دھیان جاتا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ چار پانچ سال کے طویل عرصے کے بعد مجھے دوبارہ بنکاک تک لانے والی خود رخشی ہی تھی۔ ڈاکٹر احتشام الدین کے لاہور جانے کے بعد وہ مجھے، حمزہ اور کامران وغیرہ کو پر زور اصرار پر دیہی علاقے سے بنکاک میں لائی تھی۔ وہ ہمیں لانے کی اتنی کوشش نہ کرتی تو شاید میں بنکاک نہ آتا اور بنکاک نہ آتا تو وہ خوابیدہ کہانی پھر سے اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ نہ جاگتی جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا تھا۔

یہ نویں روز کی بات ہے۔ وہ جمعہ کا دن تھا۔ ہمارے ہوٹل کے نزدیک ہی ایک مسجد تھی۔ وہاں باقاعدہ تبلیغ کا کام ہو رہا تھا۔ ہم تینوں نے وہاں جمعہ کی نماز ادا کی۔ ہوٹل واپسی پر ایک اچھی خبر ہماری منتظر تھی۔ ڈاکٹر میونگ کا ایک خاص آدمی ہوٹل میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے پاس سون کا پاسپورٹ موجود تھا۔ جیک نامی اس شخص کے پاس ڈاکٹر میونگ کا ایک دستخط شدہ لیٹر بھی تھا۔ اس لیٹر کی تحریر پر عمل کرتے ہوئے ہم تینوں بھی نے اپنے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات جیک کے حوالے کر دیئے۔ جیک نامی اس شخص سے ''چاتو چانگ لے'' کے کچھ حالات بھی ہمیں معلوم ہوئے۔ وہاں کافی ہلچل تھی۔ پگوڈا کے بڑے گرو واشو جت کی طلبی پر ایک روز ڈاکٹر ہرنس پگوڈا آیا تھا۔ وہاں اس سے چند گھنٹے تک پوچھ گچھ کے بعد اسے واپس بھیج دیا گیا تھا۔ بھکشوؤں کو اس امر کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ شیلن اور اس کے اہل خانہ علاقے میں نہیں ہیں۔ اس کی تلاش میں گروایش وغیرہ نے کافی بھاگ دوڑ کی تھی لیکن مکمل ناکامی ہوئی تھی۔ بس شیلن کے والد کا ایک دور کا رشتے دار بھکشوؤں کے ہاتھ لگا تھا جسے بے دردی سے مار پیٹ کر غصہ نکالنے کی کوشش کی گئی تھی۔
بہر حال شیلن کی تلاش جاری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری تلاش بھی سرگرمی سے ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر میونگ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ بس ایک دو روز میں ملائیشیا کے لیے

روانہ ہونے والا ہے۔

❁❁❁

دو روز بعد ہوٹل میں جیک کا فون آ گیا۔ ہمیں تین روز بعد بروز بدھ شام چھ بجے بنکاک سے لاہور کے لیے روانہ ہو جانا تھا۔ ہمارے کاغذات تیار ہو چکے تھے۔

ایک سنسنی سی رگ و پے میں بھر گئی تھی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں تھائی لینڈ کے دشوار گزار جنگلوں سے بخیریت واپس آ کر اب پاکستان لوٹ رہا ہوں اور بڑے پگوڈا کی اہم ترین راہبہ سون میرے ساتھ ہے...... میں اسے ''بہروپیوں'' کے چنگل سے نکال لایا ہوں (وہ بہروپیے ہی تو تھے، بدھ مت کی مہربان تعلیمات سے کوسوں دور ہونے کے باوجود بھکشو، پروہت اور لاما کہلاتے تھے)

دس پندرہ دن کے اندر ہی سون میں کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ مٹھ کے فرسودہ ماحول کی چھاپ اس پر سے اترنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کا خوف بھی بتدریج کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وہ پاکستان جانے سے پہلے ایک بار اپنی والدہ اور بہنوں سے ملنے کی شدید خواہش رکھتی تھی مگر یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ فی الحال ایسا ممکن نہیں ہے۔ گو ہماری ملاقات ڈاکٹر میونگ کے دوست جیک سے ہو چکی تھی پھر بھی ہمیں اپنے پیچھے مٹھ کے حالات کا مکمل علم نہیں تھا۔ میونگ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ یہاں سب خیریت ہے......اور شیلن اپنی فیملی کے ساتھ بحفاظت کوالالمپور پہنچ چکا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ گروایش اور کشپال کے چیلوں نے ہماری تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

پریشانی اور تناؤ کے ان دنوں میں میں نماز سے سہارا حاصل کرنے لگا تھا۔ میں کمرے کے ایک گوشے میں تہہ شدہ بیڈ شیٹ کو جائے نماز کے طور پر بچھا لیتا۔ سون خاموشی سے مجھے نماز پڑھتے دیکھتی۔ اسے میرے ''کام'' میں دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ پھر ایک روز میں نے نہانے کے بعد باتھ روم کے دروازے کی جھری سے دیکھا۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تربتر تھیں۔ میں نے باہر نکل کر پوچھا۔ ''یہ آنکھوں سے بارش کیوں ہو رہی ہے؟''

''یہ شکریے کی بارش ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

''کس بات کا شکر؟''

''کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔'' اس نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے محبت کا آبشار بہہ رہا تھا۔

جوں جوں روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہماری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ سوموار کے روز ہی ہم نے اپنی پیکنگ شروع کر دی تھی۔ کچھ شاپنگ کرنے کو بھی دل چاہ رہا تھا مگر اس میں رسک تھا۔ اس کام کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا گیا۔ میں سون کو کمرے میں گھومتے پھرتے دیکھتا تھا تو مجھے چار پانچ سال پہلے کی وہی سون یاد آ جاتی تھی جو میرے شانے سے شانہ ملا کر پورے شہر میں گھومی تھی اور جس کی مسکراہٹیں ابھی تک میری آنکھوں میں چمک رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ سون کو کوئی مرض ہے ہی نہیں۔ اور یہ بات حقیقت تھی کہ سون کی تکلیف معمولی نوعیت کی تھی اور اس کی وجہ ہی گھٹن اور حبس تھا جو وہ مختلف شکلوں میں مدت سے جھیل رہی تھی۔ وہ اس گھٹن سے نکلتے ہی ایک دم بھلی چنگی نظر آنے لگی تھی۔

پرانی سون کے حوالے سے مجھے وہ واقعہ اچھی طرح یاد تھا۔ جب میں نے سون کو بیہودہ لباس پہننے سے منع کیا تھا اور وہ اگلے روز اپنے بیہودہ لباس کے اوپر ایک خوبصورت گاؤن پہن آئی تھی۔ اس گاؤن نے اسے پاؤں تک ڈھانپ لیا تھا۔ وہ گاؤن مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اور اس گاؤن سے بھی زیادہ وہ چمکیلا کنگن اچھا لگا تھا جو گاؤن کی کھلی آستین میں سے گاہے گاہے اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ سون کی چمکیلی مسکراہٹوں کی طرح وہ چمکیلا کنگن بھی میرے ذہن پر نقش تھا۔ پچھلے دس پندرہ روز میں میں کئی بار اس گاؤن اور کنگن کا ذکر سون سے کر چکا تھا۔

سون کے حیران کن Complexion کے حوالے سے چوہدری جبار نے سون کو کچ دی کڑی (شیشے کی لڑکی) کہنا شروع کر دیا تھا۔ منگل کی شام کو مجھ سے کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر باؤ! کچ دی کڑی واسطے کوئی تحفہ خرید لو بازار سے اور گھر والوں کے لیے بھی کچھ لے لو۔''

میرا اپنا دل بھی چاہ رہا تھا کہ چند چھوٹی موٹی چیزیں لے لوں۔ حمزہ کی بھی رائے تھی کہ قریبی بازار کا ایک مختصر چکر لگا لیا جائے۔ بہر حال ایک چھوٹی سی شاپنگ کا پروگرام بن گیا۔ یہ شاپنگ ہمیں ہوٹل سیروز کے آس پاس ہی کرنا تھی۔ سون بھی جانا چاہتی تھی مگر ہم نے اسے سمجھا دیا کہ ہمیں زیادہ ریلیکس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ یہیں ہوٹل میں رہے اور اپنی پڑوسن انگریز سہیلی سے گپ شپ لڑائے۔

ہم شام کے وقت نکلے۔ یہ ذرا گنجان آباد علاقہ تھا۔ تاہم ایک دو اچھے شاپنگ پلازہ بھی موجود تھے۔ ایک پلازہ تو بالکل بنکاک کے معروف شاپنگ سینٹر رابنسن اسٹور جیسا تھا، تاہم اس کے مقابلے میں کافی چھوٹا تھا۔ میں وہاں جانا چاہتا تھا، میرا خیال تھا کہ وہاں سے گھر والوں کے لیے کچھ اچھی چیزیں مل سکیں گی اور عین ممکن تھا کہ اس ٹائپ کا گاؤن بھی مل جاتا جو پچھلی مرتبہ سون نے پہنا تھا۔ چند دکانیں گھومنے کے بعد جبار اور حمزہ علیحدہ ہو گئے جبکہ میں اس شاپنگ پلازہ کی طرف بڑھ گیا۔ پلازہ تک جانے کیلئے میں نے ایک سڑک عبور کی۔ سڑک پر ایک مساج گھر کے عین نیچے سائن بورڈ لگا تھا اور اس پر سڑک کا نام لکھا تھا ''سوئی وانگ روڈ'' سڑک کے نام پر وہ چوراہا یاد آ گیا جس کے پاس ہی نیوٹرو کیڈرو ہوٹل اور عصمت ریسٹورنٹ وغیرہ تھے۔ وہاں میری کئی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اگر میں اس سڑک پر پانچ چھ کلومیٹر تک جاتا تو سیدھا عصمت ہوٹل پہنچ جاتا۔ وہاں میں روایتی پاکستانی کھانوں کی خوشبو سونگھ سکتا تھا۔ ہوٹل کے مالک نوید سے مل سکتا تھا اور اس کے ہر دلعزیز بچے کو پیار کر سکتا تھا۔ بہر حال اس طرح کی کئی خواہشیں مجھے فی الحال دبانا پڑ رہی تھیں۔ جونہی میں نے سڑک پار کی بنکاک کے گلی کوچوں میں گھومنے والے سینکڑوں ''ایجنٹوں'' میں سے ایک ایجنٹ میرے سامنے آ گیا۔ ''بیوٹی فل گرل سر! وری اسمارٹ...... وری لوریٹ صاحب......'' اس نے ہر عمر اور جسامت کی لڑکیوں کی تصویروں سے سجا ہوا البم میرے ساتھ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے میرے ذہن میں وہ موٹا گنجا دلال آ گیا جو ہوٹل نیوٹرو کیڈرو کے سامنے اکثر ایک کھمبے کے نیچے کھڑا ملتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں جھما کا سا ہوا اور میں جیسے چکرا کر رہ گیا۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ میرے ذہن میں کھلبلی سی مچ گئی۔ قریب ہی فٹ پاتھ پر اسٹیل کا بینچ تھا۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور اپنے چکرائے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ بات بالآخر میرے ذہن کی گرفت میں آ گئی تھی جو پچھلے کئی دنوں سے پھسل پھسل جا رہی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ پگوڈا کے بڑے گرو کے سنجیدہ صورت خادم خاص کی شکل اور آواز کس شخص سے ملتی تھی۔ اس کی شکل ہو بہو...... ہاں ہو بہو اس موٹے گنجے دلال سے ملتی تھی جو پانچ سال پہلے سڑک کے کنارے ہماری ''خدمت'' کے لیے مستعد نظر آیا کرتا تھا۔ میں سوچتا رہا اور حیرانی کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ مجھے دلال اور خادم خاص کے چہرے کی ایک ایک تفصیل یاد آنے لگی۔ ٹھوڑی کی بناوٹ...... پیشانی، کان کے

قریب چھوتا سامنا، خادم خاص کو اگر تھوڑا سا موٹا کر دیا جاتا، اس کے منڈے ہوئے سر پر بال لگا دیئے جاتے اور گیروا کپڑوں کی جگہ اسے پینٹ اور ہاف سیلو شرٹ پہنا دی جاتی تو وہ سو فیصد کھمبے کے نیچے والا آدمی تھا۔ میں سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ کیا واقعی ایسا ہوتا ہے ایک بدترین شخص ایک بزرگ شخص کا معتقد خاص بن چکا تھا۔ بڑے گرو کے چہرے پر جو متانت اور روشنی نظر آرہی تھی، وہی منفرد کیفیت اس خادم خاص کے چہرے پر بھی جھلک رہی تھی۔ درحقیقت بڑے گرو اور ان کا خادم خاص ان معدودے چند بدھسٹ میں سے تھے جو مجھے علاقے کے عام بھکشوؤں سے مختلف دکھائی دیئے تھے۔ یہ اندرونی سچائی کا اجلا پن تھا جو انہیں دوسرے لوگوں سے مختلف بناتا تھا۔ میں خادم خاص کا چہرہ یاد کرتا رہا اور میرا یہ یقین پختہ ہوتا رہا کہ وہ ''نیک صورت'' شخص وہی کھمبے کے نیچے والا آدمی تھا۔ پانچ سال پہلے ہونے والی کسی کایا پلٹ نے اسے کھمبے کے نیچے سے برگد کے نیچے پہنچا دیا تھا۔ کھمبے سے برگد تک کا سفر دو انتہاؤں کا سفر ہی تو تھا۔

اچانک میں چونک گیا۔ میں سرِ راہ بیٹھا تھا۔ میرا یوں بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ دلال اور خادم خاص والی اس گتھی کو سلجھاتا ہوا شاپنگ پلازہ کی طرف بڑھنے لگا۔ شام دھیرے دھیرے بنکاک کو ''جگمگاتی روشنیوں'' کے سپرد کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے چھتریوں کے نیچے خوانچہ فروش اپنی خوبصورت ہتھ ریڑھیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ موٹر سائیکل سوار نوجوان ادھر ادھر چکراتے پھرتے تھے۔ آدھی آستین کی قمیض اتنی عام ہے کہ پوری آستین کہیں دکھائی نہیں دیتی...... میں شاپنگ پلازہ میں پہنچ گیا۔ وہاں خرید و فروخت کی گہما گہمی نے وقتی طور پر میرا دھیان شیطان اور سادھو والی گتھی کی طرف سے ہٹا دیا۔ برقی سیڑھیاں گردش میں تھیں۔ خریدار بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ چوہدری جبار ساتھ ہوتا تو وہ ان ''توجہ طلب'' نسوانی مجسموں پر دلچسپ تبصرے ضرور کرتا جو یہاں بیسیوں کی تعداد میں موجود تھے۔ میں نے سیکنڈ فلور پر کچھ خریداری کی۔ والد، والدہ اور بھائی، بھابی کے لیے کچھ چیزیں لیں۔ پھر میری نظر گارمنٹس کی ایک شاپ پر پڑی۔ وہاں میں اپنے مطلوبہ ''گاؤنز'' کی رینج دیکھ کر خوش ہو گیا۔ سون کا سراپا ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اس کے لیے کریم کلر کا ایک خوبصورت گاؤن خریدا۔ گاؤن پیک کرانے کے بعد میں اپنے دو بھتیجوں کے لیے کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا جب اچانک میری نگاہ نیچے گراؤنڈ فلور پر گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ وہاں سون موجود تھی۔ اس کی بغل میں ایک مستطیل ڈبا تھا۔ اس ڈبے میں

مردانہ شلوار قمیض تھی۔ یہ خریداری سون نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ خریداری میرے لیے ہے۔ وہ آج صبح ہی میرے کپڑوں کو تنقیدی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ قمیض کے قدرے بوسیدہ کالر کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ فی الوقت سون جم اسٹونز اور جیولری کی ایک دکان پر کھڑی تھی۔ سیلز گرل نے اس کے سامنے شوکیس پر دس پندرہ طرح کے کنگن رکھے تھے۔ وہ اپنے لیے ایک کنگن پسند کر رہی تھی۔ چاندی کا ویسا ہی کنگن جو میں اس کی بلوریں کلائی پر دیکھا کرتا تھا اور جس کی تعریف میں نے کئی بار کی تھی۔ مجھے سون پر ہلکا سا غصہ تو آیا کہ وہ کیوں اس طرح باہر نکل آئی ہے۔ لیکن جلد ہی اس غصے کو پیار کی لہر نے دبا لیا۔ وہ میری خوشی کے لیے تو نکلی تھی۔ اور ہوٹل سے زیادہ دور بھی نہیں آئی تھی۔ میں ریلنگ کے قریب سے محتاط انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ سون نے ایک ہو بہو ویسا ہی کنگن پسند کیا جو وہ پانچ سال پہلے پہنتی تھی۔ کنگن اپنی دبلی پتلی کلائی میں ڈال کر اس نے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ بازو کو آگے پیچھے جھلا کر کنگن کو حرکت دی۔ میں نے اس کے حسین ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ ابھرتے دیکھی۔

کنگن کی ادائیگی کر کے سون بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے پہلے تو اسے پکارنے کا ارادہ کیا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ کچھ فاصلہ رکھ کر میں بھی سون کے پیچھے ہی اسٹور سے باہر نکل آیا۔ اب رات کے نو بج چکے تھے۔ کھانا کھانے والے سڑکوں کے کنارے میز کرسیاں سجائے بیٹھے تھے اور ''کھا، پی'' رہے تھے۔ گیروے کپڑوں والا ایک بھکشو کولڈ کارنر پر کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر سڑک پار کر گیا۔ ہوٹل پیروز بمشکل ایک فرلانگ کی دوری پر تھا۔ بڑی سڑک سے گزرنے کے بجائے سون نے ذیلی سڑک سے جانا مناسب سمجھا۔ یہ سڑک بلند عمارتوں کے عقب سے گزرتی تھی۔ یہاں اکا دکا لوگ ہی نظر آرہے تھے۔ میرے اور سون کے درمیان بس تیس چالیس گز کا فاصلہ ہو گا۔ اچانک ایک موڑ سے ایک تیز رفتار کار برآمد ہوئی۔ وہ تیزی سے لہراتی ہوئی سون کی طرف بڑھی۔ کالے رنگ کی کار کی نمبر پلیٹ سفیدی مائل تھی۔ کار سون سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر ہو گی جب دفعتاً مجھے شدید ترین خطرے کا احساس ہوا۔ میں اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔ ''سون......'' میرے حلق سے یہ آواز ایک چیخ کی صورت میں نکلی۔ مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ کار بری طرح لہرائی۔ اس کے دونوں بائیں پہیے فٹ پاتھ پر چڑھ گئے۔ میں نے سون کو گھومتے ہوئے دیکھا۔ پھر کار کا لوہا نرم و نازک سون سے ٹکرایا وہ ہوا میں

اچھلی اور دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ میں اس منظر کا آخری حصہ نہیں دیکھ پایا کیونکہ میرے دونوں ہاتھ میری آنکھوں پر تھے شاپرز میرے ہاتھ سے چھوٹ چکے تھے۔ میں شاپرز کو روندتا ہوا سون کی طرف لپکا۔ میری ٹانگیں جیسے بے جان ہو چکی تھیں۔ میری نگاہ اوجھل ہوتی ہوئی کار کی نمبر پلیٹ پر پڑی۔ میں نمبر کا صرف داہنے والا حصہ پڑھ سکا۔ 2046 تمیں چالیس گز کا درمیانی فاصلہ میں نے کس طرح طے کیا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے سون کو لہو میں لت پت فٹ پاتھ پر پڑے دیکھا۔

''سون...... سون!'' میں نے چیختے ہوئے اسے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ سکتہ زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا جوڑا اس نے چاؤ سے خریدا تھا۔ وہ ڈبے سے نکل کر سڑک کے کنارے آلودہ پانی میں پڑا تھا۔ چند مزید افراد بھی دوڑتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ سون کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پہلو کی طرف سے اس کی قمیض پھٹی ہوئی تھی اور وہاں بھی زخم تھا۔ مجھے پہچان کر سون کی آنکھیں نیم وا ہونے لگیں۔ ''سون...... ہوش کرو سون۔'' میں نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی مضبوطی کے ساتھ مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ ایسے میں ایک خدا ترس شخص اپنی کار ہمارے قریب لایا۔ میں نے سون کو اٹھایا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ کسی نے میرے شاپرز گاڑی میں رکھ دیے، کسی نے سون کے سینڈل گاڑی میں پہنچا دیے۔ ایک سردار جی ہمارے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی چلانے والے صاحب بڑی تیز رفتاری سے قریبی اسپتال کی طرف لپکے۔ اردگرد کی ہر شے میری نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔

سون میرے ساتھ چمٹ کر رہ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ میرے ہی جسم کا ایک خونچکاں حصہ ہے۔ سردار جی نے گاڑی کی اندرونی روشنی جلائی تو سون کے کئی زخم ہمیں دکھائی دینے لگے۔ دائیں پہلو کا زخم بھی مسلسل خون اگل رہا تھا۔ اس خون کی گرمی اور نمی میں اپنے گھٹنوں پر محسوس کر رہا تھا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے اور ہاتھ پاؤں تو جیسے سن ہو گئے تھے۔

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''کچھ نہیں ہوا سون! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ معمولی زخم آئے ہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

ڈاکٹر ہونے کے باوجود مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں غلط کہہ رہا ہوں یا درست۔ سون کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا سر تھوڑا سا اونچا کر دیا۔

''پلیز...... گاڑی ذرا تیز چلائیں۔'' میں نے کراہ کر کہا۔

میرا ہاتھ تسلی آمیز انداز میں مسلسل سون کے خون آلود بالوں پر حرکت کر رہا تھا۔ سون کا ایک ہاتھ میرے کندھے پر تھا اس کی نازک کلائی میں چاندی کا کنگن چمک رہا تھا مگر اس کی زندگی کی چمک شاید ماند پڑ رہی تھی۔ پھر مجھے لگا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ وہ اپنے سر کو اوپر کی طرف حرکت دے رہی تھی۔ میں اس کی طرف جھک گیا...... ''کیا بات ہے سون...... کیا بات ہے۔'' میں نے دلار سے کہا۔

اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی لیکن وہ بولی نہیں۔ میں کچھ اور جھک گیا۔ میرا دھیان اس کے ہونٹوں کی جانب تھا۔ ''کیا کہنا ہے سون! میں سن رہا ہوں۔''

اس نے ہونٹوں کو جنبش دی اور سر کو اوپر اٹھایا لیکن آواز اس کے ہونٹوں کی فصیل کے اندر ہی رہی۔

گاڑی اسپتال کے کمپاؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ پلک جھپکتے میں ایک اسٹریچر گاڑی کے ساتھ آ لگا۔ میں نے سون کو اٹھا کر اسٹریچر پر لٹانا چاہا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے مجھ سے چمٹی رہی۔ ہم اسی طرح اسے ایمرجنسی میں لے گئے۔ میں نے اسے سفید اجلے بستر پر لٹایا۔ اجلی لڑکی...... اجلے بستر پر تھی۔ ڈاکٹروں اور نرسوں نے سون کو گھیر لیا۔ اس کا ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ ''تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی سون!'' میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

''مجھے...... چھوڑ کر نہ جاؤ۔'' اس کے ہونٹوں سے مدہم آواز نکلی۔

''میں یہیں ہوں...... تمہارے پاس ہوں...... ہم سب یہیں ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر باہر نکل آیا۔ اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے بمشکل پبلک بوتھ سے ہوٹل سیروز فون کیا اور حمزہ وغیرہ کو اس حادثے کی اطلاع دی۔

آدھ گھنٹے میں حمزہ، جبار اور ہوٹل کا منیجر میرے پاس اسپتال پہنچ گئے۔ انہیں قریب پا کر میرے ضبط کے بند حسن ٹوٹ گئے۔ آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ حمزہ اور جبار مجھے تسلی دے رہے تھے اور انہیں خود بھی تسلی کی ضرورت تھی۔ اندر سے کچھ خبر نہیں آ رہی تھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد ہوٹل کا منیجر وانگ یہ اطلاع لے کر آیا کہ سون کو آپریشن تھیٹر لے

جایا جا رہا ہے۔ اس نے محتاط الفاظ میں ہمیں آگاہ کیا کہ سون کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں اور یہ چوٹ اس کی زندگی کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

وانگ کے ہاتھ میں سون کا کنگن تھا۔ آپریشن تھیٹر لے جانے سے پہلے یہ کنگن اتار دیا گیا تھا۔ وانگ نے کنگن مجھے تھما دیا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں...... میں کنگن کو پکڑے سکتے کی حالت میں بیٹھا تھا اور آنکھوں میں ایکسیڈنٹ کے مناظر گھوم رہے تھے۔ اس امر میں ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ اتفاقیہ حادثہ نہیں تھا۔ سون کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نشانہ بنایا گیا تھا۔ میں نے گاڑی کی جو جھلک دیکھی تھی، اس میں مجھے "منڈے ہوئے سر بھی دکھائی دیئے تھے۔ یہ سر یقیناً بھکشوؤں کے تھے یا کٹر قسم کے بدھسٹ کے......

آپریشن طویل ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارا ایک ایک لمحہ سولی پر گزر رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دل لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ ہونٹوں پر دعائیں تھیں اور گناہوں کی معافی کی التجائیں تھیں۔ اسی اثنا میں خبر ملی کہ اسے آپریشن تھیٹر سے نکال کر آئی سی یو میں لے جایا گیا ہے...... اضطراب میں قدرے کمی واقع ہوئی...... تاہم ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ پتہ چلا کہ وہ دوبارہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اطلاعات کے مطابق اس کی ٹوٹی ہوئی پسلیاں اس کے ایک پھیپھڑے میں گھس گئی تھیں اور اندر ہی اندر بلیڈنگ ہو رہی تھی۔ اس سنگین زخم کے علاوہ بھی اس کے سر اور ٹانگوں پر گہرے زخم آئے تھے۔

رات ایک پہاڑ بن گئی تھی اور سرک نہیں رہی تھی۔ سون کے کنگن پر خون کے داغ تھے۔ میں نے داغ دھو کر کنگن رومال میں لپیٹ لیا تھا اور اسے یوں مٹھی میں دبا رکھا تھا جیسے ڈوبنے والا تنکے کا سہارا لیتا ہے۔ رات کے آخری پہر حمزہ نے کوشش کر کے مجھے سکون بخش دوا دے دی۔ میری بہتری کے لیے اس نے ہوشیاری یہ کی کہ ڈوز کو ڈبل کر دیا یا شاید ڈبل سے بھی کچھ زیادہ۔ میں بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ بعد ازاں گہری غنودگی کی حالت میں ہی اس نے مجھے نیند کی ایک گولی بھی دے دی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس امر کا پتہ تو مجھے بعد میں چلا کہ نیند کی حالت میں ہی حمزہ نے مجھے کچھ خواب آور دوا انجیکٹ بھی کی تھی۔ میرے دوست نہیں چاہتے تھے کہ میں بیدار رہوں...... بیداری میری اور ان کی مشکلات میں اضافہ کر سکتی تھی۔ میں ان حالات سے بے خبر ہی رہتا تو بہتر تھا۔ جو میرے اردگرد موجود تھے۔

میں دواؤں کے زیرِ اثر مسلسل گہری نیند میں تھا۔ بہت گہری نیند تھی۔ اس کے باوجود ذہن میں کہیں یہ احساس موجود تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو چکا ہے۔ سون کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ وہ بہت نازک حالت میں ہے یا پھر...... اس کے آگے سوچتے ہوئے ذہن ماؤف ہو جاتا تھا۔

پتہ نہیں کہ وہ کون سا وقت تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کون سی جگہ تھی۔ بس یہ احساس تھا کہ میں شدید غنودگی میں ہوں اور میرے آس پاس کہیں چوہدری جبار اور حمزہ کی آواز آ رہی ہے۔ میں چکرائے ہوئے ذہن اور دھندلائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر میں نے حلق کو پوری قوت سے کھول کر چنگھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ "تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو...... مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو...... کہاں ہے سون؟ کیا وہ مر گئی ہے...... کیا وہ مر گئی ہے؟"

الفاظ میری زبان سے یوں ادا ہو رہے تھے جیسے خود بخود پھسل رہے ہوں۔ میں جس، چیز پر لیٹا تھا میں نے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر کسی نے میرے سینے پر دباؤ ڈال کر مجھے پھر سے لٹا دیا تھا۔ میرے بازو پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا تھا اور میں ایک بار پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا...... پھر نجانے کتنی دیر بعد دوبارہ میرے ذہن سے غنودگی کے دبیز بادل چھٹے تھے۔ مجھے لگا تھا جیسے میں کسی آرام دہ بستر پر لیٹا ہوں۔ مجھے ایک چھت نظر آئی تھی جیسے کوئی لگژری فلائنگ کوچ ہو یا جہاز ہو۔ میری دائیں جانب کھڑکیوں کی قطار تھی۔ یہ سب کچھ گہری دھندلاہٹ میں لپٹا ہوا تھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا تھا کہ سون زندہ نہیں ہے۔ اگر سون زندہ ہوتی تو پھر میں اس عجیب و غریب عالم میں کیوں ہوتا۔ مجھے کہیں اپنے پاس ہی حمزہ کی مدھم آواز سنائی دی۔ یہ آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔ حمزہ کا چہرہ بھی صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بے پناہ کرب کے عالم میں میرے ہونٹ ہلے تھے۔ میرے کانوں نے میری آواز سنی۔ میں کہہ رہا تھا۔ "تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ وہ مر چکی ہے۔ خدا کے لیے مجھے بتا دو۔"

یہ الفاظ میں بار بار دہرا رہا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر...... پتہ نہیں کتنی بار۔ پھر دوبارہ میرا ذہن غنودگی کے عمیق سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ یہ بڑی طویل اور گہری غنودگی تھی لیکن کبھی کبھی اس میں ایسے وقفے بھی آتے تھے جن میں غنودگی کی شدت کم ہوتی تھی۔ ایک ایسے ہی وقفے میں، مجھے محسوس ہوا کہ میں وہیل چیئر پر کسی ایئرپورٹ سے باہر آ رہا ہوں۔ پھر

ایک وقفے میں، میں نے خود کو بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ مجھے جو چھت نظر آئی وہ میری دیکھی بھالی تھی۔ شاید میرے اپنے گھر کی چھت تھی۔ میرے کانوں میں والدہ کی مہربان آواز بھی گونجی۔

پھر یوں ہوا کہ کم غنودگی والے یہ وقفے آہستہ آہستہ طویل ہونے لگے۔ میں اپنے گردو پیش کو زیادہ بہتر طور سے محسوس کرنے لگا۔ مجھے معلوم ہوا کہ میں اپنے گھر میں ہوں۔ میں نے اپنی والدہ، والد، بھائی اور بھابی کے چہرے دیکھے اور ان کی تسلی آمیز باتیں سنیں۔

وہ غالباً دوپہر کا وقت تھا۔ میرے گھر کے نیلگوں پردوں سے باہر سبز لان پر سورج چمک رہا تھا۔ میں نے حمزہ کو اپنے سامنے دیکھا۔ کمرے میں اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اب تک میرا دل مسلسل روتا رہا تھا۔ حمزہ کو دیکھ کر آنکھیں بھی برسنے لگیں۔ میں نے حمزہ کا بازو تھامتے ہوئے پوچھا۔ ”حمزہ کب مری وہ؟“

”اسی رات...... صبح چھ بجے۔“ حمزہ نے گمبھیر آواز میں کہا۔

کتنی ہی دیر فضا میں سکتہ طاری رہا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ”آخری وقت اس نے کوئی بات کی...... کچھ کہا؟“

”نہیں شاد! آپریشن تھیٹر میں جانے کے بعد وہ ہوش میں ہی نہیں آئی۔ ڈاکٹروں نے پانچ بجے ہی بتا دیا تھا کہ اس کا چانس بہت کم ہے۔ چھ بجے کے قریب وہ ایکسپائر ہو گئی۔ بدھ کی شام...... جس وقت ہمیں لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا، سون کی آخری رسومات ادا ہو رہی تھیں۔“

میرے حلق میں نمکین آنسوؤں کا ایک آبشار گر رہا تھا۔ ”آج کیا دن ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہفتہ۔“ حمزہ نے جواب دیا۔ ”سون کو ہم سے جدا ہوئے چار دن ہو چکے ہیں۔“

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں سے نکلنے والا گرم پانی چہرے پر رینگتا رہا۔ سینے میں شعلے دہکتے رہے۔ دور کسی ساحل پر ناریل اور پام کے درختوں تلے سون ننگے پاؤں بھاگتی رہی۔ اس کے ریشمی بال لہراتے رہے۔ اس کے قہقہے لہروں کے شور میں جذب ہوتے رہے۔ ایک کنگن میری آنکھوں میں چمکتا رہا۔ ہاں مرنے سے چند گھنٹے پہلے اس نے یہ کنگن میرے لیے ہی تو پہنا تھا...... اور وہ میرا سوٹ جو سون کے گرنے کے بعد سڑک کنارے گندے پانی میں لتھڑ گیا تھا اور وہ گاؤن نما لبادہ جسے پہن کر سون کو لاہور آنا تھا۔

وہ سب کچھ اور اس کے علاوہ بہت کچھ نجانے کہاں کھو گیا تھا...... کتنی جلدی شروع ہو کر کتنی جلدی ختم ہوئے تھے، سارے معاملات...... سون واہموں کی دنیا سے حقیقتوں کی دنیا کی طرف آئی تھی اور حقیقتیں تلخ ہوتی ہیں۔ حقیقتوں کی طرف لوٹنے کی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ اور سون نے چکائی تھی۔ ان لوگوں نے جنہوں نے اپنے چہرے پر بھکشوؤں کے چہرے سجا رکھے تھے سون کو مار ڈالا تھا۔ میں نے کچھ اور لوگوں کو کہتے سنا تھا کہ شاید یہ حادثہ ہے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ حادثہ نہیں ہے۔ یہ سون کا قتل تھا جو مذہب کے ٹھیکیداروں نے کیا تھا۔ یہ سچائی کا قتل تھا جو دقیانوسیت کے ہاتھوں ہوا تھا...... اور دقیانوسیت کے ہزاروں رنگ ہیں۔ کبھی یہ وڈے سائیں اور پیر جی کی شکل میں نظر آتی ہے اور شہناز کی جان لیتی ہے، کبھی یہ چھاتی کے کینسر کا علاج اپلوں کی راکھ سے کرتی ہے اور ملائی مریضہ کو دھیرے دھیرے موت کے منہ میں پہنچاتی ہے۔ کبھی یہ گرو ایش اور گرو کشپال کے تالاب میں دکھائی دیتی ہے اور سون کی حسرت ناک موت کا سبب بنتی ہے۔ یہ دقیانوسیت اور جاہلیت ٹونے ٹوٹکوں میں گھسی ہوئی ہے، تعویذ گنڈوں میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ نوسر بازوں اور شعبدے بازوں کا ہتھیار ہے۔ یہ عطائی معالجوں اور روحانی عاملوں کا روزگار ہے۔ ہمارے دیہی علاقے اور مضافات اس کینسر کی زد میں ہیں اور اربابِ اختیار کی چشم پوشیوں سے یہ کینسر پھیلتا جا رہا ہے۔ ہاں...... میری سون کو بھی اسی دقیانوسیت نے قتل کیا تھا۔

وقت مرہم ہے اور یہ مرہم مجھ پر بھی اثر کر رہا تھا لیکن میری آنکھوں میں اتنا پانی نجانے کہاں سے آ گیا تھا کہ سوکھتا ہی نہیں تھا۔ تین چار دن بعد حمزہ اور جبار نے مجھے بتایا حادثے کی رات آخری پہر اسپتال کے برآمدے میں، میں اچانک گہری غنودگی سے بیدار ہو گیا تھا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو بازو سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑا تھا اور کہا تھا کہ وہ لوگ ہمیں دھوکے میں کیوں رکھ رہے ہیں...... اگر سون زندہ نہیں ہے تو ہمیں بتاتے کیوں نہیں ہیں۔ جبار کے مطابق قریباً یہی وہ وقت تھا جب پندرہ بیس گز دور آپریشن تھیٹر میں سون نے دم توڑا تھا۔

تب میری ہیجانی حالت دیکھ کر حمزہ نے ایک مقامی ڈاکٹر سے مشورہ کیا تھا اور مجھے مزید ٹرنکولائزر دے دیا تھا...... یہ سلسلہ اگلے دو تین دن تک جاری رہا تھا کیونکہ آثار سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں ہوش میں آ کر شدید ہیجان کا شکار ہو جاؤں گا۔ حمزہ اور جبار وغیرہ کو میری جان کی طرف سے شدید خطرہ لاحق تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ”چاتو چانگ لے“ کے

بچھڑے ہوئے بھگشو آس پاس موجود ہوں گے۔ اور وہ کسی بھی وقت میری زندگی کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ (غالباً انہیں موقع نہیں ملا تھا ورنہ وہ ایک ہی وار میں مجھے اور سون دونوں کو ختم کرتے۔)

مجھے بطور مریض پی آئی اے کی بزنس کلاس میں سفر کرایا گیا تھا۔ دورانِ سفر میری نشست نے بستر کی شکل اختیار کیے رکھی تھی۔ ڈاکٹر حمزہ اپنے میڈیکل باکس کے ساتھ ہمہ وقت میرے سرہانے موجود رہا تھا۔ جہاز میں موجود ایک ڈاکٹر رحمانی صاحب نے بھی میری دیکھ بھال کی تھی۔

❁❁❁

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کا مرہم ہے۔ لیکن کچھ زخم تو ناسور ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہونے میں نہیں آتے۔ سون کا غم بھی ایسا ہی زخم ہے ان واقعات کو اب قریباً تین برس ہو چکے ہیں۔ وقت بہت آگے نکل چکا ہے لیکن میں ابھی تک اسی جگہ کھڑا ہوں، سون کو بنکاک میں گھومتے پھرتے دیکھ رہا ہوں۔ اس کی مسکراہٹیں دیکھ رہا ہوں، اس کا کنگن میری آنکھوں میں چمک رہا ہے۔

ہاں وہ کنگن ابھی تک میرے پاس ہے اور میرے عزیز ترین اثاثوں میں سے ہے۔ یہ سون کا کنگن ہے۔ لیکن کسی وقت یہ خود سون بن جاتا ہے۔ یہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔ گزرے وقتوں کی کتھا سناتا ہے۔ یہ سون کی شکل میں بولتا ہے۔ ''ٹورسٹ! ہم دونوں دو مختلف خطوں کے باسی تھے۔ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہم ایک دوسرے کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر ہم ملے، تم نے بڑی خاموشی سے مجھے بدل دیا۔ میں اپنی جان پر ہزار ستم سہہ گئی لیکن تمہارا انتظار کرتی رہی۔ انتظار اور فقط انتظار...... میں سر سے پاؤں تک انتظار تھی ٹورسٹ! میرے جسم کے ہر روئیں سے آواز آیا کرتی تھی۔ کہ تم آؤ گے...... اور تم آئے بھی...... لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں اندر سے بنجر ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں کوئی شے مر چکی تھی، میرے سینے میں کچھ ٹوٹ چکا تھا۔ میں ایک ہاری اور پھنکاری ہوئی ہستی تھی۔ میں اپنے ظالم شوہر کی زد سے نکل کر کسی تاریک گوشے میں سمٹنا چاہتی تھی۔ یہ تاریک گوشہ مجھے مٹھ کی صورت میں ملا۔ میں اس میں سمٹ گئی۔ زندہ دفن ہو گئی۔ لیکن یہ گوشہ میری توقع سے زیادہ تاریک اور پرحبس تھا۔ یہاں گرو ایش اور کشپال کی صورت میں اندیشوں کے سانپ بھی رینگتے تھے۔ نجانے کتنا زمانہ اسی طرح گزر گیا اور پھر مجھے

تمہاری صورت نظر آئی۔ تم نے میرے جسم سے سوئیاں چنیں اور مجھے پھر سے زندہ کر دیا۔ اپنے تمام تر خوف و ہراس کے باوجود میں زندہ ہو گئی۔ تمہاری قوت نے بالآخر مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے خوشبو دار حجرے کی راحتوں کو خیر آباد کہوں اور زندگی کے خارزار میں تمہارے ساتھ ننگے پاؤں قدم رکھوں۔ ہاں ٹورسٹ! میں ارادہ کر چکی تھی۔ میں تمہارے سامنے اقرار نہیں کرتی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ میں زندگی کے آخری سانس تک تمہارے ساتھ چلنا چاہتی تھی۔ لیکن اب میں نہیں ہوں...... میری راکھ نہیں ہے۔ میں روشنی کی طرف اپنے سفر کے آغاز میں ہی تاریکی کے ہاتھوں ماری گئی ہوں۔ میں نہیں ہوں...... تم ہو۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تاریکیاں روشنی کو کیوں مٹاتی ہیں؟''

میں کنگن کو مٹھی میں تھام کر تصور کی دنیا میں کھو جاتا ہوں اور سون کی باتیں سنتا ہوں۔ حمزہ اور جبار بھی ابھی تک سون کی موت کے دکھ سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ حمزہ تو ہر صورت سون کے قاتلوں تک پہنچنا اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا ہے اور اس نے اس سلسلے میں جبار کے ساتھ مل کر کوشش بھی کی۔ لیکن جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ٹھوس ثبوت ڈھونڈنا اور قاتلوں کو قانونی سزا دلوانا ممکن نہیں...... ویسے بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے دشمن ایش اور کشپال نہیں تھے۔ ہمارا دشمن...... ہمارا دشمن تو وہ طرزِ فکر تھا۔ جس نے زندگیاں غارت کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ ہاں یہ دکھ کا موسم ہے۔

سون کا غم روزِ اول کی مانند تازہ ہے لیکن اب وہ تصور میں کم کم آنے لگی ہے۔ شاید وہ مجھے کچھ نئے راستوں پر چلنے کے لیے تیار کر رہی ہے۔ میری زندگی کو کسی نئی ڈگر پر چلانا چاہتی ہے۔ رخشی کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ جو اسے معلوم نہیں تھا وہ میں نے اسے خود بتایا ہے۔ ہر ہر بات اپنی ہر ہر کیفیت کھول کر بیان کی ہے۔ وہ واقعی بڑے دل کی مالک ہے۔ اس نے سب کچھ سنا ہے، سہا ہے اور کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اس نے میرے دکھ کو اپنے دکھ کی طرح جانا ہے۔

والد وفات پا چکے ہیں۔ والدہ مجھے شادی پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔ رخشی کی آنکھیں بھی بتاتی ہیں کہ وہ میرا انتظار کرتی ہے۔ شاید...... شاید میں کسی وقت رخشی کی طرف لوٹ ہی جاؤں۔ لیکن اگر میں لوٹا بھی تو یہ لوٹنا رخشی سے زیادہ رخشی کے ''مقصد'' کے لیے ہو گا۔ وہ مقصد جس کی خاطر وہ زندگی کی جدید سہولتوں کو چھوڑ کر خرابوں میں گھومتی ہے، کچے راستوں کی دھول پھانکتی ہے...... وہ وڈے سائیں جیسے لوگوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔ پیر

جی گروکشپال اور گروایش جیسے غلط کاروں کے خلاف جنگ کر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میں اس جنگ میں رخشی کے ساتھ شریک ہو جاؤں۔ کیونکہ بقول رخشی یہ تاریک لوگ ہیں۔ تاریکی اور جاہلیت ہی میری سون کی قاتل ہے...... ہاں ہوسکتا ہے کہ کسی وقت میں اس جنگ میں شریک ہو جاؤں۔

لیکن...... لیکن...... ابھی تو صرف اور صرف غم کا موسم ہے...... پٹایا کے ساحل پر اونچے پام پیڑوں کے نیچے فقط غم کی بانسری بجتی ہے...... میں بیٹھا رہتا ہوں اور سون کو سوچتا ہوں۔ ہزاروں یادیں ہیں لیکن ایک یاد بار بار ذہن کو کچو کے لگاتی ہے۔ میری نگاہوں کے سامنے ایکسیڈنٹ کے بعد کا منظر آ جاتا ہے۔ میں نے لہولہان سون کو گود میں اٹھایا تھا اور گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی "سوئی وانگ" روڈ کی ٹریفک کو چیرتی ہوئی اسپتال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سون مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ بس میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا تھا۔ اس نے اپنا سر کئی بار اٹھایا تھا۔ اپنے ہونٹوں کو جنبش دی تھی۔ میں اس پر جھک گیا تھا۔ میں نے اس کی بات سننے کی کوشش کی تھی...... لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ وہ دراصل بولنا ہی نہیں چاہتی تھی...... وہ کچھ اور چاہتی تھی...... وہاں وہ کچھ اور چاہتی تھی۔ کئی باتیں میری سمجھ میں دیر سے آتی ہیں۔ یہ بات بھی کئی ہفتوں بعد میری سمجھ میں آئی۔ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک قرض چکانا چاہتی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ ایک ادھورا کام مکمل کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی میں اسے چوم لوں۔ برسوں پہلے بنکاک کی اس جگمگاتی رات میں، میں اس کی طرف جھکا تھا۔ میں نے اسے چومنا چاہا تھا لیکن چوم نہیں سکا تھا۔ ادھورے پن کی یہ پھانس شاید سون کے دل میں بھی چبھی ہوئی تھی۔ بلکہ یہ شاید ایک ہی پھانس تھی جو ہم دونوں کے دلوں میں چبھی ہوئی تھی۔ آشنائی کا کرب میرے وجود میں موجود تھا اور شاید یہی کرب اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ سون نے اس پھانس کو نکالنا چاہا تھا اس کرب کو ختم کرنا چاہا تھا مگر میں نے اسے یہ بھی نہیں کرنے دیا تھا۔

وقت کبھی کبھی کتنا بے رحم ہو جاتا ہے۔ پانچ برس پہلے میرے ہونٹ اس کی طرف بڑھے تھے۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پانچ برس بعد اس نے اپنا چہرہ میری طرف بڑھایا تھا۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا تھا۔ بقول شاعر! اپنے اپنے مقام پر کبھی تم نہیں کبھی ہم نہیں۔
شاید زندگی نام ہی ایسی حسرتوں اور محرومیوں کا ہے۔ تھائی گیت اب بھی میرے کانوں

میں گونجتا ہے۔

ایک حیران بلبل پام کے بلند درخت پر بیٹھا ہے
اور سوچتا ہے
یہ سمندر کہاں سے شروع ہوتا ہے؟
یہ سورج کی سرخ گیند کہاں اوجھل ہوتی ہے؟
وہ اپنے بچھڑے ساتھی کو یاد کرتا ہے
اس کا خیال ہے کہ جس طرح
سمندر میں گم ہو جانے والی لہریں
پھر پلٹ کر کنارے پر آتی ہیں
جس طرح دن میں تھم جانے والی ہوا
رات پچھلے پہر پھر چلنے لگتی ہے
جس طرح گم شدہ سورج
دوبارہ آسمان پر نمودار ہو جاتا ہے
اسی طرح
اس کا ساتھی جو پچھلے موسم میں بچھڑ گیا تھا
ایک دن واپس آ جائے گا

ہاں تھائی گیت اب بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے لیکن اب کسی کا انتظار نہیں ہے۔ انتظار ہو بھی کیسے؟ کسی کو اب واپس نہیں آنا ہے۔

(ختم شد)